فاران

گورنمنٹ اسلامیہ کالج (سول لائنز)

لاہور

چوں بمیرم از غبارِ من چراغِ لالہ ساز
تازہ کن داغِ مرا ، سوزاں بہ صحرائے مرا

اسلامیہ کالج (سول لائنز) لاہور کا ادبی مجلہ

فاران

یادگار نمبر

●

(مارچ ۱۹۷۵)

●

نگران اعلیٰ :
پروفیسر شہرت بخاری

●

مدیر اعلیٰ :
نسیم عرفانی

مدیران :
وقاص احمد
نعیم اقبال
ندیم بلال
علی جنید بخاری
زاہد اختر

●

باہتمام محمد یعقوب مطبع حمایت اسلام پریس ناشر ایچ- ایم- یعقوب نے اسلامیہ کالج
سول لائنز لاہور سے شائع کیا ۔

فہرست مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ	پروفیسر شہرت بخاری	
سوانحی خاکہ	ادارہ	۱
حمید احمد خاں	پروفیسر یوسف جمال انصاری	۱۴
" اسوۂ حسنہ " سے اقتباس	پروفیسر حمید احمد خاں	۱۵
فسانہ ہیں ہم لوگ	پروفیسر سجاد باقر رضوی	۲۲
پروفیسر حمید احمد خاں ۔ چند تاثرات	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	۳۲
حمید احمد خاں ۔ ایک فعال شخصیت	جناب عبدالحفیظ کاردار	۳۹
بلند نصب العین کی اہمیت	پروفیسر حمید احمد خاں	۴۳
سراج الدین احمد خاں		۴۷
پروفیسر حمید احمد خاں ۔ حالات و افکار	پروفیسر سجاد شیخ	۴۸
قومی زبان اور پروفیسر حمید احمد خاں	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	۵۷
پروفیسر حمید احمد خاں کی شخصیت	پروفیسر اختر اقبال کمالی	۶۳
"ارمغان حالی" کا ایک باب		۷۲
حمید زندہ باد !	جناب مظفر احمد	۷۵
قطعۂ تاریخ	جناب کسریٰ منہاس	۸۸
قطعہ تاریخ وفات	جناب طاہر شادانی	۸۹
غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک	پروفیسر حمید احمد خاں	۹۰
آہ ! پروفیسر حمید احمد خاں	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۰۱

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
گزرے دنوں کی باتیں	جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری	۱۰۶
اسلامیہ کالج کی پنج سالہ کارگزاری کا سرسری جائزہ	پروفیسر حمید احمد خاں	۱۱۱
خراجِ عقیدت	اسلامیہ کالج یونین (۱۹۶۲ء)	۱۲۲
پرنسپلی کے زمانے کا ایک واقعہ	پروفیسر سجاد باقر رضوی	۱۲۵
نذرانۂ عقیدت	جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	۱۳۲
پروفیسر حمید احمد خاں کی شخصیت	پروفیسر سید ابوبکر غزنوی	۱۳۲
"اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں"	پروفیسر نذیر احمد	۱۴۲
ایک انتساب	پروفیسر حمید احمد خاں	۱۵۴
راجہ مہدی علی خاں کے تین خط		۱۵۵
" اقبال کی شخصیت اور شاعری " کی افتتاحی تقریب میں تقریر کا اقتباس	جناب محمد حنیف رامے	۱۶۰
باتیں اُن کی یاد رہیں گی	جناب قاضی سید احمد ، سیف علی اور محمد اکبر خان	۱۶۳
پروفیسر حمید احمد خاں کے تین خط		۱۸۸
والدِ مرحوم کی یاد میں	جناب سعید احمد خاں	۲۰۵
یادِ یارِ مہرباں	پروفیسر خواجہ محمد اسلم	۲۱۶
پروفیسر حمید احمد خاں ـ محبت و شفقت کا پیکر	جناب وحید اطہر	۲۲۱

تصاویر

پروفیسر حمید احمد خاں ۱۹۶۱ء میں	روبروئے صفحہ ۱
مولانا سراج الدین احمد خاں	۴۸
حمید احمد خاں کے بچپن کی ایک تصویر	۴۹
حمید احمد خاں آنیس سو تیسوں میں	۱۱۲
شیخ منظور الٰہی کے ساتھ	۱۱۲
چودھری محمد علی اسلامیہ کالج میں	۱۱۳
فرانس کے صدر پامپیدو کے ساتھ	۱۱۳
ایک تھا پرنسپل	۱۲۴
بابائے اردو کے ساتھ اسلامیہ کالج میں	۱۲۵
مشاعرۂ شمعِ تاثیر کی ایک جھلک	۱۲۵
قاضی سید احمد کے ساتھ	۲۰۴
شعبۂ انگریزی کی ایک پِک نِک	۲۰۴
محمد اکبر خان کے گاؤں میں	۲۰۵
اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ	۲۰۵

گزارش احوال واقعی

سرزمین پنجاب نے خاک پاک کرم آباد کے حضرت مولانا سراج الدین احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ خوش بخت مسلمان کم کم ہی پیدا کیا ہوگا جس کی اپنی ذات اور جس کی اولاد نے مسلمانان ہند کی سربلندی اور اردو کے فروغ کے لئے ایسی خدمات سر انجام دی ہیں کہ ان سے انکار کرنا ممکن نہیں رہا ۔ "زمیندار" اخبار کے احسانات ملت اسلامیہ کے لئے ناقابل فراموش ہیں ۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ مقالی کا کسے اعتراف نہیں ۔ ابھی تک بر عظیم کا گوشہ گوشہ ان کی گرم گفتاری سے گونج رہا ہے ۔ قومی اور نعتیہ شاعری میں ان کا مرتبہ اقبال کے بعد کسی سے کم نہیں ۔ مولانا سراج الدین احمد خاں کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اور مولانا ظفر علی خاں کے سب سے چھوٹے بھائی ، پروفیسر حمید احمد خاں وہ برگزیدہ شخصیت ہیں جنہیں مکروہات دنیوی سے دائمی نجات حاصل کئے اور بر عظیم کے مسلمانوں کو داغ فراق دئیے ایک سال گزر گیا لیکن ابھی اُن کے دئے ہوئے زخم اتنے تازہ ہیں کہ نہ دیکھے جا سکتے ہیں نہ چھوئے جا سکتے ہیں ۔ آج اردو زبان اداس ہے ۔ ۔ ۔ اسلامیہ کالج کے در و دیوار اجاڑ اجاڑ محسوس ہوتے ہیں ۔ اس کالج کو حمید احمد خاں نے کیا کچھ دیا ۔ اس وقت اس کی تفصیل میں جانا مشکل ہے اور جایا بھی کیا جائے کہ یہاں کا ذرہ ذرہ ان کے احسانوں تلے دبا ہوا ہے اور منہ بولتی تصویر ہے ۔ ان کے زمانے کا اسلامیہ کالج آج خواب و خیال ہو گیا ۔ اسلامیہ کالج ایک قافلے کا نام تھا ۔ تحصیل علم ، ذوق تخلیق و تحقیق کی پرورش اور ہندی مسلمانوں کی مجلسی زندگی کی ہزار سالہ روایات و اقدار کا تحفظ ۔ یہ تینوں راستے ایک ہی منزل پر ختم ہوتے تھے ، جس پر اسلامیہ کالج کا قافلہ گامزن تھا اور نیک نام تھا ۔ کالج ہال اور اس کا اسٹیج گواہ ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں نے کیا کیا محفل شعر و سخن

یہاں برپا کی ہے اور جن میں شرکت کرنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا ۔

ہر چند شاعر یا ادیب اور استاد کا نہ کوئی فرقہ ہوتا ہے نہ کوئی جماعت اور نہ اس پر کسی قسم کی مقامی یا بین الاقوامی جغرافیائی حد بندیاں عائد ہوتی ہیں کہ شاعر یا ادیب اور اُستاد میں صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک قلم کے ذریعے اظہارِ جذبات و خیالات کرتا ہے اور دوسرا زبان کے ذریعے ۔ ایک کا طریقہ بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرے کا بالواسطہ ۔ تاہم پروفیسر حمید احمد خاں جو مسلّم ادیب بھی تھے اور مسلّم استاد بھی ۔ اسلامیہ کالج کے لئے سرمایہ افتخار ہیں ۔ افسوس کہ ہمارے نظام تعلیم میں ایک استاد اور ایک غیر استاد کے قواعد ملازمت میں کوئی فرق باقی نہیں ہے ۔ جس طرح ایک دفتری افسر ، کلرک یا چپڑاسی اور چوکیدار کو ایک خاص عمر پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے اسی طرح اسی عمر پر ایک استاد کو بھی گھر میں بٹھا دیا جاتا ہے اور یوں اس کے تجربے اور علم و فضل کے چراغوں کو اندھیروں میں گم کر دیا جاتا ہے ۔ اس شہر میں ایک سے ایک عظیم عالم فاضل استاد یا کسب معاش کے چکر میں مختلف جگہوں پر ملازمت کرنے پر مجبور ہے یا پھر گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھا ہوا ہے ۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے مسند رشد و ہدایت کو ان کی ذات گرامی سے محروم کر دیا گیا اور یوں نئی نسل ایک ایسے استاد کے فیض سے محروم ہوگئی جس کے چشمۂ علم و ادب سے ابلنے والے پانی کا قطرہ قطرہ آب حیات کا کام کرتا رہا ہے ۔

اس مرحلے پر ادارہ فاران ، اسلامیہ کالج کی طرف سے خاں صاحب کے برادران بزرگ پروفیسر محمود احمد خاں ، مولانا حامد علی خاں ،محترمہ بیگم حمید احمد خاں ، خاں صاحب کے بیٹوں ، اُردو زبان و ادب کے چاہنے والوں ، اساتذہ و طلبہ کے طبقے سے عموماً اور پاکستان اور اُردو سے خصوصاً تعزیت کرنے کا حوصلہ کر رہا ہے ۔ ہم ان سب کے سوگ میں شریک ہیں مگر ہمارے سوگ میں کون شریک ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ع "آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے"

اسلامیہ کالج پر خاں صاحب کے بے شمار احسان ہیں ۔ خاں صاحب اپنے حقوق پورے کر گئے ۔ وہ سبکدوش ہو کر اپنی منزل کی طرف کوچ کر گئے مگر اسلامیہ کالج پر اپنے پورے حقوق ادا کرنے کا وقت اب شروع ہوا ہے ۔ ادارہ فاران نے اپنی سی ممکن کوشش کی ہے کہ اپنے اس محسن کو خراج عقیدت پیش کر سکے ۔ اس کوشش کی ادنئی سی جھلک اس خاص نمبر کی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے ۔ ادارہ ہرگز مطمئن نہیں ہے کہ جو کچھ وہ پیش کر رہا ہے وہ کسی اعتبار سے بھی اس قابل ہے کہ اسے خاں صاحب ایسی عظیم شخصیت کی شان کے شایاں خیال کیا جا سکے ۔ ہم ممنون ہیں خاں صاحب کے شاگردوں ، دوستوں اور دیگر قابل احترام مداحین کے جنھوں نے اپنی تحریروں سے فاران کے دامن کو جگمگانے کی کوشش کی ۔ ہمارے پاس مضامین کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ ایسے کئی نمبر نکالے جا سکتے ہیں مگر ہمارے وسائل مانع ہو رہے ہیں ۔

فاران کے اس یادگار شمارے کے لیے ہم نے اس سرورق کا انتخاب اس لیے کیا کہ یہ سرورق پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے ایما پر مصورِ مشرق جناب عبدالرحمن چغتائی صاحب نے اُس وقت نقش بند کیا تھا جب ۱۹۵۹ میں فاران کا پہلا شمارہ شائع کیا گیا ۔ اور اسے " فان " (fawn) رنگ میں اس لیے طبع کیا جا رہا ہے کہ یہ وہی رنگ ہے جو خاں صاحب نے کالج کے بلیزر کے لیے منتخب کیا تھا ۔

آخر میں اگر اپنے قابل احترام پرنسپل پروفیسر ایس ۔ اے رشید صاحب ، پروفیسر اختر الدین صاحب ، پروفیسر ارشاد الحسن صاحب ، پروفیسر ڈاکٹر احراز نقوی صاحب خصوصاً خاں صاحب کے فرزند اکبر جناب سعید احمد خاں صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ان کے مشورے اور عملی اعانت اگر شامل حال نہ ہوتی تو شاید ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکتے ۔

آخر میں ہم خاں صاحب کی روح پر فتوح سے شرمساری کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم وہ کچھ نہ کر سکے جو ہم چاہتے تھے تاہم

ع گر قبول افتد رہے عز و شرف

تاخیر کے لئے سخت نادم ہیں ۔

پروفیسر حمید احمد خاں

پرنسپل اسلامیہ کالج، ۱۹۶۱ء میں اپنے دفتر کے باہر

اداره

سوانحی خاکہ

یکم نومبر ۱۹۰۳ء پیدائش ، لاہور (چوہٹہ مفتی باقر میں شیخ نصیر الدین کی حویلی) ان کے والد ماجد مولانا سراج الدین احمد خاں نے اس زمانے میں یہیں سے ہفتہ وار اخبار "زمیندار" جاری کیا تھا (جون ۱۹۰۳ء) - یہ مکان آج بھی موجود ہے -

۱۹۰۴ء تمام کنبہ (اور اخبار "زمیندار" بھی) کرم آباد منتقل ہوگیا - یہ گاؤں جو وزیر آباد سے دو میل کے فاصلے پر ہے (سیالکوٹ والی سڑک پر) حمید احمد خاں کے دادا مولانا کرم الٰہی خاں نے ۱۸۸۶ (؟) میں آباد کیا تھا -

- دسمبر ۱۹۰۹ء مولانا سراج الدین احمد خاں کا انتقال -

حمید احمد خاں نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور بڑی بہن حمیدہ بیگم صاحبہ (ح - ب -) سے حاصل کی - وہ بلند پایہ شاعرہ بھی تھیں -

۱۹۱۰ء دوسری جماعت میں وزیر آباد کے چرچ آف سکاٹلینڈ ہائی سکول (مشن سکول) میں داخل ہوئے - جس روز حمید احمد خاں سکول میں داخل ہوئے اسی روز ان کے بھائی حامد علی خاں بھی اسی سکول کی تیسری جماعت میں داخل ہوئے - یہاں حمید احمد خاں کے ایک ہم جماعت عبدالرحمن تھے جو بعد میں جسٹس ایس- اے- رحمن کہلائے اور پاکستان کے چیف جسٹس بنے -

۱۹۱۱ء حمید احمد خاں کے سب سے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خاں "زمیندار" کو ایک بار پھر لاہور لے آئے۔

۱۹۱۲ء حمید احمد خاں اور باقی کا کنبہ بھی لاہور منتقل ہو گیا۔ حمید احمد خاں اب اسلامیہ ہائی سکول نمبر ۲ میں داخل ہوئے۔ یہ سکول اُس وقت ریلوے روڈ پر دارالاشاعت، پنجاب کے قریب واقع تھا (اور بیرون موچی دروازہ کہلاتا تھا)۔ اُسی زمانے میں یہ اپنی نئی عمارت بیرون بھاٹی دروازہ میں منتقل ہو گیا۔ اسی زمانے میں ان کی واقفیت دو لڑکوں محمد دین اور صلاح الدین احمد سے ہوئی، جو بعد میں ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر اور مولانا صلاح الدین احمد کے ناموں سے مشہور ہوئے۔

۱۹۱۴ء حمید احمد خاں کے بھائی محمود احمد خاں نے علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اورنگ آباد (دکن) میں بطور معلم ملازمت اختیار کی۔

اکتوبر ۱۹۱۴ء حکومت پنجاب کے حکم سے مولانا ظفر علی خاں کو کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔

۱۹۱۵ء حمید احمد خاں ایک بار پھر کرم آباد منتقل ہو گئے۔ یہاں وہ پہلے ایک سال تک وزیر آباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی سکول (جوبلی سکول) میں پڑھے اور پھر دوبارہ مشن سکول میں داخل ہو گئے۔ یہاں نویں جماعت میں حمید احمد خاں کو سکول کے مینجر مشہور مستشرق ڈاکٹر ٹامس گراہم بیلی سے پڑھنے کا موقع ملا۔

اسی زمانے میں حمید احمد خاں نے بچوں کے مشہور رسالہ "پھول" کے لئے چند کہانیاں لکھیں۔

نومبر ۱۹۱۸ء حمید احمد خاں دسویں جماعت میں تھے کہ ان کو ایک بار پھر کرم آباد سے لاہور آنا پڑا ۔ اب وہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں داخل ہوئے ۔

۱۹۱۹ء یہیں سے انھوں نے ایک اچھی فرسٹ ڈویژن میں اور وظیفہ کے ساتھ میٹرک کیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں ریاضی اور سائنس کے مضمون لے کر داخل ہوئے ۔

۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء پھر عدم تعاون کی تحریک کا زمانہ آیا اور حمید احمد خاں میں قومی جذبے نے اتنا جوش مارا کہ اُنھوں نے کالج چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی سے منسلک تھا ، جو انگریزوں کی یونیورسٹی تھی ۔ ان کے بڑے بھائی حامد علی خاں اس زمانے میں لالہ لاجپت رائے کے پنجاب نیشنل یونیورسٹی کالج (بریڈ لا ہال) لاہور میں داخل ہوئے ۔ حمید احمد خاں نے بھی نجی طور پر اس کالج سے ایف ۔ اے ۔ کا امتحان پاس کیا ۔

اپنے طور پر پڑھنے کے علاوہ حمید احمد خاں جلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے ۔ بریڈ لا ہال میں منعقدہ ایک جلسہ میں اُنھوں نے اپنی ایک نظم بھی پڑھی ۔ ان کے ایک بہنوئی نے لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار " حریت " جاری کیا ، تو اس کی ادارت کا بہت سا کام حمید احمد خاں نے اپنے ذمے لیا ۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اس اخبار میں اداریے لکھتے رہے ۔

بعد میں حمید احمد خاں نے اس دور کے متعلق خود کہا کہ اُن کے یہ دو تین سال ضائع ہو گئے ۔

۱۹۲۲ء حمید احمد خاں حیدر آباد (دکن) ہجرت کر گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے ۔ یہین اُن کے برادر معظم پروفیسر محمود احمد خاں معلم تھے ۔

۱۹۲۴ء عثمانیہ یونیورسٹی سے ریاضی اور سائنس کے ساتھ ایف ۔ اے۔ کیا اور وظیفہ حاصل کیا ۔ اسی زمانے میں انھوں نے لفکا ڈیو ہرن کی چار جلدوں پر مشتمل ادب پر مشہورکتاب پڑھی ۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سائنس کے بجائے آرٹس پڑھیں گے ۔ چنانچہ وہ بی۔ اے۔ میں انگریزی ادب اور فلسفہ لے کر داخل ہوئے ۔ یہاں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، مولوی عبدالباری ندوی ، پروفیسر مولانا مناظر احسن گیلانی ، پروفیسر ای۔ ای۔ سپیٹ اور پروفیسر حسین علی خاں بھی تھے ۔ ان کے ہم عصروں میں ایک (ڈاکٹر) رضی الدین صدیقی تھے جو بعد میں پاکستان کی تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر ہوئے ۔

۱۹۲۶ء حمید احمد خاں نے بی ۔ اے۔ کیا ۔ یونیورسٹی میں صرف ان کی فرسٹ کلاس تھی ۔ انگریزی ، فلسفے دونوں مضامین میں الگ الگ اول بھی رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی بی۔ اے۔ میں اول آنے والے طالب علم کو وظیفہ دے کر کسی یورپین یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے بھیجتی تھی ۔ حمید احمد خاں شاید کسی جرمن یونیورسٹی میں جا کر فلسفہ پڑھتے ، لیکن ان کو وظیفہ نہ دیا گیا کیونکہ وہ ”غیر ملکی“ (حیدر آباد سے باہر کے) تھے ۔ حمید احمد خاں نے ایک بار پھر ہجرت کی اور واپس لاہور آ گئے ۔ یہاں عثمانیہ یونیورسٹی کی ڈگری مانی نہیں جاتی تھی۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد اور سنڈیکیٹ کے خاص فیصلے کے بعد حمید احمد خاں کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے۔ انگریزی میں داخلہ ملا ۔

یہاں ان کے اساتذہ میں پروفیسر لینگ ہارن ، فرتھ ، ڈکنسن ، مرزا محمد سعید ، نندا ، اور بخاری تھے ۔ پروفیسر ویلٹی نے بھی (جو ایف۔ سی۔ کالج میں تھے) ان کو پڑھایا ۔

حمید احمد خاں نیو ہاسٹل میں رہتے تھے - ان کے ہم عصروں میں شیخ محمد اکرام ، (پروفیسر) سراج الدین، سید فیاض محمود ، ممتاز حسن اور چودھری محمد علی تھے -

۱۹۲۹ء حمید احمد خاں نے ایم - اے- کیا -

۱۹۲۰-۳۰ء کے دور کی بعض تحریریں : "حریت اور اسلام" (۱۹۲۵ء) - ایک مفصل مقالہ جو "ہمایوں" لاہور میں چھپا - ("ہمایوں" کو ۱۹۲۲ء میں میاں بشیر احمد نے جاری کیا تھا - ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۷ء تک اور دوبارہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء تک حامد علی خاں اس کے مدیر رہے- اس رسالے میں، جو ۱۹۵۷ء تک بڑی چمک دمک سے جاری رہا، حمید احمد خاں کے متعدد معروف مضمون چھپے-) حمید احمد خاں کی آخری ریڈیو تقریر "رسول کریم کے عہد میں حقوق انسانی" (جو ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو ریکارڈ ہوئی تھی اور بعد میں جسے پروفیسر سید وقار عظیم نے ریڈیو پر پڑھا) اسی مقالے سے ماخوذ ہے - "اسوۂ حسنہ" (۱۹۲۵ء) - سیرت پر یہ مفصل مقالہ ایک انعامی مقابلے کے لئے لکھا گیا تھا - اس کو پہلا انعام ملا تھا - پہلے یہ "ہمایوں" لاہور میں چھپا اور پھر ۱۹۶۶ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا- "The Poetry of George Herbert" (۱۹۲۸ء) ، "فلسفۂ یاس" (۱۹۲۹ء) اسی دور میں چند افسانے ، نظمیں اور غزلیں بھی لکھیں - اس زمانے میں کبھی کبھی کرم آباد میں دوستوں کو جمع کیا گیا ، اور ادبی محفلوں کے ساتھ ساتھ یہاں کرکٹ کے میچ بھی کھیلے گئے -

-۱۹۳۳ء ۱۹۳۳ء تک چند برس مختلف ملازمتیں -

جنوری ۱۹۳۴ء اسلامیہ کالج لاہور میں تقرر بطور لیکچرار شعبۂ انگریزی -

جولائی ۱۹۳۸ء دہلی ، آگرہ ، لکھنؤ ، کلکتہ ، بھوپال وغیرہ کا تین ماہ کا دورہ ، غالب پر معلومات جمع کرنے کے لئے ۔

۱۲ مئی ۱۹۳۹ء والدہ کا انتقال

۱۹۳۰-۴۰ء کے دور کی بعض تحریریں : " من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ " (۱۹۳۰ء)، "انگریزی شاعری میں محبت کا تصور" (۱۹۳۲ء) ، "The Personality of Ghalib" (۱۹۳۳ء)، " ایاز کی قبر تک " (۱۹۳۳ء) ، "عثمانیہ یونیورسٹی" (۱۹۳۵ء)، "عشق و محبت کا مشرقی تصور" (۱۹۳۶ء)، عاشق حسین بٹالوی کی " سوز ناتمام " کا مقدمہ (۱۹۳۷ء) ، " علامہ اقبال کے ہاں ایک شام " (۱۹۳۷ء) ، " آج کل کا لاہور " (۱۹۳۸ء) ، " اقبال کا شاعرانہ ارتقا " (۱۹۳۸) ، " غالب اور بیدل " (۱۹۳۸ء) " مرزا غالب کا قصیدہ شمس الامرا " (۱۹۳۹ء) ، "کچھ یادیں، کچھ ملفوظات " (۱۹۳۹) ، "زندگی اور موت کے دوراہے پر " (۱۹۳۹ء)

اس دور میں ان کے نئے احباب ہیں ڈاکٹر سعید اللہ ، شیخ محمد اسلم، (کیپٹن) عبدالواحد ، حفیظ جالندھری اور صوفی تبسم شامل ہیں - محمود نظامی ، حمید نظامی (پروفیسر) خواجہ غلام صادق ، (ڈاکٹر) عبدالسلام خورشید اور عبدالبشیر آذری اس دور کے شاگردوں میں شامل ہیں ۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء شادی

اس زمانے میں ان کی سکونت شیش محل روڈ پر تھی ۔

۱ اکتوبر ۱۹۴۴ء لاہور چھوڑ کر دہلی چلے گئے اور وہاں دہلی پالی ٹیکنک میں انگریزی کے لیکچرار ہو گئے ۔

سکونت : ۱۵۳ سی ، تیار پور ، دہلی

سے دل غم سے پھٹ رہا ہے۔ وہ بچے جن کو ایک بے مثال اور والہانہ محبت کرنے والے باپ کی محبت کا فخر حاصل تھا آج ہمیشہ کے لیے بے سہارا ہو گئے۔ آپ کی بدقسمتی پر چیخیں مار مار کر دل روتا ہے جو ایک شفیق ترین بھائی کی بے پناہ محبت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہیں۔ آپ دونوں کی محبت بے پایاں تھی اور وہ آپ کو باوجود چھوٹی بہن کے ماں کے برابر درجہ دیتے تھے اور ماں کی طرح جان سے عزیز سمجھتے تھے۔ آپ کی بدنصیبی ہے جو اُن کو ہوش و حواس میں آخری بار دیکھ بھی نہ سکیں۔ یہ دل شکن اور جانکاہ غم ایک ایسا دائمی غم ہے جو زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

غمِ ہجر اور ہجرِ دائمی پھر ہجر بھی تیرا
میں صابر ہی سہی پر صبر اتنا ہو نہیں سکتا

دراصل ایسی انمول ہستیوں کا نام اور اُن کی یاد کبھی موت مٹا نہیں سکتی۔ وہ اب بھی زندہ ہیں اور اُن کی محبت اور اُن کی یاد تا قیامت ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔

آج میں نے اپنی الماری کھولی تو ماموں جان کا وہ خط جو ۱۹ر جولائی ۱۹۷۳ء کا لکھا ہوا میرے نام تھا نظر آیا جسے آنکھوں کو لگا کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ یہ خط پچھلے سال جب وہ بیمار ہوئے تھے تو مزاج پرسی کے میرے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا۔ آہ یہ میرے نام اُن کا پہلا اور آخری خط تھا جس کے چند الفاظ یوں ہیں۔ "پچھلے بیس پچیس روز سے جو آرام کی زندگی میں گذار رہا ہوں، اُس سے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک بادشاہ ہوں۔ اُس غریب مزدور کو یہ شاہانہ زندگی بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے جس کے پچھلے چالیس پچاس برس شاقہ محنت کرتے گزرے ہوں"۔ واقعی انھوں نے باوجود کمزور صحت کے اپنے آپ کو انتہائی محنتوں میں مبتلا رکھا۔ ملک و قوم کی خدمت میں انھوں نے قیمتی ترین زندگی بے دھڑک صرف کر دی۔ خدا تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ وہ اس عظیم ترین ہستی کو اپنے جوارِ رحمت میں رکھے اور اُن کے لواحقین کو اِس صدمۂ جاں کاہ کو برداشت کرنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔

مجھے اس صدمۂ عظیم میں شریک نہ ہو سکنے کا انتہائی رنج ہے اور ہمیشہ رہے گا اور مجھے ابھی تک اپنا سنگین جرم اور سنگ دلی لگتی ہے جو میں آپ سب تک نہیں پہنچ سکی، مگر وائے مجبوری۔ کل میں نے باوجود آپ کے منع کرنے کے تمام سامان لاہور جانے کے لیے باندھا اور سفر میں لے جانے کے لیے بچوں کی چیزیں تک رکھ لیں۔ لیکن صبح سویرے لاہور سے ایک فون آ گیا کہ آپ نے کہا ہے۔ "اب تمھارا آنا بے مقصد ہے۔ بچوں کو لے کر تنہا اتنا لمبا سفر نہ کرو"۔ میں نے انتہائی شکستہ دلی کے ساتھ اپنے فی الحال جانے کا پروگرام ملتوی کیا ہے۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں اُن کے چہلم میں شریک ہو سکوں۔ کرنل صاحب کو بھی ماموں جان کی وفات کا انتہائی صدمہ ہوا ہے۔ پرسوں سے انھیں کی باتیں کر رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے میرے کانوں میں تو اُن کے وہی الفاظ گونج رہے ہیں، جو انھوں نے بیگم روڈ میں آخری ملاقات پر ہمیں کہا تھا کہ میں اگست میں کوئٹہ آ کر تم لوگوں سے ملوں گا۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

اچھا امی جان خدا حافظ! — خدا ہم سب کو اس صدمۂ عظیم کے برداشت کرنے کی ہمت دے اور آپ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے ——— آمین

ستمبر ۱۹۵۱ء — Three Hundred Years of Prose Caxton Book House Lahore مرتب کی -

۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء — کیمبرج روانگی -

۲۱ جولائی ۱۹۵۴ء — "A Study of the Relationship between the Sensuous and the Mystical in Wordsworth, with some **Oriental Parallels**"
کے عنوان سے کیمبرج میں اپنا مقالہ مکمل کیا اور وہاں سے ایم- لٹ- کی ڈگری حاصل کی - کیمبرج میں اُن کے اُستاد مشہور نقاد اور مصنف پروفیسر بیزل ولی تھے -

۱۸ ستمبر ۱۹۵۴ء — لاہور واپسی -

۱۹۵۵ء — اسلامیہ کالج لاہور میں ایم- اے- انگریزی کی جماعت شروع ہوئی -

یکم مئی ۱۹۵۸ء — اسلامیہ کالج دو حصوں (ڈگری اور انٹرمیڈیٹ) میں منقسم ہوا اور پروفیسر حمید احمد خاں اسلامیہ کالج سول لائنز (ڈگری کالج) کے پرنسپل مقرر ہوئے -

فروری ۱۹۵۹ء — پروفیسر حمید احمد خاں کی تجویز پر لاہور میں ایک آردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کے کنوینر ڈاکٹر سید عبداللہ تھے - اس کانفرنس میں بابائے آردو مولوی عبدالحق نے بھی شرکت کی -
اس دور کی تحریروں میں "تاثیر زندہ باد" (۱۹۵۰ء)، "شعر اقبال میں فن کاری کا عنصر" (۱۹۵۱ء)، "Saadi as a Moralist" (۱۹۵۲ء)، "Wordsworth's Animism" (۱۹۵۴ء)، "پیارے لال آشوب" "The Universal Note in Iqbal's Poetry" "انگلستان میں کتے کا معاشرتی مقام" (۱۹۵۰ء)، "میری بھارت یاترا" (۱۹۵۹ء)، "علمی زبان کی حیثیت سے آردو کا مستقبل" (۱۹۵۹ء)، "Thoughts on the National Unity of Pakistan" (۱۹۵۹ء) شامل ہیں - اسی زمانے میں قائد اعظم

پر نوجوانوں کے لئے ایک انگریزی کتاب لکھنی شروع کی، لیکن اس کے صرف چار باب مکمل ہوئے۔

اس دور میں ان کے شاگردوں میں عبدالباقی بلوچ اور مسعود مفتی تھے۔

جون ۱۹۶۰ء	رکن ، کرکیولم کمیٹی ، مرکزی وزارت تعلیم
اکتوبر ۱۹۶۰ء	یونیسکو فیلو کی حیثیت سے برطانیہ ، یونان ، ترکی ، سپین اور امریکہ کی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کا تین ماہ کا دورہ ۔
۱۹۶۱ء	ادارۂ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے لئے تحریک۔ اس کے پہلے کنوینر مقرر ہوئے ۔
۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء	حکومت پاکستان کی طرف سے ادبی خدمات کے اعتراف میں "ستارۂ امتیاز" عطا ہوا ۔
۱۹۶۲ء	مرکزی مجلس ترقیٔ اردو (بعد میں مرکزی اردو بورڈ) کا قیام ۔ پروفیسر حمید احمد خاں اس کے ایک ایڈیٹر مقرر ہوئے ۔ (دو دوسرے ایڈیٹر مولانا عبدالقادر مرحوم اور پیر حسام الدین راشدی تھے)۔ "سفینۂ ادب" (بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن ، لاہور) مرتب کی ۔ بزم حالی ، لاہور کی صدارت قبول کی ، اور وفات تک اس انجمن کے صدر رہے ۔
۱۹۶ــ ء	رکن، مجلس انتظامیہ ، مجلس ترقی ادب، رکن ، مجلس انتظامیہ ، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ، لاہور ۔
۱۹۶۳ء	ایشین امریکن اسمبلی، کوالالمپور (ملائیشیا) میں شرکت ۔
۳۱ اگست ۱۹۶۳ء	پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے ۔
۱۹۶۴ء	افریقہ ایشیا اسلامک کانفرنس ، جکارتا میں پاکستانی وفد کی قیادت ۔

پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند کا قیام -

پنجاب یونیورسٹی میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کا قیام -

مختلف موجود شعبوں کو مضبوط بنانے کے لئے اقدام (مثلاً انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا شعبہ) -

۱۹۶۵ء افریقہ ایشیا اسلامک کانفرنس ، بنڈونگ میں پاکستانی وفد کی قیادت -

ایفرو ایشین اسلامک آرگنائزیشن کے نائب صدر منتخب ہوئے -

یونیورسٹی میں مختلف تعلیمی و دفتری اصلاحات اور کام جاری رہے -

-۱۹۶ء رکن، بورڈ آف گورنرز ، نیشنل کالج آف آرٹس، چیئرمین اپائنٹمنٹس کمیٹی ، نیشنل کالج آف آرٹس -

۱۹۶۶ء Journal of Research, Humanities اور Journal of Research, Science کی اشاعت شروع ہوئی -

اسوۂ حسنہ (کتابیات ، لاہور) شائع ہوئی -

۱۹۶۷ء صدر ، مجلس یادگارِ غالب ، لاہور -

۱۹۶۹ء میں غالب کی وفات کو سو برس پورے ہو رہے تھے - یہ مجلس پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام اسی سلسلے میں قائم ہوئی - فروری ۱۹۶۹ء میں مجلسِ یادگارِ غالب نے غالب کی تمام کتابوں اور آردو اور فارسی دیوان کی اشاعت کی (بجز نسخۂ حمیدیہ کے جو اسی سال صدرِ مجلس نے مرتب کیا اور مجلسِ ترقی ادب نے شائع کیا) - نیز مجلسِ یادگارِ غالب نے غالب پر بھی چند کتابیں شائع کیں - مطبوعات کی کل تعداد سترہ تھی -

مئی ۱۹۶۷ء برٹش کونسل کے مہمان کی حیثیت سے برطانوی یونیورسٹیوں کا دورہ۔

حکومت ترکی کی دعوت پر ترکی کا دورہ۔

۱۹۶۷ء چیئرمین مرکزی اُردو بورڈ۔

اگست ۱۹۶۷ء جرمن حکومت کی دعوت پر جرمنی کا دورہ۔

۱۹۶۷ء Report on the Administration of Privately-managed Colleges

۱۳ اگست ۱۹۶۸ء حکومت پاکستان کی طرف سے تعلیمی خدمات کے اعتراف میں "ستارۂ پاکستان" عطا ہوا۔

فروری ۱۹۶۹ء وائس چانسلری سے سبکدوشی۔

۱۹۶۹ء دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ (مجلس ترقّیٔ ادب ، لاہور) مرتب کیا۔

جولائی ۱۹۶۹ء ایڈیشنل ڈائریکٹر ، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔

اس دور (۱۹۶۰-۷۰ء) کی بعض تحریریں : "The Question of Script" (۱۹۶۱ء) ، "The Common Structural basis of Urdu and Punjabi" (۱۹۶۱ء) ، "اُردو نثر کا ارتقاء" — مقدمہ سفینۂ ادب، حصّۂ نثر (۱۹۶۲ء)، "یونیورسٹی کی نصابی اور تعلیمات کی معاشرتی تنظیم نو" (۱۹۶۲ء) ، "ہمارا تہذیبی پس منظر اور زمانۂ حال کی لسانی چپقلش" (۱۹۶۲ء) ، "چند ادبی اور لسانی مسائل عمرانیات کی روشنی میں" (۱۹۶۳ء) "The Composition of Milton's Paradise" (۱۹۶۳ء) "یونیورسٹی کے کنبے کی ایک جھلک دوران جنگ میں"(۱۹۶۵ء)، "جہادِ پاکستان کا مقصد" (۱۹۶۵ء)، "اُستاد و شاگرد کے عقلی و جذباتی تعلق کا نفسیاتی جائزہ" (۱۹۶۶ء)،

"Ghalib—Man and Poet" (۱۹۶۶ء)، "سائنس کی ترقی کے لئے اپنی تہذیبی زبان بطور ذریعۂ تعلیم" (۱۹۶۷ء)، "قائد اعظم کی سیرت و کردار" (۱۹۶۹ء) ۔

اپریل ۱۹۷۰ء ایشیا سوسائٹی کی دعوت پر امریکہ میں غالب کے جشنِ صد سالہ کے سلسلے میں، امریکن یونیورسٹیوں میں غالب پر لیکچر ۔ ایک ماہ کا دورہ ۔

جولائی ۱۹۷۰ء ڈائرکٹر ، مجلسِ ترقی ادب ، لاہور ۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء افریقہ ایشیا اسلامک کانفرنس ۔ بنڈونگ میں پاکستان کی نمائندگی

۱۹۷۱ء پاکستان جرمن فورم ، لاہور کی صدارت قبول کی ۔
ارمغانِ حالی (ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، لاہور) مرتب کی ۔

۱۹۷۲ء اقبال کی شخصیت اور شاعری (بزم اقبال ، لاہور) اور تعلیم و تہذیب (مجلس ترقی ادب ، لاہور) کو مرتب کرنا شروع کیا اور ان کو پریس میں بھیجا ۔

۱۹۷۳ء آر ۔ سی ۔ ڈی ۔ کلچرل انسٹیٹیوٹ کے لئے غالب پر انگریزی میں کتاب لکھنی شروع کی ۔ صرف دو باب لکھے گئے ۔

۱۹۷۴ء رکن ، کمیٹی برائے تحقیق یوم ولادت علامۂ اقبال ۔
رکن ، مرکزی اسلامک ایڈوائزری کونسل

۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء وفات

۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء آخری سفر : ۵ بیگم روڈ سے غالب روڈ اور سر سید روڈ (گلبرگ) پر واقع قبرستان تک ۔

اس آخری دور (۱۹۷۰ — ۷۴ء) کی بعض تحریریں :
Convocation Address at the University of Rajshahi (۱۹۷۰ء)، "سید امتیاز علی تاج مرحوم" (۱۹۷۰ء) ،

"طلبہ اور تحریکِ صحتِ ملی" (۱۹۷۲ء) ،
"How Iqbal Composed the Message of the East"
(۱۹۷۳ء) ، "قومی زندگی میں تجارت کی اہمیت (۱۹۷۳ء) ،
"سید احمد خاں کا سفر پنجاب" (۱۹۷۳ء) ، "Mian Bashir
Ahmad" (۱۹۷۴ء) ، "اقبال کا نظام فکر" (نامکمل تحریر —
۱۹۷۴ء)

تحریروں کے مجموعے جو طباعت کے منتظر ہیں

پروفیسر حمید احمد خاں کی دو کتابیں جو آن کے انتقال کے وقت پریس میں یں ، چھپ چکی ہیں ۔ "اقبال کی شخصیت اور شاعری" اکتوبر ۱۹۷۴ء میں چھپی ر "تعلیم و تہذیب" مارچ ۱۹۷۵ء میں ۔ اب حسب ذیل مجموعے طبع اور شائع کئے ائیں گے :

۱۔ غالب پر اردو مضامین
۲۔ غالب پر انگریزی مضامین
۳۔ Miscellaneous English Writings
۴۔ تنقیدی مضامین
۵۔ ادب ، ادیب اور معاشرہ
۶۔ قومی و ملی تقاریر و مضامین
۷۔ حریت اور اسلام
۸۔ فسانہ ہیں ہم لوگ (احباب و اکابر کے متعلق مضامین کا مجموعہ)
۹۔ ہر ملک ملکِ ماست (عالمی سیر و سیاحت کے کوائف)
۱۰۔ خطوط
۱۱۔ The Sensuous and the Mystical in Wordsworth
(ایم۔ لٹ۔ کا مقالہ)

پروفیسر یوسف جمال انصاری

حمید احمد خاں

رہبرِ فکرِ غالب و اقبال　　خان صاحب حمید احمد خاں
نوجوانانِ قوم کی تہذیب　　جس کا مذہب ، حمید احمد خاں
خویش و اغیار ، سب کے حق میں تھے　　بخششِ رب حمید احمد خاں
قوم و ملت کے درد سے فارغ　　رہ سکے کب حمید احمد خاں
ہم پہ آسان تھی ہر اک مشکل　　ساتھ تھے جب حمید احمد خاں
سرد و خاموش ہے وطن کی فضا　　کہ نہیں اب حمید احمد خاں
سایۂ فضلِ خاص میں تیرے　　رہیں یا رب ! حمید احمد خاں
زیبِ جنت وہ ہمدمِ احباب　　نیک مشرب حمید احمد خاں

۱۹۷۴ء

پروفیسر حمید احمد خاں

”آسوۂ حسنہ“ سے اقتباس

سیرتِ رسول پر ایک طویل مقالہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے زمانۂ طالب علمی میں قلمبند کیا تھا، جو ایک انعامی مقابلے میں بہترین مقالہ قرار پایا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں یہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اُس وقت خاں صاحب نے اُس کے لئے جو دیباچہ لکھا اُس میں فرماتے ہیں :

” تغیرات زمانہ نے اظہار رائے اور انداز بیان کے طریقے بدل دیے ، مگر الحمدللہ کہ میری اپنی ذات کی اصل و حقیقت اور میرے ضمیر کی ماہیت انقلاب کے اس عمل سے محفوظ رہی ۔ عشق رسول آج بھی میری گراں بہا ترین متاع حیات ہے ۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا تصور اب بھی میرے دل و دماغ کو اسی طرح ایک حیات نو کا پیغام دیتا ہے جس طرح کبھی دور شباب کے لہو کو آگ بنا کر میری رگوں میں دوڑاتا تھا ۔ چنانچہ گو اس کتاب میں مجھے جابجا اپنی تحریر کی خامیوں کا احساس ہے ، مگر یہ بالکل واضح رہنا چاہیے کہ رسول اللہ کی ذات اقدس کے متعلق محبت و شیفتگی کا جو اظہار ان صفحات میں ہوا ہے وہ آج کے دن بھی اپنے اولیں ولولے کے ساتھ تازہ ہے ۔

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی

عشق محمد بس است و آل محمد “

آسوۂ حسنہ (جس کو مطبع عالیہ لاہور نے طبع کیا ہے) سے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے ۔

(۱)

حضورؐ کی ذات اقدس اس قدر متنوع ، اس قدر متفرق ، بلکہ بہ حالات ظاہر متخالف ، فضائل اخلاق کی جامع ہے کہ عقل اس وصل دہندۂ دین و دنیا کی

داستان حیات پر نظر ڈال کر ششدر رہ جاتی ہے اور معاً یہ خیال ہونے لگتا ہے ک
المانی فلسفی ہیگل کا نظریہ اتحاد اضداد (جو زیادہ صحیح لفظوں میں "نظریہ" متمہات
سے تعبیر کیا جا سکتا ہے) عالم روحانیات کی ماورائے حکمت کارگاہ کے اندر بھی جار
و ساری ہے - بعض خصائل حمیدہ کی نوعیت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ عوام ا
کے بادی النظری تناقض کی بنا پر اُن کو ناقابلِ اجتماع تصور کرتے ہیں - لیکن درحقیق
یہ مختلف اور متعدد قوائے اخلاقی باہم تکملہ و تتمہ کا رابطہ رکھتے ہیں -

حضرت ابو سعید الخدری رحمة اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ دوشیز
لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے - کیسا دل نشین منظر ہوتا ہوگا کہ جب کو
خطاکار سامنے آ کر معافی کا طالب ہوتا تو خود معاف کرنے والے کی گردن شرم س
جھک جاتی اور روئے انور پر فرط حیا سے سرخی دوڑ جاتی - ایسی عفیف اور بے لوث
ایسی پُر سکون اور خاموش طبیعت کے انسان کا رہنمائے عام کی حیثیت سے عرصہ عم
میں نکلنا اور اس ہمت فرسا زندگی کی تمام مقتضیات کو علیٰ وجہ الکمال پورا کر
اعجاز سے کم نہیں - انتہائی شرم و حیا اور خاکساری و فروتنی کو کسی عام رہ
کے لوازم حیات مثلاً خطابت وغیرہ سے بہت کم لگاؤ سمجھا جاتا ہے ، کیونکہ اس
زندگی کے لئے جرأت و جسارت اور تحکم و بے باکی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے
رسول اللہؐ نے ان دو بظاہر متضاد حیثیتوں کو وصل دے دیا اور تیرہ سو برس ہو
زمانے نے دیکھا کہ ایک ہی انسان دنیا کا سب سے بڑا ہادی اور حیائے کامل
مظہر اتم بھی تھا - وہی ایک انسان جس کا حلم و تحمل اپنے خادم کو اُس کی پور
مدت ملازمت میں ایک دفعہ بھی یہ کہنے کا روادار نہ ہوا تھا کہ " تو نے یہ ک
کیوں کیا اور وہ کیوں نہیں کیا ؟"[1] جس کا حسن خلق معاملات ارشاد و ہدای
میں بھی اس قدر ذکی الحس تھا کہ کسی شخص کی نا مطبوع حرکت پر اُس کا نا
لئے بغیر فقط اتنا کہہ دیتا تھا کہ "وہ کیسے لوگ ہیں جو یہ کرتے ہیں !"[2] جو اپن

١- مشکوٰۃ صفحہ ١٤٣ (روایت حضرت انسؓ) -

٢- شفا صفحہ ٥٢ (روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ) -

مروت کے ہاتھوں خود عقوبت میں گرفتار ہونا گوارہ کرتا تھا لیکن دوسروں سے یہ کہنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا کہ تمہارے اس کام سے مجھے تکلیف ہوتی ہے[1] ، اسی ایک انسان کے سامنے جب بڑے بڑے معزز عمائد قریش کی درخواست آئی کہ قریشی محرمہ فاطمہ بنت الاسود کا گناہ سرقہ ، اس کی عزت نسب کا لحاظ کرکے معاف کر دیا جائے، تو وہ از فرق تا بہ قدم جلال و جبروت الٰہی کی تصویر بن گیا اور اس نے نہایت جوش سے کہا : " بخدا اگر فاطمہ بنت محمد بھی یہ کام کرتی تو میں ضرور حد جاری کرتا "۔ خلق نبوی کے اسی آسمانی اعتدال کے صدقے میں وہی ایک شمشیر جو صائقۂ عدل بن کر عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث اور بنو قریظہ کی گردنوں پر چمکی تھی ، آیۂ رحمت بن کر ہبار بن الاسود اور وحشی اور کوہ تنعیم کی حملہ آور جمعیت کے سروں پر سایہ افگن ہوگئی ۔

انکسار اور تواضع کی یہ کیفیت تھی اور تکبر و خود پسندی سے اس درجہ احتراز تھا کہ مدینے کی ایک مجذوب سی عورت نے اپنے کسی کام کے لئے حضورؐ کو رستہ چلتے روک لیا تو شہنشاہ عربؐ دیر تک سر رہگزار بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا[2]۔ چھوٹے بچے شوق سے سرورکون و مکانؐ کے پاس آتے تھے۔ حضورؐ ان کو گود میں بٹھاتے اور ان کے ساتھ کھیلتے تھے[3] ۔ ان کے معصوم دلوں میں کبھی یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ جس شخص کے ساتھ ہم طفلانہ شوخیاں کرتے ہیں ، وہ دنیا کا سب سے بڑا انسان ہے ۔ آپ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو بنی عبدالمطلب کے بچے آپ کے استقبال کے لئے خوش خوش بھاگتے ہوئے آئے اور آپ نے نہایت شفقت سے ان میں سے ایک کو اٹھا کر اپنے آگے اور ایک کو اپنے پیچھے سوار کر لیا[4] ۔ ان حقائق پر اگر غور

۱- یہی حقیقت اس آیۂ کریمہ کی شان نزول ہے : ان ذلکم کان یوذی النبی فیستحی منکم واللہ لایستحی من الحق (سورۃ الاحزاب)

۲- ذکر اسلام عدی بن حاتم در سیرت ابن ہشام ۔

۳- بخاری صفحہ ۸۸۸ و صفحہ ۹۳۰ ، ۹۳۳ وغیرہ ۔

۴- بخاری صفحہ ۲۴۲ ۔

کیا جائے تو دنیا کے عام واقعات و مشاہدات کی رو سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس مقدس انسان نے جذبۂ حلم و محبت کو اس حد تک فروغ دیا تھا ، اُس نے اپنا رعب اور دبدبہ بھی کھو دیا ہوگا لیکن یہاں بھی وہ وجود قدسی بیک وقت مقابل کی تکمیلی فضیلت سے بوجہ احسن بہرہ مند تھا اور اُس کے خلق انکسار کے اتمام کے لئے اُس کا وقار موجود تھا ۔ چنانچہ فتح مکہ کے دن جب ایک شخص نے حضور رسالت میں آ کر عرض کرنا چاہا تو جلال نبوی نے اُس کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا ۔ آپ نے اُس کو اس طرح تشفی دی : " گھبراؤ مت ، میں کوئی بادشاہ نہیں ، ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی"[1] ۔

کہتے ہیں کہ شاعر کے دل میں سارے جہان کا درد ہوتا ہے لیکن جو غم اس عالم ہست و بود کے دھندلے نظاروں سے پیدا ہو ، اُسے اُس اندوہ اکبر سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی جو عالم باقی کے جلوۂ سرشار کا آفریدہ ہو ۔ ہر وقت کی شگفتہ روئی ، ہر وقت کا تبسم ، ایسے شخص کا طبعی خاصہ نہیں ہو سکتا جسے بچپن ہی سے غور و فکر کی عادت ہو ، اور ایک زبردست حکمران، مدبر اور سب سے بڑھ کر ایک پیغمبر ، کے اہم فرائض جس کے ذمے ہوں ۔ غور و فکر کی یہی عادت شعراء میں نالہ و فغاں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اکثر حکماء کے لئے اُن کی " فلسفیانہ ترش روئی " یا کم از کم ایک مستقل اور دائمی محزونی و افسردہ خاطری کی علت بن جاتی ہے جس کے تاریک بادل اُن کی پیشانی پر ہمیشہ چھائے رہتے ہیں ۔ حضور خواجۂ ہر دوسرا ؐ اگرچہ غم و اضطراب کے دو جہان اپنے قلب پاک میں چھپائے ہوئے تھے ، چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے : " لوگو ! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا " لیکن غم دو جہاں کا یہ بار عظیم بھی حضور ؐ کو اس حقیقت سے بے خبر نہ رکھ سکتا تھا کہ آپ کے صحابہ رضؓ اور ملنے والے آپ ہی کے نور تبسم میں جیتے تھے ۔ اس لئے آپ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے[2] اور ہر شخص سے بہ خندہ جبینی پیش آتے تھے ۔

۱- شفا صفحہ ۵۹ ۔

۲- شمائل ترمذی صفحہ ۱۷ ۔

حضرت جریر ابن عبداللہ کا بیان ہے کہ قبول اسلام کے بعد میں بارہا حاضر خدمت ہوا مگر یہ اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ حضورؐ نے مجھے دیکھا ہو اور تبسم کے انوار چہرۂ مبارک پر ہویدا نہ ہوئے ہوں ۔ حضرت عبداللہ ابن حارث کا قول ہے کہ میں نے کسی شخص کو جناب رسالت مآبؐ سے زیادہ خوش خلق اور خوش مزاج نہیں دیکھا، اور شفاء عیاض میں ہے کہ دشمن ہو یا کافر ، آپ ہر ایک سے بہ کشادہ پیشانی ملتے تھے ۔ یہی وہ سحر تھا جس سے آپ کے مخالف بھی رام ہو جاتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار جب آنحضرت کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے تو ایک طرح سے حقیقت کے بہت قریب پہنچ جاتے تھے ۔

جس شخص کی تکریم و تعظیم اس حد تک کی جاتی ہو کہ اُس کا تھوک تک ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہو ، اُس کے وضو کا پانی بھی زمین پر نہ گرنے پاتا ہو ، اُس کی آواز کے بلند ہوتے ہی تمام دوسری آوازیں خاموش ہو جاتی ہوں ، اُس کے اشارۂ ابرو پر بڑے بڑے شریف و نجیب اور غیور و عالی مرتبت عقیدت مند نوکروں کی طرح دوڑتے ہوئے آتے ہوں[1] ، ایسے شخص کے دل میں اگر اپنے وقار منصبی کا خیال پیدا ہو جائے تو کچھ عجب نہیں ۔ مگر یہاں کیا کیفیت تھی ؟ زید بن سعنہ جو اسلام لانے سے پہلے یہودی تھے ، اُن سے آنحضرتؐ نے کچھ قرض لیا تھا اور اگرچہ ادائے قرض کی میعاد میں ابھی کچھ دن باقی تھے ، انھوں نے تقاضا کرتے وقت آنحضرتؐ سے سخت درشتی اور بد زبانی کا سلوک کیا ۔ آنحضرتؐ خاموشی سے سنتے جاتے تھے اور مسکراتے تھے ۔ حضرت عمرؓ برافروختہ ہوئے تو آنحضرتؐ نے انھیں روکا اور کہا : "عمر ! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی ۔ تمھیں چاہیے تھا کہ اُسے حسن تقاضا اور مجھے حسن ادا کی تاکید کرتے"[2] ۔ یہی وہ اسباب تھے جو قیام حکومت اسلام کا باعث ہوئے ، کیونکہ اس نصف پژوہی کی خاطر یہودی اپنے سردار کعب بن الاشرف کو چھوڑ کر سرور دو جہاں محمد مصطفیٰ کی عدالت میں آتے تھے جہاں

١- بخاری صفحہ ٣٧٨ و صفحہ ٣٧٩ ۔

٢- سیرت شبلی ۔

اس ارشاد الٰہی کی تعمیل کی جاتی تھی :

و ان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ط ان اللہ یحب المقسطین ○

اور اگر تو ان (غیر مسلم لوگوں) میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر ۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔

جن فضائل اخلاق کو کم تر درجے کے انسان اپنے نقص فطرت کی بنا پر متناقض اور ناقابل اجتماع خیال کرتے آئے تھے ، محمد رسول اللہ نے آن کے مزاج و ترکیب کو اعتدال پر لا کر ثابت کر دیا کہ وہ دراصل خلق انسانیت کی تکمیل و اتمام کرتے ہیں اور اس طرح تاریخ کائنات میں ، شاید پہلی اور آخری دفعہ ، ایک کامل انسان کا ظہور ہوا ۔ ولیم میور کو اعتراف ہے کہ عیسائیت پانچ سو برس کی تعلیم و تلقین کے بعد بھی عرب کی وارستگی پر غالب نہ آ سکی ۔ یہودیت اپنی مسلسل کوششوں کے باوجود اس آزاد خطے میں ناکام رہی لیکن اب حالت ہی کچھ اور تھی ۔ رحمت الٰہی نے بالآخر ان آوارہ سر شتر بانوں کو آ گھیرا تھا ۔ بھلا بجلی کے خزانے کو چھو لینے کے بعد بھی کسی شخص کا سکون و جمود قائم رہ سکا ہے ؟ یہ فرزندان صحرا ، اولین مرتبہ ایک انسان کامل کے روبرو تھے ، اور آس کی روحانیت کے پیہم برق‌وش جلوے پورے عرب کی ہستی کو لرزا رہے تھے ۔

(۲)

کیسا عظیم الشان معجزہ ہے کہ آونٹوں کے وہ حدی خواں ، جن کے جمود کا طلسم صدہا برس سے نہ ٹوٹا تھا ، یک بہ یک آتش بجان ہو کر آٹھے اور دنیا و دین اور حکمت و اخلاق کے ہر شعبے میں زمانے کو درس دینے لگے ۔ جاہلیت کے وہی فرزند جو شاید کشت و خون اور جدال و قتال کے ہنگاموں میں اپنی عمریں کھو دیتے ، ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ بن گئے اور آج لاکھوں اور کروڑوں دل آن کی عقیدت اور محبت سے لبریز ہیں ۔ ایک نہایت ہی قلیل مدت کے اندر عرب کا نقشہ بدل گیا ۔ گنگا کی روانی اب وہی ترانہ سنا رہی تھی جس سے مست ہو کر بحر اوقیانوس

کی موجیں ساحل ہسپانیہ پر اپنا سر پٹک پٹک دیتی تھیں - ارضِ بطحا کے خشک اور بے برگ صحرا میں برق تجلی گری اور خس و خاشاک کو بھی منور کر گئی ، جس کے نورانی جلوے دہلی سے لے کر غرناطہ تک قدم قدم پر جھلکنے لگے - غزالی ، رازی اور ابو حنیفہ ، فارابی ، ابن سینا اور ابن رشد ، عالمگیر، الپ ارسلان اور عمر ابن عبدالعزیز جیسے بیسیوں پرستاران حق کے نام حیات جاوداں کے آسمان پر درخشاں ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں - یہ سب کس آفتاب کے پرتو تھے ؟ کون تھا جس نے دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی کا ، ظلمت سے نجات دے کر نور کا راستہ دکھایا ؟ جاؤ حجاز کے بیابان میں پکار پکار کر یہ سوال دہراؤ ، اور پھر دہراؤ ، شاید فاران کی گھاٹیوں میں گونج پیدا ہو : ”محمد !“

یایھا الذین آمنو ا صلو ا علیہ وسلموا تسلیماً ○

پروفیسر سجاد باقر رضوی

فسانہ ہیں ہم لوگ

اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں —— مہینہ تو یاد ہے ستمبر کا تھا ، تاریخ ۲۱ تھی یا شاید ۲۲ ، دن غالباً سنیچر کا تھا اور سن ۱۹۵۶ء ، میں لاہور میں بالکل نووارد تھا - ۵ بیگم روڈ لاہور کا پتہ پوچھتا ہوا ، میں اس گلی کے سرے پر پہنچ گیا جس میں کچھ دور اندر جا کر پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کا گھر واقع تھا - مجھے دس بجے تک پہنچ جانا چاہیے تھا مگر اب گیارہ بج چکے تھے - میں اپنی سوچوں میں گم آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب کھدر کی سفید شیروانی پہنے ، سائیکل ہاتھ میں پکڑے سامنے سے آتے دکھائی دیئے - میں نے غنیمت جانا ، فوراً آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا " جناب مجھے ۵ بیگم روڈ پہنچنا ہے - آپ میری رہنمائی فرمائیں۔" " آپ کو کس سے ملنا ہے ؟" سوال ہوا - " پروفیسر حمید احمد خاں صاحب سے "- میں نے جواب دیا - " میں ہوں حمید احمد خاں ، کیا آپ سجاد باقر رضوی ہیں ؟" " جی ہاں " میں یکایک چونک پڑا - " بھائی میں نے آپ کا بہت دیر انتظار کیا - اب میں ایم - اے کے داخلے کے امتحان کا پرچہ پریس میں دینے جا رہا ہوں - اب آپ سے کالج میں ملاقات ہوگی -"

میری حمید احمد خاں سے یہ پہلی ملاقات تھی جو ان کی گلی کے نکڑ پر ہوئی - اُن سے آخری ملاقات بھی اسی نکڑ پر ہوئی - جب میں ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح کو ۵ بیگم روڈ کے لئے روانہ ہوا تو ایک بار پھر وقت کی پابندی نہ کر سکا - مگر حمید احمد خاں صاحب وقت کے بڑے پابند تھے - ان کا جنازہ گلی کے نکڑ تک پہنچ چکا تھا —— اٹھارہ برس بعد بھی میں آخری بار ان سے وہیں ملا جہاں پہلی بار ملا تھا - انھیں پھر جانے کی جلدی تھی مگر وہ اس بار آئندہ ملاقات کا کوئی وقت دئیے بغیر چلے گئے -

پابندی وقت کے تعلق سے آپ خاں صاحب کو " صاحبِ وقت" کہہ لیجئے۔ اور اگر آپ بھی میری طرح یہ مانتے ہوں کہ ایک فرد بھی کسی معاشرتی صورت حال میں انقلاب لا سکتا ہے تو یہ سن لیجئے کہ آج شہر لاہور کی محفلوں میں جو کسی قدر وقت کی پابندی نظر آتی ہے تو اس کا سہرا اکیلے خاں صاحب کے سر ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ اگر کسی محفل سے حمید احمد خاں صاحب کا تعلق ہوتا ، انتظام و انصرام کے سلسلے میں یا کسی اور حیثیت میں تو وقت کی پابندی محفل کا لازمی جزو ہوتی ۔ لاہور والے جانتے ہیں کہ خاں صاحب کی وقت کی پابندی ضرب المثل بن گئی تھی اور برادرم شہرت بخاری جیسے وقت دشمنوں نے تو اس سلسلے میں لطیفے بھی گھڑ رکھے تھے ۔

وقت کی پابندی کے ساتھ وعدے کی پابندی خاں صاحب کی شخصیت کا ایک اور جوہر تھی ۔ اول تو ان سے وعدہ لینا مشکل تھا مگر وعدہ کر لیا تو وہ اٹل ہوتا ۔ محض ان کا وعدہ ہی اٹل نہ ہوتا تھا ۔ خاں صاحب خود بھی بہت اٹل آدمی تھے ۔ زندگی کے جس جس پہلو کے ساتھ ان کا جو بھی کمٹمنٹ تھا سخت تھا ۔ مضبوط قوت ارادی کی حامل اس شخصیت کو آپ بادام سے تشبیہہ دے سکتے ہیں ——— اوپر سے سخت اندر سے نافع ۔

حمید احمد خاں صاحب کے کردار کی تشکیل میں ایک اور پابندی بھی شامل تھی اور وہ تھی اصولوں کی پابندی۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ خال خال نظر آتے ہیں جو کسی اصول کو معروضی معیار بنا کر اس پر اپنے عمل کو پرکھتے ہوں ۔ زیادہ تر لوگ مفاد کو سامنے رکھ کر اصول اپناتے ہیں اور خود کو اصول پرست کہتے ہیں ۔ بے اصول اور منافق معاشرے میں اصولوں کے سہارے زندگی بسر کرنا بہت مشکل کام ہے اور خاں صاحب یہ کام تن دہی سے کرتے تھے ۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اصول کی پابندی ان کی زندگی کا محور تھی ——— وقت اور وعدے کی پابندیاں اس کی ذیلی شقیں ۔

حمید احمد خاں صاحب نے خود پر بڑی بڑی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔

وقت ، وعدے ، اصول اور وضع سب نے جگہ جگہ سے ان کے پیر باندھ رکھے تھے ۔ مگر ان کا دل اور ان کا ہاتھدونوں کشادہ اور کھلے ہوئے تھے۔ آپ اپنے گرد و پیش نظر ڈالیں ، کتنے ہی مہر بہ دل اور مٹھیاں بھینچے ہوئے لوگ دولتیاں جھاڑتے نظر آئیں گے ۔ خاں صاحب کی سخت اصول پرستی کے نیچے دھڑکتا ہوا دل اور کھلا ہوا فیاض ہاتھ تھا ۔ میرے بہت سے دوست جو اسلامیہ کالج میں حمید احمد خاں صاحب کے ہم کار رہے ہیں ، یہ بات مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ حمید احمد خاں صاحب کے زمانے میں کس فراخدلی سے غریب طلبا کو جاڑوں میں سوئیٹر اور گرم کپڑے تقسیم ہوتے تھے ۔ یہ تو وہ تھا جو کھلے بندوں ہوتا تھا ۔ اور وہ کہ ایک ہاتھ دے اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو ، اس کے بارے میں ہم آپ کیا کہہ سکتے ہیں ؟

اُستاد اور شاگرد کے رشتے کی پاسداری کرنے والا ان جیسا اُستاد میری نظر سے نہیں گذرا ۔ شاگردوں کی دلجوئی ، ان کے حالات میں دلچسپی ، ان کی نوکریوں کی سفارش یہ سب کچھ اُن کی مصروف زندگی کے معمولات میں شامل تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ کالج میں ان کی میز کے سامنے جو کرسی پڑی ہے میز سے تقریباً ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر ہے اور طالب علموں کے لئے مخصوص تھی ۔ طالب علم آیا اور آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گیا تو خیریت اور اگر اس نے کرسی آگے کھینچی تو وہ آدابِ معاشرت پر پانچ منٹ کا لیکچر ضرور سنتا تھا ۔ یہ لیکچر بالکل کڑوی دوا ہوتے تھے ۔ خاں صاحب کی کڑوی گولیوں پر شکر نہ ہوتی تھی ۔ انہیں ویسے ہی نگلنا پڑتا تھا ۔ ان کے طنز میں بڑی کاٹ ہوتی تھی۔ (آخر مولانا ظفر علی خاں کے بھائی تھے۔) کسی ایک بات کو بار بار دھراتے تھے (بالکل میتھیو آرنلڈ کے اسلوب میں)۔ مجھے خود کئی بار ایسے لیکچروں سے واسطہ پڑا ہے ۔ مجھے تو یہ زہر ہی لگتے تھے مگر بعد ازاں ان کا اثر تریاق کا ہوتا تھا ۔

وہ جو ہندو دیو مالا میں آیا ہے کہ جب دیوتاؤں نے امرت کے لئے سمندر کو متھا تو اُوپر زہر آ گیا ۔ شرط یہ تھی کہ پہلے زہر پیو ، پھر اس کے نیچے سے امرت نکلے گا ۔ خاں صاحب کی ان کڑوی کسیلی باتوں کے نیچے خلوص و محبت کا

امرت رس موجیں مارتا تھا۔ ایک بار یہ ہوا کہ ایک طالب علم جس نے اسلامیہ کالج سول لائنز سے ایم۔اے۔ پاس کیا تھا ان کے پاس آیا اور طالب علموں سے مخصوص کرسی پر بیٹھ کر ، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں لکچرر شپ کی خالی اسامی کے لئے سفارش کی درخواست کی ۔ خاں صاحب ایک منٹ تک چپ رہے ، پھر بولے ، آپ کے پاس کوئی ٹائی نہیں ہے ؟ طالب علم نے نفی میں سر ہلایا ۔ خاں صاحب نے کہا کہ سفارش تو میں کر دوں گا لیکن آپ انٹرویو میں جائیں گے جہاں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ٹائی نہیں لگائی ہے تو اس کے سر میں انگریزی گھس ہی نہیں سکتی ۔ طالب علم بڑی بے چارگی سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا ۔ میں نے فوراً اپنے گلے سے ٹائی آتاری اور برادرم دلدار بیگ مرزا کی مدد سے طالب علم کے گلے میں باندھ دی ۔ دوسرے دن میں نے اپنی میز پر ایک لفافہ رکھا ہوا دیکھا جس پر لکھا تھا " پروفیسر سجاد باقر رضوی ملاحظہ فرمائیں ۔" اس سطر کے نیچے یہ مصرع تھا " یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ " اور اس کے نیچے تھا " حمید احمد خاں "۔ میں نے لفافہ کھولا تو ایک ٹائی نکلی جو تقریباً اُسی رنگ کی تھی جس رنگ کی ٹائی میں نے ایک دن پہلے طالب علم کو دی تھی ۔ ٹائی کو دیکھ کر اور لفافے پر لکھا ہوا مصرع پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ میں نے جواب میں چند شعر کہے اور اسی قسم کے لفافے میں رکھ کر اور لفافے پر " پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ملاحظہ فرمائیں " لکھ کر ان کی میز پر رکھ دیا ۔ اس کے چند شعر مجھے اب بھی یاد ہیں :

قبلۂ من حمید احمد خاں　　مہر و لطف و عطا کا ایک جہاں
آپ نے دی ہے مجھ کو نکٹائی　　میری دل بستگی کا ہے ساماں
آپ کے دم سے ہے یہ رشتۂ شوق　　اب رسن بندیوں کی رسم کہاں
آپ چمکیں مثال مہر مبیں　　میں بنوں کسبِ نور کا ساماں

غرض اس قسم کے تین چار شعر اور تھے جو اب یاد نہیں ۔ چونکہ خلوص اور محبت کا کوئی اظہار ایسا نہ ہوتا تھا جس پر خاں صاحب کا دل نہ پسیجے ، لہذا

میں تو لفافہ رکھ کر کھسک آیا ، اس کے بعد نہ جانے کن کن دوستوں کو وہ نظم سننی پڑی۔ اگلے دن جب مجھے اس کا علم ہوا تو مجھے دوہری مسرت ہوئی۔ ایک تو خاں صاحب کے مشفقانہ ردِ عمل کی اور دوسری ایک کمینی سی مسرت کہ میرے شعر مسعود الحق صدیقی جیسے دوستوں کو بھی سننے پڑے جو میری شاعری کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے -

خاں صاحب کے ساتھ کام کرنا جان جوکھوں کا مرحلہ ہوتا تھا - کالج کی سرگرمیاں ان کے زمانے میں بہت زیادہ ہوگئی تھیں - ہر آستاد کے پاس کوئی نہ کوئی سوسائٹی ہوتی اور ہفتہ واری مجالس باقاعدگی سے ہوتی تھیں - بعض سوسائٹیوں میں خاں صاحب خود بہت دلچسپی لیتے تھے بالخصوص "بزمِ فروغِ آردو" میں - اور جس کام میں خاں صاحب دلچسپی لینے لگتے تو وہ کام سخت سے سخت تر ہو جاتا تھا۔ باریک سے باریک تفصیل ان کے پیشِ نظر ہوتی تھی اور ہر تفصیل ان کے حسبِ منشا مکمل ہونا ضروری تھا - ویسے تو میں کام جی جان سے کرتا لیکن خاں صاحب کی باریک بین نظر کوئی نہ کوئی سقم نکال ہی لیتی - میں پکڑا جاتا تو ڈانٹ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا - اختر الدین صاحب تو وضعدار اور سوٹ بوٹ والی بارعب شخصیت ہونے کے باعث برسرِ عام ڈانٹ ڈپٹ سے بچ رہتے تھے - مسعودالحق صدیقی البتہ اپنی والہانہ مسکراہٹوں کے باوجود پکڑے جاتے تھے - تاہم میں خفیہ طور پر ان سے جلتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ انہیں ڈانٹ کم پڑتی ہے اور مجھے زیادہ۔ سب سے بڑی قیامت اس زمانے میں آتی جب شمع تاثیر کے مشاعرے کا وقت قریب آتا - دو ماہ پہلے سے انتظامات شروع ہوتے اور جب تک مشاعرہ ختم نہ ہوتا مصیبت سر پر منڈلاتی رہتی -

خاں صاحب کی ایک عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی کام سے ہمیں بلاتے تو کہتے کہ ذرا بیٹھ جائیے ابھی آپ سے بات کرنی ہے - میرے دوست مسعود الحق صدیقی ، دلدار بیگ مرزا ، اختر الدین ، خواجہ غلام صادق وغیرہ کو تو اللہ تعالیٰ نے قلبِ مطمئنہ عطا کیا ہے - وہ آرام سے بیٹھتے اور خاں صاحب کی فراغت کے

منتظر رہتے - میرا پارہ اُس زمانے میں ٹھہرتا ہی نہ تھا - ٹھہرا تو اب بھی نہیں ہے - مگر اب قویٰ مضمحل ہوتے جا رہے ہیں - ہاں تو اس زمانے میں یہ ہوتا کہ میں بیٹھتا اور پھر یہ سوچ کر کہ ابھی خاں صاحب کو فارغ ہونے میں دیر لگے گی کسی کام کے بہانے سے باہر بھاگ نکلتا - پھر بلوایا جاتا - خاں صاحب میری اس عادت کو سمجھ گئے تھے ، ایک دن پوچھنے لگے " باقر صاحب ، کیا آپ بچپن میں پٹتے زیادہ رہے ہیں ؟" ظاہر ہے کہ خاں صاحب میرے بھگوڑے پن کی نفسیات کا اندازہ لگا رہے تھے اور مجھے تعجب یہ تھا کہ انہیں یہ راز کی بات کیسے معلوم ہو گئی - باہر نکل کر جب مسعود الحق صدیقی نے ایک مخصوص استہزائی ہنسی سے میرا استقبال کیا تو مجھے شدید غصہ آیا - دل میں سوچا کہ اچھا بچّو ، کبھی میرا موقع بھی آئے گا - یہ الگ بات ہے کہ میرا موقع کبھی نہ آیا -

میں فطرتاً لڑائی جھگڑے سے بھاگتا ہوں - اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں لڑنا نہیں چاہتا - لڑنا تو چاہتا ہوں مگر حریف چھانٹ کر - مثال کے طور پر شہرت بخاری سے لڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں - لیکن کسی تندرست آدمی سے یا کسی ایسے شخص سے جس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ، لڑنے سے ڈرتا ہوں - مگر عجیب بات یہ ہے کہ خاں صاحب سے مجھے کبھی خوف نہ آیا - نہ اُس وقت جب وہ پرنسپل تھے اور نہ ہی اُس وقت جب وہ وائس چانسلر تھے - مجھے ان کی اصول پرستی اور شفقت پر پورا اعتماد تھا - اس لئے ان سے بھی دو دو چونچیں کر لینے میں (اور شاید اس سے زیادہ میرے بس میں نہ تھا) کوئی حرج نہ سمجھتا تھا - ایسی لڑائیوں کا حاصل یہ ہوتا کہ بالآخر ہم دونوں کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور خاں صاحب مجھے معاف کر دیتے تھے - خاں صاحب کے دل کے آئینے پر کدورت کی گرد زیادہ دیر تک جمی نہ رہ سکتی تھی - ایسی لڑائیوں میں کمزور حریف چونکہ میں خود ہوتا لہذا اخلاقی طور پر صلح و صفائی اور دلجوئی کی ساری اخلاقی ذمہ داری خاں صاحب کے سر ہوتی - یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ابھی اسلامیہ کالج میں اساتذہ کے کمرے نہیں بنے تھے - اسٹاف کے لان میں خاں صاحب بیٹھے تھے اور میں اور

پروفیسر امین مغل ، پروفیسر یوسف جمال انصاری اور چند دیگر احباب ان کے گرد تھے - خاں صاحب نے کہا کہ میں اپنے پروفیسروں کے سر لائبریری کی الماریوں میں دے دینا چاہتا ہوں - میں بزعم خود ، اپنے آپ کو شوق مطالعہ رکھنے والوں میں شمار کرتا تھا، اس لئے ان کی چوٹ برداشت نہ کر سکا - میں نے کہا جناب پروفیسر درختوں پر بیٹھ کر تو پڑھ نہیں سکتے آخر ان کے مطالعے کے لئے کوئی جگہ بھی تو ہو - یوں بات بڑھتی گئی - خاں صاحب ناراض ہوتے رہے اور میں بھی آلٹی سیدھی ہانکتا رہا - پھر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے - چھٹی ہوئی تو میں اور پروفیسر یوسف جمال انصاری کالج سے نکلے - ابھی ہم چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک کار ہمارے پاس آ کر رکی - اندر سے آواز آئی " یہ پرنسپل اسلامیہ کالج کی کار نہیں ہے، حمید احمد خاں کی کار ہے- آپ لوگ تشریف لائیں-" میں آگے اور انصاری صاحب پیچھے بیٹھ گئے - خاں صاحب نے تو انصاری صاحب کو ٹی ہاؤس پر آتارا اور مجھے ٹمپل روڈ تک پہنچایا - راستے میں انھوں نے اپنی شفقت اور محبت کے جال میں مجھے اس طرح جکڑ لیا کہ میں بازو بھی ہلا نہ سکا -

میں اگر یہ کہوں کہ میں بھی حمید احمد خاں صاحب کا ایک ادنیٰ سا شاگرد ہوں تو یہ بات بڑی حد تک درست ہوگی - میں نے تعلیم تو کراچی میں مکمل کر لی تھی ، لیکن یہ خاں صاحب کی کشش تھی کہ انھوں نے مجھ کو لاہور کھینچ بلایا - اسلامیہ کالج کا دو حصوں میں بٹوارہ ہوا تو شعبۂ انگریزی میں سب سے جونیئر ہونے کے باوجود مجھے اپنے ساتھ ڈگری کالج میں رکھا - یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو میرے لئے بھی گنجائش پیدا کی - اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے استادی کا فن اور طالب علموں کے ساتھ رابطہ رکھنے کا سلیقہ انہیں نے سکھلایا - خاں صاحب تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کے بڑے قائل تھے - ان کے زمانے میں ہمیں یہ ہدایت تھی کہ جو طالب علم ہمیں سلام نہ کریں انہیں ہم خود سلام کریں - اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ طلبا ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر نہ چلیں ، اور یہ کہ کالج میں طالبات کے سر سے آنچل نیچے نہ ڈھلکے - آج بھی میرے کانوں میں ان

کی یہ آوازیں گونجتی ہیں " دیکھیئے باقر صاحب آپ کا وہ شاگرد اپنے دوست کی کمر میں ہاتھ ڈالے جا رہا ہے " یا " دیکھئے اس طالبہ کے سر پر آنچل نہیں ہے ۔" حمید احمد خاں صاحب کے زمانے میں اسلامیہ کالج (سول لائنز) نے نہ صرف نظم و ضبط کے حدود میں بلکہ تعلیمی و تخلیقی نیز کھیل کود کے احاطۂ کار میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی ۔

خاں صاحب پکے مسلمان اور پکے پاکستانی تھے ۔ اسلام اور پاکستان کے بارے میں ان کا عقیدہ غیر متزلزل تھا۔ معاشرے میں حرکی اخلاق معیارات کے شدت سے قائل تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ ادب کے استاد ہونے کی حیثیت سے ادب ، فن اور اردو زبان سے عشق رکھتے تھے اور کالج میں ان کے فروغ کے لئے تمام تر ممکن سہولتیں مہیا کرتے تھے ۔ اسلامیہ کالج کے سخت گیر ماحول میں بھی فن نوازی کی روایت انھیں نے مضبوط کی ۔

پاکستان کے مشہور رقاص جناب فقیر حسین ساگا نے (جن کے استاد ہونے کا مجھے بھی شرف ہے) انھیں کے عہد میں کالج میں اپنے فن کے کمالات کی ابتدا کی ۔ ان کے زمانے میں پہلی بار اسلامیہ کالج میں محفل رقص و موسیقی برپا ہوئی ۔ اس محفل میں دیگر اصحاب کے علاوہ ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کو بھی منصفین کی صف میں شامل کیا گیا ۔ اسلامیہ کالج کے دفتر کے مشہور ہیڈ کلرک جناب قاضی سید احمد نے منصفین کی فہرست دیکھی تو بے قرار ہوگئے اور خاں صاحب کی میز پر وہ کاغذ رکھ کر بڑے دکھ سے کہنے لگے " دیکھئے جناب، اب اس کالج میں کیا ہو رہا ہے (ان کا اشارہ روشن آرا بیگم کو کالج میں بطور منصف مدعو کرنے کی طرف تھا) خاں صاحب نے حیرت سے قاضی صاحب کو دیکھا اور کہا " قاضی صاحب آپ نے روشن آرا بیگم کو دیکھا ہے ؟ وہ بہت بوڑھی ، بہت کالی اور بہت موٹی ہیں ۔ ان کے آنے پر آپ کو کیا اعتراض ہے ؟" قاضی صاحب اس بات کو شعارِ اسلامی کے خلاف سمجھتے تھے ، انہوں نے بڑے درد انگیز لہجے میں کہا " مگر خاں صاحب، نام تو دیکھئیے، روشن ۔ ۔ ۔ ۔ آرا ۔ ۔ ۔ ۔ بیگم ۔ ۔ ۔ ۔" خاں صاحب لاجواب ہوگئے۔

غصے سے میری طرف دیکھا ، اور کہنے لگے " باقر صاحب ! جائیے ، یہ نام منصفین کی فہرست سے خارج کرا دیجئے - یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں اچھی آوازوں اور اچھی صورتوں سے نفرت ہے - لڑکا بھی اگر خوبصورت ہو تو یہ اس سے برقع پہننے کا تقاضا کریں گے -"

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی ادبی وابستگیوں میں سب سے بڑی وابستگی میرزا غالب سے تھی - پنجاب یونیورسٹی میں مجلسِ یادگارِ غالب کا قیام اور اس مجلس کی جانب سے غالب کی تمام تصنیفات کی تدوین و اشاعت اور غالب سے متعلق بعض اہم تنقیدی کتابوں کی اشاعت انہیں کا کارنامہ ہے - یہ الگ بات ہے کہ ان پر یونیورسٹی کے " دیدہ وروں " نے یہ الزام بھی لگایا کہ اتنی بڑی رقم اس فضول کام میں ضائع کر دی - مگر غالب سے ان کا ربط ایک خاص اہمیت کا حامل تھا - غالب اپنے عہد کے ٹوٹتے اور بکھرتے طرز احساس کو اپنی شاعری کے ذریعے مربوط کر رہا تھا - حمید احمد خاں ٹوٹی پھوٹی شخصیتوں کے اس دور میں مربوط شخصیت کا تصور پیش کر رہے تھے - اگر کسی عہد میں ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ جاری ہو اور اس زمانے کے بے آواز تیشے ہر شے کے ٹکڑے آڑا رہے ہوں اور ہر صورت کو مسخ کر رہے ہوں تو ایسے میں کانوں کو ہر آواز کے لئے کشادہ رکھنا، اقدار و نصب العین پر نظریں رکھنے کے لئے آنکھیں کھلی رکھنا اور آواز میں لغزش اور گھگھیاہٹ نہ آنے دینا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے - بال کی کھال نکالنے والے منطقی ذہن کو جس معصومیت اور حیرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ حمید احمد خاں صاحب کو بدرجہ اتم نصیب تھی - پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں ایک بار انہیں آرٹس کونسل میں مصوری کی ایک نمائش کا افتتاح کرنا تھا : مجھے حکم دیا کہ تم بھی میرے ساتھ چلنا - جب ہم چڑیا گھر کے نزدیک پہنچے تو ابھی مقررہ وقت میں دس منٹ باقی تھے - خاں صاحب نے کار چڑیا گھر میں موڑ لی - ہم دونوں باہر نکلے - خاں صاحب نے گرد و پیش کے درختوں کو دیکھا اور بولے " باقر صاحب کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ یہ پیڑ فضاؤں میں اپنے ہاتھ بلند کئے کیسے چپ کھڑے رہتے ہیں -" میں نے دل

ہی دل میں خاں صاحب کی درخت دوستی کی داد دی اور خود بھی بچپن کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاں صاحب کے تحیّر کے عالم میں داخل ہونے کی کوشش کی ۔ " خاں صاحب یہ سامنے دو جانور کھڑے ، ہیں انہیں کیا کہتے ہیں" ۔ " نیل گائے" خاں صاحب نے جواب دیا ۔ " تو خاں صاحب انہیں نیل گائے کیوں کہتے ہیں ۔ ان کے رنگ تو نیلے نہیں ہیں ؟" میں نے استفسار کیا ۔ خاں صاحب نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر چند سیکنڈ غور کیا ، پھر بولے " وہ دیکھئیے کانوں کے اندر نیلاہٹ ہے ۔" میں نے اپنے چہرے پر اطمینان کا تاثر سمیٹا ۔ اس دوران میں وقت ہو چلا تھا اور ہم عین وقت پر آرٹس کونسل پہنچ گئے ۔ بلوغت اور معصومیت ، عقل اور احساس کا یہ توازن غالب کی شاعری کی طرح خاں صاحب کی شخصیت کی خصوصیت بھی تھا ۔ اسی مماثلت کے باعث غالب ساری زندگی ان کا اہم مسئلہ بنا رہا ۔ چند برس پہلے انھوں نے "نسخۂ حمیدیہ" کی تدوین بھی کی تھی ۔ مگر شاید خاں صاحب اپنے تعلق کو مرنے کے بعد بھی منقطع کرنے کو تیار نہ تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنا قبرستان منتخب کر لیا تھا ۔ یہ قبرستان غالب روڈ پر واقع ہے ۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

پروفیسر حمید احمد خاں ۔ چند تاثرات

۲۳ مارچ کو اخبار آٹھایا تو سب سے پہلے سیاہ حاشیے میں خاں صاحب کی تصویر پر نظر پڑی اور ساتھ ہی نظریں ایک اندوہناک خبر پر جم گئیں " ممتاز ماہر تعلیم اور ادیب پروفیسر حمید احمد خاں انتقال کر گئے۔" اس خبر کو پڑھ کر میرا ردِ عمل کیا ہوا ، اس کا اظہار میں لفظوں کے ذریعے نہیں کر سکتا ، مجھے زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہو رہا ہے کہ لفظ مر گئے ہیں، لفظوں کی قوت مفلوج ہو گئی ہے ۔ ان کے انتقال پر بہت سے تعزیتی بیانات شائع ہوئے ہیں اور شائع ہوں گے۔ ان کی موت کو ناقابل تلافی بتایا جائے گا ، اسے ایک عظیم المیہ قرار دیا جائے گا ۔ لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آج کن لفظوں میں اس شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں ۔ ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر اور جنازہ میں شرکت کر کے بھی یہ یقین نہیں آتا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ اس لئے کہ خاں صاحب بے حد فعال انسان تھے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ موت نے ایسے فعال انسان کو کیسے شکست دی ہوگی ۔ موت کتنی بے رحم ہے۔ وہ کیسے کیسے لوگوں کو شکست دے دیتی ہے ۔ لوگ ہر روز مرتے ہیں اور ہر روز مرتے رہیں گے لیکن پروفیسر حمید احمد خاں کے انتقال پر موت کو کچھ تو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ ایک عظیم شخصیت کو ، ایک عظیم کردار کو ، اور ایک پورے عہد کو ایک دنیا سے دوسری دنیا تک آخر کیوں منتقل کر رہی ہے۔ موت نے شاید کچھ نہیں سوچا اور ایک بڑا انسان دوسری دنیا میں منتقل ہوگیا ۔ موت نے ان کے جسم کو ان کی روح کو شکست دے دی ہے ، لیکن

ان کے عظیم کردار کو نہ ہی شکست ہوئی ہے اور نہ ہی اس کا انتقال ہوا ہے ، ان کا کردار ہمارے دلوں پر نقش ہے اور نقش رہے گا ۔

مجھے ۱۹۵۸ء کا زمانہ یاد آ رہا ہے ، اسلامیہ کالج میں میرا پہلا سال تھا ، کچھ دنوں بعد کالج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ ریلوے روڈ میں انٹرمیڈیٹ کلاسز شروع ہوئیں اور سول لائنز کو ڈگری کالج بنا دیا گیا ۔ ہم لوگ ریلوے روڈ چلے گئے ۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ ہمارے اکثر پسندیدہ استاد سول لائنز میں رہ گئے ہیں۔ اس پر افسوس ہوا ۔ لیکن اس بات پر اطمینان تھا کہ ہم انٹر کے بعد جلد ہی ان سے جا ملیں گے ۔ اس زمانے میں سول لائنز میں " بزم فروغ اردو " کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے تھے ۔ ایک ایسے ہی اجلاس میں شرکت کے لئے میں اپنے دوستوں کے ہمراہ سول لائنز آیا ۔ جب ہم لوگ پہنچے تو اساتذہ و طلبہ چائے پی رہے تھے ۔ ہمارا تعلق چونکہ کالج سے نہیں تھا اس لئے ہم ایک طرف سمٹ کر کھڑے ہو گئے ۔ اتنے میں ایک طالب علم ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ خاں صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ چائے پئیں۔ میں نے پوچھا کون خاں صاحب ؟ کہنے لگا ہمارے پرنسپل۔ لڑکے اور استاد چائے پی کر سٹاف روم میں جا رہے تھے کہ ہم لوگ چائے کی میز پر پہنچے ۔ اس شاندار Reception پر ہم اتنے خوش تھے کہ دیر تک کام و دہن کی آزمائش میں مصروف رہے ۔ اتنے میں وہی طالب علم بھاگا ہوا آیا اور بولا آپ لوگ چائے کب ختم کریں گے ؟ میں نے کہا آپ کا مطلب ؟ کہنے لگا کہ خاں صاحب آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں ۔ انہوں نے حکم دے رکھا ہے کہ جب تک آپ لوگ نہ آئیں اجلاس شروع نہ ہو ۔ یہ خاں صاحب کی شخصیت کا پہلا نقش تھا ۔ دوسرے کالج سے آئے ہوئے جونیئر طالب علموں کے ذوق و شوق کا یہ احساس کسی عظیم شخصیت ہی کے حصے میں آ سکتا تھا ۔

۱۹۶۰ء میں میں گورنمنٹ کالج کو چھوڑ کر سول لائنز میں محض خاں صاحب کی شخصیت کے باعث داخل ہوا۔ اسی زمانے میں ان سے تعارف ہوا ۔ اسلامیہ کالج میں میں ۱۹۶۳ء تک رہا اور ان تین سالوں میں ان کی شخصیت کو قریب

سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ انسان دوستی نہیں بلکہ انسان پرستی کا جو جذبہ میں نے ان میں دیکھا وہ اس دور میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ کسی کو مصیبت میں دیکھنا اور پھر اس کی مصیبت کو دور نہ کرنا، یہ ان کے لئے ناقابل برداشت بات تھی۔ جب تک وہ مصیبت ختم نہ ہو جاتی وہ سخت بے چین رہتے۔ ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت میں مبتلا رہتے۔ جنوری ۱۹۶۱ میں انھوں نے کالج کے طلبہ کو حکم دیا کہ وہ کالج کا بلیزر پہن کر آیا کریں اور جو طالب علم بلیزر نہ بنوا سکیں وہ فان کلر کی جرسی پہنیں۔ اس حکم پر سختی سے عمل درآمد ہونے لگا۔ کالج کے بہت سے طلبہ نے کہا کہ وہ بلیزر بنوانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ خاں صاحب نے انہیں کالج فنڈ سے بلیزر بنوا دئے۔ انہی ایام میں ایک روز گیٹ پر خود بلیزر چیک کرنے نکلے۔ ہم لوگ ان کے ساتھ تھے۔ موسم سرما کا ایک سخت سرد دن تھا۔ ایک طالب علم گیٹ میں داخل ہوا جسے خاں صاحب نے خود روک لیا۔ اس کے جسم پر صرف قمیض اور شلوار تھی۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ خاں صاحب کو دیکھ کر اس کپکپاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ ڈر، خوف اور رحم کے ملے جلے جذبات سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، کہ بلیزر نہ ہونے سے اب کالج میں اس کا داخلہ بند ہو جائے گا۔ اُسے اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ خاں صاحب نے پوچھا تمہارا بلیزر کہاں ہے؟ اُس نے کہا۔ جی میں بلیزر نہیں بنوا سکتا، میرا باپ ایک مل میں مزدور ہے، ہم بمشکل دو وقت کا کھانا کھاتے ہیں۔ خاں صاحب کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ ان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اتنے میں دفتر کے کچھ لوگ اور اساتذہ بھی آ گئے جن کے سپرد بلیزر کی چیکنگ تھی۔ خاں صاحب کا حکم تھا کہ جو طالب علم بلیزر نہ بنوا سکے اس کی اطلاع انہیں دیں۔ وہ دفتر کے عملے کو ڈانٹ رہے تھے کہ اس طالب علم کی اطلاع اب تک انہیں کیوں نہیں ملی۔ اگر یہ طالب علم سردی سے مر جاتا تو اس کا خون کس کی گردن پر ہوتا اور ہم لوگ خدا کو کیا جواب دیتے؟ اسی وقت اس طالب علم کے لئے بنی بنائی قمیض منگوائی گئی اور ۲۴ گھنٹے کے اندر اس کا بلیزر اور پتلون سلوانے کا حکم دیا۔ دو روز بعد وہ بلیزر پہن کر کالج میں آیا تو خاں صاحب کی آنکھوں میں ایک روشنی تھی اور ان کے چہرے

پر ایک سکون تھا ۔ اور کل جب ہم ان کی نماز جنازہ پڑھ رہے تھے تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہر شخص نے خاں صاحب کا دیا ہوا بلیزر پہن رکھا ہے۔ کسی شخص کے جسم پر ان کی محبت و خلوص کا بلیزر تھا اور کسی شخص نے ان کے احسانات کا بلیزر پہن رکھا تھا کسی، کو انہوں نے علم و ادب کا بلیزر دیا تھا اور کسی کے تن پر ان کی انسان پرستی کا بلیزر رنگ دکھا رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جس شخص نے ساری عمر بلیزر تقسیم کرنے میں گزار دی ہوگی ، اللہ تعالیٰ اس سے کیا حساب لے گا۔

بی۔ اے۔ میں میرا ایک کلاس فیلو مولوی الیاس تھا ۔ یہ بہت لائق طالب علم تھا ۔ پولیٹیکل سائنس میں ہمارا پہلا پیریڈ آٹھ بجے لگتا تھا اور پروفیسر گلزار محی الدین ہمارے استاد تھے ۔ اکثر ایسا ہوا کہ ادھر پیریڈ شروع ہوا اور ادھر چپڑاسی آ جاتا کہ خاں صاحب مولوی کو بلا رہے ہیں ۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا، مولوی تمہیں خاں صاحب اکثر کیوں بلاتے ہیں ؟ کہنے لگا میں یہ نہیں بتا سکتا ، تم فضول آدمی ہو میرے خلاف پروپیگنڈہ کرو گے، میں نے کہا ۔ ہرگز نہیں۔ کہنے لگا اچھا آئندہ جب چپڑاسی آئے میرے پیچھے چلے آنا اور خاں صاحب کے دفتر کے شیشوں میں سے دیکھنا، تمہیں پتہ چل جائے گا۔ میں کئی روز انتظار کرتا رہا۔ مولوی کو بلاوا نہ آیا ۔ آخر ایک دن چپڑاسی آ گیا ۔ مولوی چلا گیا ۔ کوئی دس منٹ بعد میں کلاس سے نکل آیا اور دفتر کا رخ کیا ۔ آہستہ آہستہ شیشوں کی طرف بڑھا اور ایک عجیب منظر دیکھا ۔ مولوی دھڑا دھڑ ڈبل روٹی کو مکھن لگا کے فرائیڈ انڈے کھا رہا تھا ۔ پھر اس نے دودھ کا گلاس پیا ۔ میں نے شیشوں سے آنکھیں ہٹا دیں اور خاموشی سے چلا آیا ۔ دوسرے روز میں نے مولوی سے کہا ، میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے ۔ مولوی نے کہا ، ایک روز میں کالج آیا تو میرا چہرہ اترا ہوا تھا ۔ میں کسی کام کے سلسلے میں خاں صاحب کے پاس گیا ۔ مجھے اس حالت میں پا کر انہوں نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں ایک غریب شخص ہوں ۔ مسجد میں رہتا ہوں ۔ اگر صبح کو کچھ آ جائے تو ناشتہ کر لیتا ہوں ورنہ یونہی کالج آ جاتا ہوں ۔ یہ سن کر اسی وقت خاں صاحب نے میرے لئے ناشتہ منگوایا ۔ اور اب وہ کبھی کبھی مجھ پر یہ عنایت کرتے رہتے ہیں ۔ ایک روز میں نے مولوی کے ناشتہ کا ذکر خاں صاحب

سے کیا۔ انہوں نے کہا بھائی، میں جب بھی صبح ناشتے کی میز پر جاتا ہوں تو مجھے اس طالب علم کا خیال آ جاتا ہے، اس لئے کبھی کبھی اسے یہ زحمت دیتا ہوں ۔

خاں صاحب نے اسلامیہ کالج میں بہترین اساتذہ کو جمع کیا تھا ۔ ان کی دوستی ہمیشہ کالج کے روشن خیال اساتذہ سے رہی ۔ پروفیسر ایرک سپرین ۔ پروفیسر سجاد باقر رضوی ۔ پروفیسر منظور احمد ۔ پروفیسر امین مغل ۔ پروفیسر اختر اقبال کمالی ۔ پروفیسر یوسف جمال انصاری ۔ پروفیسر عزیز الدین احمد ۔ ڈاکٹر سعید اللہ اور پروفیسر مسعود الحق صدیقی ان کے بہت قریب رہے اور وہ ان اساتذہ کی بے حد عزت کرتے تھے ۔ کالج میں ایک بار انجمن سے خاں صاحب کے اختلافات پیدا ہوئے۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا ۔ کالج کے تمام اساتذہ نے متفقہ طور پر اپنے استعفے لکھ کر ان کے سپرد کر دیے ۔ کسی کالج کی تاریخ میں اس قسم کا شاید یہ پہلا اور آخری موقع ہو ۔ یہ ان کے حسن سلوک اور خلوص کا نتیجہ تھا ۔

وہ اپنے طالب علموں سے بے حد محبت کرتے تھے ۔ ان کی مدد کے لئے ہر وقت اور ہر جگہ تیار رہتے تھے ۔ ایک بار ایک پرانا طالب علم آیا اس نے خاں صاحب کو بتایا کہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں ایک جگہ خالی ہے ۔ اگر آپ پرنسپل شیخ محمد اسلم سے سفارش کر دیں تو میرا کام بن سکتا ہے ۔ خاں صاحب نے اسی وقت شیخ صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی اور اس کی ملازمت کی خوشخبری سنائی اور اسے کہا کہ انٹرویو ہو رہا ہے ٹائی لگا کر جانا ۔ طالب علم نے کہا جناب میرے پاس کوئی ٹائی نہیں ہے ۔ خاں صاحب نے اسی وقت اپنی ٹائی اتار کر اس کے سپرد کر دی ۔ ان کے پاس اس وقت شاید پروفیسر سجاد باقر رضوی بیٹھے تھے ۔ انہوں نے فوراً اپنی ٹائی اتار کر اس شخص کو دی اور خاں صاحب کی ٹائی لوٹا دی ۔ یادوں کا ایک سلسلہ ہے کہ پھیلتا جا رہا ہے ۔ ذہن میں بے شمار تصویریں ابھر رہی ہیں ۔ یہ تصویر اس شخص کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے ۔

خاں صاحب کے زمانے میں اسلامیہ کالج میں علم و ادب کی جو روشنی پھیلی وہ اسے بعد میں کبھی بھی نصیب نہ ہو سکی ۔ انہوں نے ادبی انجمنوں کی بذات

خود سرپرستی کی - بزم فروغ آردو اور ینگ رائٹرز کی ادبی نشستیں لاہور کی مجلسی زندگی میں مشہور تھیں - کالج میں نئے نئے پروگرام بنتے - ۱۹۶۲ء میں ہم نے ایک "ینگ رائٹرز" کنونشن کی بنیاد ڈالی - تین روز تک اس کے پروگرام جاری رہے - پورے شہر میں اس کی دھوم تھی - پھر ینگ رائٹرز میں نئی شاعری پر مباحثے ہوئے اور نئے شعرا کی نظمیں اس میں پڑھی جانے لگیں- بزم فروغ آردو ینگ رائٹرز کے مقابلے میں بزرگوں کی محفل تھی خاں صاحب اپنی نگرانی میں اس کے پروگرام بنواتے تھے- بزم کی نشستوں میں وہ خود شریک ہوتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے - جو طالب علم ان مباحثوں میں گفتگو کرتے وہ ان کی سرپرستی کرتے - سال کے سال "شمع تاثیر" کا بین الکلیاتی مشاعرہ ہوتا - یہ مشاعرہ ڈاکٹر تاثیر کی یاد میں ہوتا تھا - مرحوم شب و روز اس کی تیاریوں میں شریک رہتے - کالج میں ہمہ وقت ایک جشن کا سماں رہتا تھا - محفلیں خاں صاحب کے دم قدم سے آباد تھیں - وہ کالج سے رخصت ہوئے تو آہستہ آہستہ ان کی روشنی کم ہونے لگی - اور اب اسلامیہ کالج میں آئیں تو منظر ہی بدلا ہوا ملتا ہے -

ع نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

سپرین صاحب کا چائے خانہ سرد ہو چکا ہے، اس لئے کہ خاں صاحب کے بعد انجمن حمایت اسلام نے اسلام کے نام پر کالج کے بعض جرات مند اور روشن خیال اساتذہ کو نکال دیا - خاں صاحب کے جانے کے بعد روشن خیالی کے یہ چراغ کالج سے تو بجھا دئے گئے مگر ان کے سینکڑوں عقیدت مند شاگرد اب بھی اپنی اپنی جگہ چراغ سے چراغ جلا رہے ہیں - روشن خیالی کی ایک تحریک ہے جو تاریکی کے خلاف مسلسل جاری ہے -

کردار کے اعتبار سے ان کا قد اتنا آونچا تھا کہ ہم لوگ ان کے سامنے بونے معلوم ہوتے ہیں - بڑی بڑی قد آور شخصیتوں کے یوں آٹھنے سے مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے اب ہم کو بونوں کی دنیا میں رہنا پڑے گا جہاں لوگ ایڑیاں آونچی کر کے قد کو آونچا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں -

خاں صاحب کی شخصیت ایک اونچے اور گھنے سائے والے درخت کی سی تھی ، جس کے سائے کے تصور ہی سے سکون ملتا تھا ۔ ملتے تو شفقت ، محبت اور خلوص کا دریا بہنے لگتا اور یوں معلوم ہوتا کہ جیسے اس گھنے درخت کے سائے اور پھیل گئے ہیں ۔ یہ شخصیت کا جادو تھا جب چلتا تھا تو اس کے پھیلاؤ اور وسعت کی کوئی انتہا نہ رہتی ۔ میں ان بے شمار لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو یہاں بیٹھے ہیں اور باہر کی دنیا میں موجود ہیں ۔ آج وہ جس مقام اور مرتبہ پر ہیں وہ اسی اونچے اور گھنے درخت کے سائے میں یہاں تک پہنچے ہیں ۔ لیکن آج یہ سایہ اٹھ گیا ہے اور ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ایک ہرے بھرے میدان میں ہر شے اچانک خشک ہو گئی ہے اور ہم شدید دھوپ کی یلغار میں آ گئے ہیں ۔ میں اپنے ارد گرد نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے کوئی سایہ نظر نہیں آتا جو اس کڑی دھوپ میں پناہ دے سکے ۔

(پروفیسر حمید احمد خاں کی یاد میں ، حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا ۔)

———

جناب عبدالحفیظ کاردار

پروفیسر حمید احمد خاں ۔ ایک فعال شخصیت*

محترمہ بیگم حمید احمد خاں ، معزز خواتین و حضرات ،

آج اس محفل میں مرحوم پروفیسر حمید احمد خاں کی ہر شخص نے تعریف کی ہے ۔ جو جذبات مقررین کے ہیں، وہی جذبات یہاں پر موجود تمام حاضرین کے ہیں ۔ میں نے خاں صاحب کے ہم عصروں اور ان کے شاگردوں سے ہمیشہ اُن کی تعریف ہی سنی ہے ۔

وہ ایک مقبول اُستاد تھے اور اُن کا زندگی میں جو منصب تھا وہ وائس چانسلر ہونے کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوا بلکہ وفات تک قائم رہا اور میں ایک بات ایسی کہنا چاہتا ہوں جس کا پہلے شاید اعلان نہیں ہوا اور بہت کم اصحاب کو اس کا علم ہوگا کہ اُن کی وفات سے صرف چند روز پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اُن کو پھر ایک بار یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کر دیا جائے ۔

وہ حصول علم سے گہرا شغف رکھتے تھے ۔ جس موضوع پر کام کرتے اس پہ مکمل عبور حاصل کرتے تھے ۔ جن لوگوں کو ان سے ملاقات کا یا ان کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ اس بات سے واقف ہیں ۔ علمی حلقوں میں اُن کی بات اور ان کی شخصیت کا ایک خاص مقام تھا ۔ وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم تھے ۔ ان کی وفات سے آج جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پورا نہیں کیا جا سکتا ۔

وہ ایک عالم تھے، لیکن علم کی دولت کے علاوہ ان کے پاس ایک اور دولت بھی تھی ۔ یہ ان کی اصول پرستی تھی ۔ وہ ایک اصول پرست انسان تھے ۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اصول پرستی میں بسر کی، اور اپنے قائم کردہ اصولوں پر

---

* وزیر تعلیم پنجاب کی وہ تقریر جو انہوں نے پاکستان سینٹر ، لاہور کی ایک تقریب بیاد پروفیسر حمید احمد خاں ، منعقدہ مارچ ۱۹۷۴ء میں کی ۔

ہمیشہ عمل پیرا رہے - آج جب میں ان کی اس خوبی کو یاد کر رہا ہوں تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا آج پاکستان میں اصول پرست لوگ پیدا نہیں ہوتے ؟ کیا وہ عقائد پر یقینِ محکم (Conviction) رکھنے والے اور جرأت مند شہری (Civil Courage) اب ختم ہو چکے ہیں ؟

اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے - ۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ میں ویانا (Vienna) سے روم جا رہا تھا - راستے میں ایک کتاب " دی تھرڈ رائش " (The Third Reich) پڑھ رہا تھا - یہ کتاب اسی روز شائع ہوئی تھی - میرے سامنے ایک بزرگ بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ تین چار ساتھی بھی تھے - ویانا میں بین الاقوامی کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں - شاید یہ کسی ایسی کانفرنس میں شرکت کے بعد آ رہے تھے - ان میں سے ایک صاحب نے میرے ہاتھ میں " دی تھرڈ رائش " دیکھ کر کہا کہ میں اس کتاب کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں - میں نے کہا فرمائیے - کہنے لگے ہٹلر سے بھاگ کر میں امریکہ چلا گیا تھا ، لیکن اس کتاب کو سرسری پڑھنے کے بعد مجھے یہ تبصرہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف کو یہ معلوم نہیں ہے کہ آج پوری دنیا میں ، اور امریکہ کو اس میں میں شامل کر رہا ہوں، کہیں بھی شہری آزادی اور جرأت مند فرد (Civil Courage) موجود نہیں ہے - زندگی اتنی منظم ہے اور جدید ریاست کا ڈھانچہ اتنا قوی ، کہ آپ جب اس تمام مشینری کو استعمال ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فرد میں کہیں بھی شہری جرأت (Civil Courage) باقی نہیں رہی ، یا اگر ہے بھی تو بہت کم -

اس لئے ہم جب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی سی با اصول شخصیتوں کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُن کی زندگی کو مثال بنا کر ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہے اور یہ سیکھنا ہے کہ جن لوگوں میں یقین محکم (Conviction) اور جرأت (Courage) ہے وہی انسان ہیں جن کو مثالی طور پر اپنے سامنے رکھ کر ہمیں زندگی بسر کرنی ہے - یہی وہ کردار تھا جس کی وجہ سے

طالب علم اور ان کے ہم عصر خاں صاحب کی عزت کرتے تھے - اور میرے خیال میں اسی لئے ان کو دوبارہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کرنے کے لئے سوچا گیا تھا -

خاں صاحب سے میری ایک ملاقات گزشتہ دسمبر میں مجلس ترقی ادب کی انتظامیہ کے ایک جلسے میں ہوئی تھی - مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ زندگی کی اس منزل پر بھی پہنچ کر پوری طرح با اختیار اور با اثر تھے اور پوری تن دہی سے کام میں لگے ہوئے تھے اور مجلس کے آئندہ پروگرام کو بنا رہے تھے - اقبال کی ولادت کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں وہ مجلس کی طرف سے اقبال پر کتابیں لکھوانے اور شائع کروانے کا منصوبہ بنا رہے تھے - یہ زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب لوگ آگ کے قریب بیٹھ کر اونگھنے اور یادوں کو تازہ رکھنے میں وقت گزارتے ہیں - لیکن خاں صاحب پوری طرح ایک مستعد اور فعال زندگی بسر کر رہے تھے -

ابھی چند دن پہلے اقبال پر ایک جلسے* میں میں نے بھی ان کے ساتھ شرکت کی - اور خاں صاحب جیسے کالج کے دنوں میں شفقت سے پیش آتے تھے اور ہمت بڑھاتے تھے (encouragement) ، انھوں نے اس جلسے میں بھی میرے ساتھ اسی طرح سے سلوک کیا اور میں ان کا از حد ممنون تھا کہ جس شخصیت کو ہم علم کا ایک سمندر اور ادبی دنیا کا ایک ستون سمجھتے ہیں آنھوں نے میری خاص طور پر ہمت افزائی کی ہے -

یہاں پر جن حضرات نے یہ ذکر کیا ہے کہ آن کی یاد اور ناقابل فراموش

---

* ۱۳ جنوری ۱۹۷۷ء کو مجلس ترقی ادب کے زیر اہتمام اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں جناب کاردار نے اقبال سے متعلق اپنا انگریزی مقالہ "Is Religion Possible" پڑھا تھا جو علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا ۔ (مقالہ ۱۳ جنوری کے پاکستان ٹائمز میں بھی چھپا تھا -)

خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈنا چاہیے تو میرے خیال میں یہ موقع ہے کہ میں آج ایک اور شخصیت کا بھی ذکر کر دوں ، جس کو علم کی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل تھا ۔ اُن کا نام میاں افضل حسین مرحوم ہے ۔ جو آزادی سے پہلے دو مرتبہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے ۔ اُن دنوں جب انگریزوں کا راج تھا اور ہندوؤں کا اثر تھا ، اُس وقت اُنھوں نے اپنا ایک مقام قائم کیا اور مجھے خود بھی یاد ہے اور میں نے سنا بھی کہ وہ بہت دبدبے سے رہتے تھے ۔ میں نے اُن کے ساتھ بعد میں چند سال کام بھی کیا اور مجھے معلوم ہے کہ اُن کا رتبہ کیا تھا ۔ تو اس لئے میں عرض کروں گا کہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے لئے ادب یا فلسفہ کے میدان میں یونیورسٹی میں ایک کرسی (Chair) مقرر کرنی چاہیے اور دوسری میاں افضل حسین صاحب کے لئے سائنس کی کرسی (Chair) ہونی چاہیے تا کہ ہم ان بڑی شخصیات کی خدمات کو خراج تحسین پیش کر سکیں ۔

اسلامیہ کالج لاہور جو خاں صاحب کا پرانا کالج ہے (اور جہاں میں بھی پڑھا ہوں) ، میرے خیال میں وہاں کم از کم ایک حمید احمد خاں گولڈ میڈل برائے بہترین مقرر ضرور قائم ہونا چاہیے ، تا کہ کالج سے اُن کی وابستگی کی یاد کو زندہ رکھا جا سکے ۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور میں بہت سے ادبی ادارے ہیں ، خاص طور سے مجلسِ ترقیِ ادب ، جو مجھے اُمید ہے کہ اُن کے مقالات و مضامین اور کام کو شائع کرتے رہیں گے ۔

میں بیگم صاحبہ سے اور مرحوم پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے خاندان سے ، اپنی اور یہاں موجود تمام اصحاب کی طرف سے ، پوری ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں اور ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں ۔

———

پروفیسر حمید احمد خاں

بلند نصب العین کی اہمیّت

(کیمبرج سے پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ کے نام ایک خط)

یہ خط ۱۰ جنوری ۱۹۶۷ کے ''یونیورسٹی کرانیکل'' میں شائع ہوا۔

۶ دسمبر کا دن میرے لیے ہر سال ایک پرانے عہد کو از سرِ نو تازہ کرنے کا پیغام لاتا ہے۔ یہ دن میرے والدِ مرحوم و مغفور مولانا سراج الدین احمد خاں کی رحلت کا دن ہے۔ اُن کی وفات کے وقت میں اتنا کم سن تھا کہ میرے لیے اُن کی یاد ایک دھندلی سی تصویر کے مانند ہے، لیکن اُن کی ذات و صفات کا جو تصور لڑکپن کے دنوں سے مجھے دیا گیا وہ آج بھی میرے ذہن میں ایک روشن ستارے کی طرح چمکتا ہے۔ زندگی کے دورِ اول میں جب مجھے کسی مشکل کا سامنا ہوتا میں اُس کے حل کے لیے اپنے آپ سے ہمیشہ پوچھتا کہ والدِ مرحوم کو اگر یہ صورت درپیش ہوتی تو وہ کیا کرتے؟ اور اس سوال کا جواب ہمیشہ میرے لئے صحیح راہِ عمل معیّن کر دیتا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ دن میرے لیے کیوں تجدیدِ عہد کا دن ہے اور والدِ ماجد کے ذاتی کردار کے تصور سے وفاداری کا وعدہ میں خاص طور پر اس روز کیوں یاد کرتا ہوں۔

آج جب مجھے یہ پیمانِ وفا باندھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور میں دیارِ غیر میں وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوں، مجھے یکایک خیال آیا کہ میرے وہ عزیز طلبہ، جو پنجاب یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں، فضائلِ اخلاق کے کون سے نمونوں کو پیشِ نظر رکھے ہوئے آئندہ نصف صدی میں اپنی اپنی زندگی کا نقشہ تیار کر رہے ہیں؟ اور یہ سوچتے ہی میرا جی چاہا کہ ان ہزارہا نوجوانوں کو اپنے ذاتی احوال کی روشنی میں توجہ دلاؤں کہ کوئی نہ کوئی اچھا

نمونہ اپنے سامنے رکھنا ، اور بالخصوص اوائلِ عمر میں اپنے سامنے رکھنا ، ہمارے لیے زندگی کی تیاری کی اولیں شرط ہے ۔

انسان کا ضمیر ایک پُرسکوں آبجو سے کہیں زیادہ ایک متلاطم سمندر کی مثال ہے ۔ اگر آپ کبھی اپنے نفس کا محاسبہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ہمیں ہر وقت ، خیال یا عمل کی دنیا میں ، کوئی نہ کوئی نئی صورت درپیش ہے جو ہم سے مسلسل کسی نہ کسی نئے فیصلے کا مطالبہ کرتی ہے ۔ یوں دیکھیے تو اخلاقی ارادہ کسی اچھے نصب العین کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا نام ہے ۔ یہ اچھا نصب العین، جو بارہا ہماری ذاتی رسائی سے ماورا ہوتا ہے ، اگر کسی ایسی شخصیت کا جامہ پہن سکے جو ہمارے دلی احترام و محبت کی مستحق ہے ، تو اس کا اخلاقی حکم ایک نہ ٹلنے والا تقاضا بن کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوگا ۔ اس عمل کی کئی صورتیں ممکن ہیں، اکثر ہمارے والدین ، یا کوئی بڑا بھائی بہن ، کوئی شفیق اُستاد یا کوئی اور واجب التکریم بزرگ اس مثالی انداز میں ہماری اخلاقی قوت کا سرچشمہ بن جاتا ہے ۔ پختگیٔ عمر کو پہنچ کر اس قسم کے سہارے کی ضرورت کم ہو جاتی ہے ، لیکن وہ صرف اس لئے کہ نوعمری کے دنوں میں ہم نے کسی اعلیٰ درجے کے نمونۂ اخلاق کا سہارا لے کر نکوکاری کو اپنی عادت بنانے کی کوشش کی ۔ اُن نوجوانوں کے لیے جو نیکی کی زندگی بسر کرنے کی خواہش ، یا نیت ، رکھتے ہیں ، یہ لازم ہے کہ اپنے حلقے کے اندر محبت و عقیدت کا ایک ایسا مرکز تلاش کر لیں جس کی کشش قدم قدم پر انھیں راہِ راست کی طرف آنے کی دعوت دے ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری دنیا میں نیکی کبھی اس حد تک نایاب نہیں ہوئی کہ ہم کسی اچھے نمونے کی تلاش میں نظر دوڑائیں تو شمع ہدایت کی کوئی نہ کوئی کرن پاس ہی جھلکتی ہوئی نہ مل جائے ۔

خود میں نے جس نصب العین کی روشنی میں اپنی زندگی کے بُرے بھلے دن گزارے ، اس کا خاکہ آپ کو اشعارِ ذیل میں ملے گا جو والدِ مرحوم کی وفات پر لکھے ہوئے ایک مرثیے سے لیے گئے ہیں ۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ ضرور اُسی اخلاقی تصور کو اپنی زندگی کے لیے پسند کریں جو شاعر نے اس مرثیے میں پیش

کیا ہے - اچھے کردار کے کئی اور تصور بھی ممکن ہیں ، لیکن یہ بہرحال لازم ہے کہ آپ کا ضمیر کسی نہ کسی ایسے نصب العین سے وابستہ ہو جو آپ کی قوتِ فیصلہ کی رہنمائی کر سکے - والدِ مرحوم کے مرثیے میں سے میرے انتخاب کے چند ابتدائی شعر تمہید کی حیثیت سے ہیں ، اور کاشت کار طبقے کے لئے والد مرحوم کے اس کام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اُن کی زندگی کا آخری دور صرف ہوا :

وہ اپنے فن میں ملک کے اندر یگانہ تھا
یکتائے روزگار و وحیدِ زمانہ تھا
کی اُس نے آ کے غیب سے اُس قوم کی مدد
جس کا بجز خدا کے کوئی آسرا نہ تھا
اس قومِ بے زباں کی بنا آ کے وہ زباں
جس میں سے ایک شخص بھی نُطق آشنا نہ تھا

اور وہ شعر جو میرے عزیز طلبہ کی توجہ کے طالب اور اس پورے خط کا موضوعِ خاص ہیں ، یوں ہیں :

ہمت کے اعتبار سے تھا ہمسرِ فلک،
یوں دیکھنے میں گرچہ قد اُس کا میانہ تھا
تھی اُس کے لاگ میں بھی ادا اک لگاؤ کی
اُس کے سوا یہ رنگ کسی اور کا نہ تھا
اُس کی زباں ہمیشہ رہی ترجمانِ دل
اس واسطے کبھی وہ کسی سے دبا نہ تھا
ان صاف گوئیوں کی بدولت تمام عمر
جتنا کہ چاہیے تھا وہ اُتنا بڑھا نہ تھا
طبع غیور دی تھی خداوند نے اُسے
آگے کبھی کسی کے سر اُس کا جھکا نہ تھا
نیت میں راستی تھی، ارادے میں تھا خلوص
اُس کے کسی خیال میں مطلق ریا نہ تھا

رکھتا وہ دشمنوں کی طرف سے نہ تھا عناد
ملتا وہ دوستوں سے اگر مخلص،نہ تھا
وہ بے کسوں کے واسطے بنتا رہا سپر
اور سرکشوں کے حق میں وہ اک تازیانہ تھا
تھا مقدرت سے بسکہ وہ بڑھ کر کشادہ دل
کچھ جمع اپنے واسطے اُس نے کیا نہ تھا
وہ پاک نفس تھا غرض اپنی مثال آپ
ذکر اُس کا آج خلق میں یوں غائبانہ تھا
"شہبازِ ما پریدہ رہِ آسماں گرفت
مرغے نہ رفتہ است کہ دیگر تواں گرفت"

کیمبرج
۶ دسمبر ۱۹۶۶ء

* * *

سراج الدین احمد خاں (۱۸۵۰ء-۱۹۰۹ء)

پروفیسر حمید احمد خاں کے والد مولانا سراج الدین احمد خاں برِ عظیم کے مشہور اردو اخبار "زمیندار" کے بانی اور مدیر اول تھے۔ آپ ابتداً ڈیرہ اسماعیل خاں میں انگریزی اور فارسی کے مدرس ہوئے، گو بعد میں آن کی عمر ڈاک کے محکمے میں گزری۔ مولانا ایک تنظیمی دل و دماغ کے فرد تھے۔ آپ ریاست جموں اور کشمیر کے تار اور ڈاک کے محکمے کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے تو تار اور ڈاک کے فرسودہ ریاستی نظام کو انگریزی معیار پر پہنچایا، جس کو وائسرائے نے بھی اپنے ریاست کے دورے کے وقت تسلیم کیا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد مولانا سراج الدین احمد خاں نے برِ عظیم کے زراعت پیشہ طبقے کی مظلومی اور پسماندگی سے متاثر ہو کر یکم جون ۱۹۰۳ء کو لاہور کے ہفتہ وار اخبار "زمیندار" جاری کیا۔ مولانا سر سید کی تحریک کے زبردست حامیوں میں شامل تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کے علاوہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی منعقدہ ۱۸۹۲ء اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے سالانہ اجلاس میں جو کراچی میں ۲۹ دسمبر ۱۹۰۷ء کو منعقد ہوا شریک ہوئے۔ مولانا کے اصلاحی مضامین رسالہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ میں اور تعمیری قسم کی نظمیں رسالۂ "مخزن" لاہور میں چھپا کرتی تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں حکومتِ انگریزی نے پنجاب کے کاشت کاروں اور آبادکاروں کے مالکانہ حقوق پر پابندیاں عائد کرنے کے لئے ایکٹ نمبر ۳ نافذ کیا تو مولانا نے اخبار "زمیندار" کے ذریعے ایک پُر زور احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ جیرلڈ بیریر نے اپنی کتاب (The Punjab Disturbances of 1907) میں مولانا اور آن کے اخبار "زمیندار" کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اخبار میں زوردار مضامین لکھنے کے علاوہ پنجاب کے دیہات میں بڑے زبردست احتجاجی جلسے بھی کئے گئے۔ چنانچہ لفٹننٹ گورنر پنجاب کو بادل ناخواستہ ایکٹ نمبر ۳ منسوخ کرنا پڑا۔ مولانا کی وفات کے بعد آن کے فرزندِ اکبر مولانا ظفر علی خاں "زمیندار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

پروفیسر سجاد شیخ

پروفیسر حمید احمد خاں ـ حالات و افکار

پروفیسر حمید احمد خاں دنیائے علم و ادب کی ایک معروف ہستی تھے ـ وہ ایک ماہرِ تعلیم ، شہرہ آفاق استاد ، صاحبِ طرز ادیب ، بالغ نظر نقاد ، باشعور محقق ، صاحبِ ذوق مؤلف ، "تحریک استعمال اردو" کی صفِ اول کے قائد اور ایک عظیم محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے ـ

مختصر خاندانی حالات :

جناب حمید احمد خاں صاحب کا سارا خاندان تین پُشت سے علم و ادب اور درس و تدریس میں نامور ہے ـ آپ کے دادا مولانا کرم الٰہی خاں مشن سکول سیالکوٹ میں صدر مدرس تھے اور انہیں جو ملکہ اردو اور فارسی میں حاصل تھا اپنے بیٹے سراج الدین احمد خاں کو ودیعت کیا ـ سراج الدین احمد خاں اردو اور فارسی کے نغز گو شاعر تھے اور انھوں نے دس گیارہ سال کی عمر میں "مثنوی گلزار نسیم"* کا ترجمہ بہت سلیس اور رواں فارسی نظم میں کیا ـ

سراج الدین احمد خاں کی اولاد میں مولانا ظفر علی خاں ، چودھری غلام حیدر خاں ، محمد اکبر خاں ، محمود احمد خاں ، حامد علی خاں اور حمید احمد خاں کے علاوہ دو بیٹیاں تھیں ـ میدان ادب و صحافت میں مولانا ظفر علی خاں اور حامدعلی خاں کسی تعارف کے محتاج نہیں ـ محمد اکبر خاں علی گڑھ کالج کے گریجوئیٹ اور ادیب، شاعر اور مترجم تھے ـ افسوس کہ اس ذہین نوجوان کا انتقال ۲۶ سال کی عمر میں ہو گیا ـ غلام حیدر خاں بھی مدتوں کلکتے سے روزنامہ "ترجمان" اور روزنامہ "صداقت" نکالتے رہے ـ آپ نے اردو کے ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے بھی کافی نام

*کاش وہ دستیاب ہو کر شائع ہو سکے ـ (ادارہ)

مولانا سراج الدین احمد خاں

(۲۱ جنوری ۱۸۵۰ء - ۶ دسمبر ۱۹۰۹)

حمید احمد خاں کے بچپن کی ایک تصویر
دائیں طرف ان کے بڑے بھائی حامد علی خاں ہیں

نے مدتوں "زمیندار" کو بڑی کامیابی سے جاری رکھا اور یہ صحافتِ ہند کا رہنما بن گیا ۔

حمید احمد خاں نومبر ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے لیکن ابھی چھ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ اس مرگ ناگہانی سے ایک خوشحال اور مسرور خاندان پر یکایک مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ۔

والدہ :

بیوگی اور ناداری کے اس دور میں خاں صاحب کی والدہ نے بے پناہ ہمت اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیا ۔ وہ بڑے عزم و استقامت سے اپنے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہیں۔ اور جس طرح بن پڑا اپنے بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت کا بندوبست کرنے میں لگی رہیں ۔

حمید احمد خاں لکھتے ہیں : " اس وقت والدہ ماجدہ کمال مردانگی سے کام لے کر باپ بھی بنیں اور ماں بھی ۔ انہیں اپنے گزشتہ عروج و اقبال کے بعد بدرجہ مجبوری ایک دم بے مائیگی و تہی دستی کی منزل میں داخل ہونا پڑا تھا ۔ مگر اس سے ان کے ماتھے پر بل نہیں آیا - - - بیوگی کے پہلے دن سے انہوں نے اپنے لئے درویشانہ زندگی پسند کر لی ۔ تہجد اور قیام اللیل ان کا معمول بن گیا۔ دنیوی نعمتوں کی کشش ان کے لئے یک بہ یک ختم ہوگئی ۔ بایں ہمہ ہمارے لئے وہ ایسے ایسے آرام مہیا کرنے کی (کبھی کامیاب اور کبھی ناکام) کوشش کرتی تھیں گویا ہماری پیشانی یتیمی کی گرد سے کبھی داغدار نہیں ہوئی - - - ہماری اخلاق تربیت اور دنیوی تعلیم کے لئے وہ سب سے زیادہ مضطرب تھیں ۔"

(" زندگی اور موت کے دوراہے پر ")

حمید احمد خاں ۔ کردار و افکار کا مختصر جائزہ :

خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ انسان کی زندگی پر اس کے گھریلو ماحول اور ابتدائی تعلیم و تربیت کا اچھا یا برا دائمی نقش ثبت ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود

پیدا کیا ۔ مولانا سراج الدین احمد خاں کی دونوں بیٹیاں بھی شاعر اور ادیب تھیں ۔ بڑی بیٹی حمیدہ بیگم نغز گو شاعرہ تھیں جن کا کلام برسوں اردو رسائل میں چھپتا رہا ۔ انہی کے بڑے بیٹے راجہ مہدی علی خاں تھے ۔ جو اپنی افسانہ نگاری ، بذلہ سنجی اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند کی جانی پہچانی ادبی شخصیت تھے ۔ محمود احمد خاں پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں طویل مدت تک کیمسٹری کے پروفیسر اور بعد میں چند سال اسی یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو کر ریٹائر ہوئے۔ بقول حمید احمد خاں " ان کی ذات والد مرحوم کی اولوالعزمی، حق گوئی اور والدہ مرحومہ کی ہمدردی و پاکیزگیٔ نفس کی روشن تصویر ہے ۔"

(" زندگی اور موت کے دوراہے پر" "ہمایوں" جون ۱۹۳۹ء)

والد :

سراج الدین احمد خاں اپنے زمانے کے ان معدودے چند مسلمانوں میں سے تھے جنہیں انگریزی زبان میں بھی کافی دسترس حاصل تھی ۔ چنانچہ کچھ عرصے تک پونچھ کے راجہ موتی سنگھ کے اتالیق بھی رہے ۔ اس کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور ڈاک خانوں کے انسپکٹر رہے ۔ پھر کئی برس تک ریاست جموں و کشمیر کے محکمۂ ڈاک و تار کے افسر اعلیٰ یعنی پوسٹ ماسٹر جنرل رہے اور کشمیری مسلمانوں کے حقوق کی خاطر جد و جہد کرتے رہے ۔ آپ کی کوششوں سے مسلمانوں کے لئے ریاستی ملازمتوں کی راہ ہموار ہو گئی اور جبری بے گار کا بھی بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا ۔ شورش کاشمیری نے مولانا ظفر علی خاں کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ

"کشمیر ہندوستان میں واحد خطہ تھا جہاں ان دنوں ریاست بھر میں اردو تار بھیجے جاتے تھے ۔"

۱۹۰۳ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سراج الدین احمد خاں نے اخبار "زمیندار" جاری کیا، جو تھوڑے ہی عرصے میں اپنی بے باک صداقت کی بنا پر برصغیر پاک و ہند کا ایک کثیر الاشاعت روز نامہ بن گیا اور تحریک آزادیٔ ہند میں نمایاں کردار ادا کرنے لگا۔ ۱۹۰۹ء میں والد کے انتقال کے بعد مولانا ظفر علی خاں

حمید احمد خاں کی لوحِ زندگی پر سب سے زیادہ گہرا اور پائدار نقش آپ کی والدہ کی تربیت کا تھا ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خاکساری کے ساتھ خود داری، وسیع المشربی اپنے نصب العین کی خاطر کٹ مرنے کی تڑپ ، فیاضی اور پا کیزگیٔ نفس اور اولوالعزمی ایسی خاصیتیں آپ کو والدہ سے ہی ترکے میں ملی تھیں ۔

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جناب حمید احمد خاں تحصیل علوم مغربی کے باوجود مشرقی اوصافِ حمیدہ کا ایک قابلِ تقلید نمونہ تھے ۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے ۔ ان کا سینہ نور ایمان اور عشق رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین تھا ۔ ان کی پہلی قابلِ ذکر تحریر " اسوۂ حسنہ " تھی جو ۱۹۲۶ء میں قسط وار رسالہ ہمایوں میں شائع ہوئی اور ان کی زندگی کی آخری تحریر بھی اسی موضوع سے متعلق تھی ۔

"اُسوۂ حسنہ" کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

" عشقِ رسولؐ آج بھی میری گراں بہا تریں متاعِ حیات ہے - - - - رسول اللہؐ کی ذات اقدس کے متعلق محبت و شیفتگی کا جو اظہار ان صفحات میں ہوا ہے وہ آج کے دن بھی اپنے اولین ولولے کے ساتھ تازہ ہے ۔"

جناب حمید احمد خاں کے لئے دین قیّم محض چند عبارتوں کے رسمی طور پر سرانجام دینے کا نام نہیں تھا بلکہ یہ انفرادی طور پر صالح زندگی گزارنے کے ایک قرینے اور اجتماعی طور پر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر حکومت الٰہیہ کے قیام کا ایک وسیلہ ہے ۔ اسلام کے نام سے بدکنے والے اگر انہیں رجعت پسند کہتے ہیں تو کہا کریں، واقعہ یہ ہے کہ خاں صاحب انتہائی روشن خیال، روشن دماغ ، منصف مزاج محبِ وطن پاکستانی تھے ۔ ان کے لئے اسلام ایک جامد نظریے کا نام نہیں تھا بلکہ اقبال کی طرح وہ اسے ایک عالمگیر انقلابی مذہب سمجھتے تھے جو رنگ و نسل کے بتوں کو توڑ کر اولادِ آدم کو ایک لڑی میں پرونا چاہتا ہے ۔

"ہمارے ہادی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیک وقت حقوقِ خداوندی کے احترام کی تعلیم بھی فرمائی اور حقوق انسانی کے احترام کی بھی۔ اس تعلیم کا حاصل دین اسلام ہے۔ اسلام کو انسان کے مادی و روحانی اور انفرادی و اجتماعی نظام حیات دونوں سے یکساں تعلق ہے۔"

(آخری ریڈیو تقریر : "رسالت مآب کے عہد میں حقوق انسانی"
از روزنامہ "جنگ" عید میلاد النبی نمبر ۱۹۷۴ء)

"اسلام کے بنیادی تصورات میں بڑا اہم تصور عالمی اخوت کا تصور ہے۔ یا انسانی مساوات کا تصور ہے یا ایک خاص نوعیت کی معاشرتی تنظیم کا تصور ہے۔ جتنی قوتیں اس معاشرتی تنظیم کے خلاف ہیں یہی قوتیں انسانی مساوات کو پسند نہیں کرتیں۔ خواہ ان کا نام سرمایہ داری رکھئیے یا سود خواری یا جاگیرداری ـــــ یہ تمام قوتیں اسلامی نظریہ کی تبلیغ میں مزاحم ہو رہی ہیں۔"

(رسالہ "چراغِ راہ" نظریہ پاکستان نمبر صفحہ ۴۲۴
جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۱۲ دسمبر ۱۹۶۰ء)

خاں صاحب کے خیال میں قیام پاکستان کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان آزادی کی فضا میں اپنے عقائد و نظریات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اقتصادی پسماندگی سے نجات پا کر ایک خوشحال معاشرے کی تشکیل کی جا سکے۔

وہ چاہتے تھے کہ اس نئی آزاد مملکت کی جڑیں عظیم مشرقی روایات میں پیوست تو ہوں لیکن پاکستانی عوام علوم مغرب سے بھی خاطر خواہ استفادہ کریں تاکہ ترقی کی منازل طے کر کے اقوام عالم کے ہراول دستے میں شامل ہو جائیں اور عالمی سطح پر ایک مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

ایک دفعہ "ینگ رائٹرز" کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :
"جو قومیں اپنے ماضی سے رشتہ منقطع کر لیں غرق ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے ہی چمٹے رہیں۔ حسب ضرورت مغربی فنون سے استفادہ

کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔"

اسی طرح اسلامیہ کالج کے ایک جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر فرمایا :
"ہمیں نئے تجربوں سے کوئی بیر نہیں ۔ لیکن نئے تجربوں کے لئے ہم اپنے مرکز سے ہٹنا نہیں چاہتے ۔"

(سالانہ روداد ۶۲ - ۱۹۶۱ء)

خاں صاحب چاہتے تھے کہ پاکستانی قوم کی "تخلیقی قوتیں جنہیں اندھی تقلید نے شل کر دیا ہے از سرِ نو بیدار ہوں اور زندگی کی تعمیر میں وہ اہم حصہ لیں جس کے بغیر ہمارا مستقبل تاریک ہے ۔"

(سالانہ روداد ۶۲-۱۹۶۱ ء)

خاں صاحب کی زبردست تمنا تھی کہ پاکستان ایک آزاد اسلامی فلاحی مملکت بن جائے ۔ اسی لئے وہ ماضی میں پسماندہ طبقوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی معاشرتی نا انصافیوں اور سامراجی نظام کی غلط کاریوں کی روایات کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے ۔

ان کا خیال تھا کہ " خود مغلیہ حکومت جو ہماری سابقہ حکومت سمجھی جاتی ہے غیر اسلامی بنیادوں پر قائم تھی ۔ اس کی اساس جاگیرداری نظام اور سلطانی نظام تھا جو اسلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا ۔"

(رسالہ "چراغِ راہ" صفحہ ۴۲۴)

خاں صاحب دل سے چاہتے تھے کہ مغلوں اور انگریزوں کی چھوڑی ہوئی غلط روایات کو اپنے معاشرے سے نکال پھینکیں ۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ اس میں مشکلات بھی ہیں اور زحمتیں بھی ۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لئے یہ کٹھن کام کرنا لازمی ہے ۔

" جس طرح بدن کا آپریشن ہوتا ہے اور جسم کے کسی غیر صالح حصے

کو کاٹنا پڑتا ہے - اسی طرح ہمیں ان غلط روایات کو بھی ختم کرنا ہوگا -"

(رسالہ "چراغِ راہ" صفحہ ۴۲۴)

قیام پاکستان کے فوراً بعد ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے جب خاں صاحب نے سامراجی نظام کے پروردہ تعلیمی نظام کا جائزہ لیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے پاکستان کے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے - پرائمری سکول سے لے کر یونیورسٹی کی منزل تک سارا نصابِ تعلیم تبدیل کرنا لازمی تھا تا کہ نئے نصاب کو پاکستان کی قومی ضرورتوں کے عین مطابق ڈھالا جائے اور ہمارا ملک ایک دفعہ پھر عالم اسلام کی درخشندہ روایات کا اعادہ کرکے دنیا کی امامت کا فریضہ ادا کر سکے -

اس مقصد کے حصول کے لئے خاں صاحب سکول کی سطح پر ہی بعض نئے مضامین کو شامل نصاب کرنے کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے ہیں - "مجوزہ نئے مضامین میں عام معلومات کا شامل کرنا ضروری ہے - اس کتاب کی مختلف فصلوں میں حفظان صحت کے بنیادی اصول ، آزاد قوم کے افراد کی ذمہ داریاں ، سائنس کی موٹی موٹی باتیں ، جمہوریت کی بنیادیں ، پاکستان کی قومی روایات اور اس قسم کی دوسری باتیں سلیس انداز میں بیان ہونی چاہئیں -"

("ہمارے مدرسے" : مقالہ)

خاں صاحب کے نظریہٗ تعلیم کی ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ تعلیم کو ایک بلند نصب العین کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے - چنانچہ وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ بچپن سے ہی طالب‌علموں کو اعلیٰ اخلاق قدروں سے روشناس کرایا جائے - ان کے دلوں میں حب‌الوطنی کے جذبات کو بیدار کیا جائے اور ان کے قومی تشخص کو اُبھارا جائے تاکہ وہ ایک متحد اور منضبط قوم کے افراد بن سکیں -

" اب تک جماعتی احساس ہم میں مفقود رہا ہے - غلام کو اپنے نفس سے

غرض ہوتی ہے جماعت سے سروکار نہیں ہوتا ۔ مدرسے کی تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جُل کر کام کرنے کا گُر آ جائے اور جماعت کے لئے کام کرنے میں ہمیں خوشی حاصل ہو ۔"

("ہمارے مدرسے")

خاں صاحب جانتے تھے کہ نئے مضامین کے اجراء کے ساتھ ساتھ بعض پرانے مضامین کو بھی زندہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دور غلامی میں ان کا گلا اس بری طرح سے دبایا گیا ہے کہ وہ بے جان ہو کر رہ گئے تھے یا پھر مخصوص سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی غرض سے ان کی صورت کو یکسر بدل دیا گیا تھا ۔ سامراجی آقاؤں نے تاریخ اسلام کی ایک انتہائی مسخ شدہ تصویر نصابی کتب میں پیش کی تھی ۔ اس ضمن میں خاں صاحب لکھتے ہیں :

"ہماری تاریخ صرف فوجوں کی مار دھاڑ اور تخت پر بادشاہوں کی اچھل کود کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں اسلامی تہذیب کے چند بنیادی اصولوں مثلاً رواداری ، عالم گیر انصاف ، اور انسانی مساوات کا مسلسل انکشاف ہوا ہے لیکن طالب علم کے دماغ کی رسائی اس انکشاف تک نہیں ہوتی ۔ اب وقت ہے کہ بچوں کے لئے تاریخ صحیح طور پر لکھی جائے اور صحیح طور پر پڑھائی جائے ۔"

("ہمارے مدرسے")

یہی حال جغرافیے کی تعلیم کا ہے ۔ جس طریقے پر ہمارے بچے جغرافیہ پڑھتے ہیں اس سے ہماری قومی وحدت کے احساس کو کوئی تقویت نہیں ملتی ۔ نہ ہی ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا ملک اپنے قدرتی نظاروں ، اپنی آب و ہوا ، اپنے دریاؤں اور پہاڑوں اور شہروں کے لحاظ سے ایک ایسا ملک ہے جس پر ہم فی الحقیقت فخر کر سکتے ہیں ۔"

("ہمارے مدرسے")

بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا صلاح الدین احمد کی طرح جناب حمید احمد خاں بھی اردو کے سچے خادم تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے نصاب تعلیم

میں قومی زبان اردو کو بھی اس کا جائز مقام ملے ۔ اردو کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے والے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ اور قومی زبان کے خلاف مختلف تعصبات پھیلانے کی مذموم کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ خاں صاحب اردو زبان کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور عمر بھر اس کی جائز حیثیت منوانے کی جد و جہد میں مصروف رہے ۔

ان کی زبردست خواہش تھی کہ پاکستان میں نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اردو کو وہ مقام دیا جائے جو کسی بھی آزاد ملک میں وہاں کی قومی زبان کو حاصل ہوتا ہے ۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے احساسات اور جذبات کا کسی حد تک اندزہ لگایا جا سکتا ہے ۔

" جب تک اردو بول کر اور اردو لکھ کر (ہمارے دل میں) فخر کا احساس پیدا نہ ہوگا اس وقت تک ذہنی غلامی کے داغ پوری طرح سے نہیں دُھل سکیں گے۔"

("ہمارے مدرسے")

ہر چند کہ دورِ غلامی میں محکوم انسان کو حاکم قوم کی ہر چیز اچھی اور اپنی ہر چیز بری اور گھٹیا معلوم ہوتی ہے مگر اس فساد کی جڑ یہ بات ہے کہ اپنی قومی زبان کو غیر زبان کے مقابلے میں حقیر سمجھا جائے ۔ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ اپنی قومی زبان کی محبت اور عزت کے جذبات کو فروغ دیں تا کہ پاکستان کی سالمیت اور قومی وحدت کو مزید مستحکم کیا جا سکے ۔

جناب حمید احمد خاں کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے افکار پر سنجیدگی سے غور کریں اور ان کے پیغامات پر عمل پیرا ہو کر مادرِ وطن کی بے لوث خدمت کریں کہ چار دانگ عالم میں پاکستان کا نام روشن ہو ۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

قومی زبان اور پروفیسر حمید احمد خاں*

جناب صدر محترم، خواتین و حضرات !

پروفیسر حمید احمد خاں جنہیں مرحوم کہتے ہوئے ایک دھکا سا لگتا ہے، اُن سے میرے کئی روحانی اور ذہنی رشتے تھے۔

ظفر علی خاں کے بھائی، غالب شناس، اردو کے پر جوش مجاہد، یہ حیثیتیں سب کو معلوم ہیں اور کئی اور ایسی ہیں جنہیں محض ذاتی اور شخصی کہا جا سکتا ہے۔ اُن سب عناصر کی ترکیب سے پرخلوص دوستی اور محبت آمیز نیازمندی پیدا ہوئی جس کی یادیں ایک نہیں صدہا ہیں۔ قلم کی کوتاہی جو وقت کی تنگ دامنی سے رشتہ بند ہے مانع ہے۔

لہذا اس موقع پر چند باتیں مرحوم کے عشق اُردو کے ضمن میں اور ایک آدھ بات اُن کے خلوص اور جذبۂ اُستواری و وفاداری کے بارے میں کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

حمید احمد خاں صاحب سے میری شناسائی تو خاصی پرانی تھی مگر بالکل قریب سے اُنہیں اُس زمانے میں دیکھا جب وہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں پرنسپل ہو کر آئے۔

اُس زمانے میں میرے کچھ احباب اُس کالج میں اُستاد تھے۔ میں اُن کی زبانی خاں صاحب کی ضابطہ پسندی اور اُن کی ذاتی شرافت کے تذکرے سنتا رہتا تھا۔ پھر ۱۹۵۸ء کا سال آ گیا اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا مارشل لاء لگا۔ غالباً دسمبر کا مہینہ تھا کہ خاں صاحب نے اسلامیہ کالج میں شہر کے اربابِ علم و ادب

---

* یہ مضمون پروفیسر حمید احمد خاں کی یاد میں، حبیبہ ہال، اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں منعقدہ ایک جلسے میں پڑھا گیا اور ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے لکھ کر یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

کو جمع کیا ۔ میں خود اس محفل میں نہ جا سکا کیونکہ میں ترقیٔ اردو بورڈ کراچی کے ایک اجلاس میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا۔

اس مجلس میں خاں صاحب نے اہلِ علم و ادب کو اردو کے مسئلے کی طرف توجہ دلائی اور ایک کانفرنس کی تجویز پیش کی اور مجھے غائبانہ اس کی مجلسِ استقبالیہ کا سیکریٹری مقرر کر دیا گیا جس کا علم مجھے اخبارات کے ذریعے ہوا ۔

ذاتی طور پر میں اس کانفرنس کے بارے میں متفکر تھا ۔ یہ تشویش بوجہ مایوسی تھی ۔ میں سوچتا تھا، قیام پاکستان کے بعد دس بارہ برس کے عرصے میں بجز بہانہائے بسیار اردو کے لئے کچھ نہ ہوا ۔طرح طرح کی نئی دلیلیں نکل آئیں اور حجابات اس قدر بڑھ گئے کہ ایسے بدیہی مسئلے کے لئے بھی حجت و برہان ، جلسے اور کانفرنس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ۔

اس سے قبل یونیورسٹی اردو کانفرنس ، پاکستان اورینٹل کانفرنس ، طلباء قدیم اورینٹل کالج کی ایک نہیں دو تین کانفرنسیں دھوم دھام اور جوش و خروش سے برپا ہو چکیں ۔ لیکن اربابِ حکومت کو کوئی بھی متفق نہیں کر سکا تھا ، تو میں نے سوچا کہ فوجیوں کی حکومت میں جو اردو کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتے اور اگر لگاتے بھی ہیں تو انگریزی لاطینی حرفوں میں ، بھلا اس قسم کی خواہش یا آرزو اس زمانے میں کیونکر پوری ہو سکتی ہے ۔

میں ان تشکیکی خیالات کو سینے میں دبا کر صبح صبح اورئینٹل کالج پہنچا اور ارادہ تھا کہ خاں صاحب سے ملاقات کے لئے اسلامیہ کالج جاؤں اور اسرار کروں کہ وہ کانفرنس کے ارادے سے باز آئیں مگر میں دیکھتا کیا ہوں کہ خاں صاحب بہ نفسِ نفیس اورینٹل کالج میں تشریف فرما ہیں۔ میں نے خاں صاحب پر اپنے شکوک ظاہر کئے اور کچھ ذاتی عذرات بھی پیش کئے لیکن خاں صاحب نے اپنا نقطۂ نظر اس قدر مدلل انداز میں واضح کیا کہ میرے شکوک کی منطقی و عقلی بنیادیں سب منہدم ہو گئیں تاہم جس چیز کی وجہ سے مجھے ہتھیار پھینکنا پڑے وہ ان کا جذبۂ صادق

اور یقین محکم تھا ۔ اُنھوں نے فرمایا " میرا جذبہ کہہ رہا ہے کہ اگر اس وقت اُردو کے لئے کچھ مطالبے کئے جائیں تو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوگی ۔" دلیل یہ دی جو بڑی وزنی تھی کہ یہ حکومت ایک آدمی کی حکومت ہے ۔ اگر ہم اپنے صحیح طریق کار سے ایک آدمی کو قائل کر لیں تو کامیابی ممکن ہے ۔ بجائے اس کے کہ ہم جمہوریت کی کثرت کا انتظار کریں جس کے معنی لاکھوں آدمیوں کے دل اور دماغ بدلنے کے ہیں ۔ یہ کام دشوار ہے ۔ تب میں وحدت و کثرت کی رمز سے آشنا ہوا اور اس معرفت میں خاں صاحب کی منطق سے زیادہ ایمان کی اُس آواز نے حصہ لیا جو اُن کے ہر ہر لفظ میں تیقن بن کر گونج رہی تھی ۔

اس کے بعد میں نے اپنی عادت کے مطابق اپنے جسم و جان کی پوری قوت و صلاحیت اس کانفرنس میں صرف کر دی اور مخدوم و محترم جسٹس رحمان کی صدارت میں قائم شدہ مجلسِ انتظامیہ کی رہنمائی میں جس میں خاں صاحب کی رائے روشن ہر وقت شامل رہتی تھی یہ کانفرنس ہوئی اور کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کامیابی خاں صاحب مرحوم کے جذبۂ ایمانی کی وجہ سے تھی ۔ وہ اس طرح کہ ایک فوجی سچ مچ قائل ہوا ۔ اس کے قائم کردہ شریف کمیشن کے توسط سے اُردو بارھویں جماعت تک لازمی قرار پائی اور ذریعۂ تعلیم کے لئے از ابتدا تا انتہا اُردو کا راستہ کھل گیا ۔ یہ فی الحقیقت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اُس کے بعد اُردو اب تک اُسی مقام پر ہے جہاں تھی ۔

جذبے کی ایک تجلی سے اُردو کو جو مقام حاصل ہوا اُس سے برتر مدارج تک اُسے پہنچانے کے لئے قدرت، خاں صاحب کو پنجاب یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے لے آئی ۔ اب شب و روز فروغِ اُردو کی تجویزیں ہونے لگیں ۔ تعمیری تدبیریں ہونے لگیں ۔ یونیورسٹی میں پہلے ہی برس بی ۔ اے۔ ، بی ۔ ایس سی۔ تک اُردو کو متبادل ذریعۂ تعلیم و امتحان بنا دیا گیا ۔ پھر دو سال کے بعد ایم ۔ اے۔، ایم ۔ ایس سی۔ کے لئے بھی یہ راستہ کھول دیا گیا ۔ جو کام دس بارہ برس میں نہ ہو سکا تھا ، وہ خاں صاحب مرحوم کی قوتِ ایمانی سے دو ہی سال میں ہوگیا ۔ مولانا

ظفر علی خاں کا ایک شعر ہے :

جو کام ہو نہ سکا ولیم اور ولسن سے
محمدؐ عربی کے غلام کر لیں گے

اُس زمانے میں میں نے بارہا دیکھا کہ ایک وائس چانسلر پہروں بیٹھ کر اُردو کا رزولیوشن ایکڈیمک کونسل اور سنڈیکیٹ کے لئے خود ہی ڈرافٹ کر رہا ہے اور لفظ و معنی کے دقائق و حقائق زیرِ بحث آ رہے ہیں، تاکہ ہر نکتہ موزوں ترین الفاظ میں ادا ہو جائے اور اُردو کی قرارداد لفظی اسقام کی وجہ سے گر نہ جائے۔ خاں صاحب جب تک یونیورسٹی میں رہے اُردو ذریعہ تعلیم کی مہم کو عملی طور پر سر کرنے میں منہمک رہے۔ ایک ادارۂ تالیف و ترجمہ جو جسٹس شریف صاحب کے زمانے میں خاں صاحب کے ایما پر قائم ہوا تھا ، انھیں کی نظامت میں چلتا رہا۔ سائنس کے موضوعات پر اُردو میں لیکچر کرائے گئے۔ اساتذۂ سائنس کے مذاکرے ہوئے۔ غرض بہت کچھ ہوتا رہا جس میں ہمارے رہنما خاں صاحب تھے۔ ہم سب اُن کے مشیر اور کارکن تھے۔

یونیورسٹی میں اُردو کے متعلق خاں صاحب کی خدمات کی فہرست طویل ہے اور تنگیٔ وقت مانع ہے۔

خاں صاحب جب اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے ، اُس زمانے میں میاں بشیر احمد صاحب کے مکان پر یہ فیصلہ ہوا کہ لاہور میں اُردو سائن بورڈ کی تحریک چلائی جائے۔ اس میں خاں صاحب نے پُر جوش حصہ لیا۔ اُن کے علاوہ اس میں میاں بشیر احمد ، مولانا حامد علی خاں، ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدین، ڈاکٹر رفیق احمد ، چودھری نذیر احمد خاں ، بیگم کاکاخیل ، بیگم آباد احمد ، بیگم سید عبداللہ اور بہت سے اور اصحاب نے حصہ لیا۔ اس مہم میں ہم نے دیکھا کہ اسلامیہ کالج لاہور کا منتظم پرنسپل ، اُردو اور انگریزی کا نامور ادیب ، کیمبرج کا فارغ التحصیل عالم ، بلا تکلف ہر عام و خاص کے پاس جا رہا ہے۔ یعنی پلومر اور فضل دین اینڈ سنز سے لے کر عام درزی رنگریز اور حجام تک کو اُردو کی اہمیت سے آگاہ کر رہا

ہے اور بعض اوقات مؤخر الذکر حضرات کے زجر و عتاب کا نشانہ بھی بنتا ہے اور لطف یہ ہے کہ لبانِ غیر لعلیں کے جوابِ تلخ کو قندِ مکرر بنانے کے لئے یہی پرنسپل مال روڈ پر چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور ان بے دردوں کے سنگِ آستاں سے بے سہابہ لپٹتا ہے۔

یہ سب کچھ جذبۂ بے کراں اور شوقِ فراواں کا کرشمہ تھا جو زمانے کی بے مہریوں اور حکومتوں کی بے نیازیوں سے بھی ماند نہیں پڑتا تھا۔ اُردو کا مسئلہ ہوتا تو خاں صاحب اپنی صحت کو بھول جاتے۔ سب مصروفیتوں سے صرفِ نظر کر کے اُردو کے لئے وقت نکالتے۔

ہفتۂ اُردو کا اہتمام، اخبارات کے اعتراضات کے جواب، حکومت تک پہنچانے کے لئے عرضداشتین، یادداشتیں، اُردو کے بلوں اور سرکاری تجویزوں کے لئے پوری پوری تنظیم بلکہ اسمبلی کے ممبران کے لئے تقاریر کی تسوید و تدوین اور کچھ یوں لگتا کہ حمید احمد خاں کا وجود خالقِ کائنات نے اسی خدمت کے لئے بنایا ہے۔

خاں صاحب کے فضائل کہ جنھیں اوصافِ حمیدہ کہنا بیانِ حال کا درجہ رکھتا ہے، بے شمار ہیں۔ ذاتی و صفاتی کہانیاں بھی بہت ہیں۔ اُن کے رنگِ مزاج اور آہنگ طبیعت پر بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میرا یہ شوق عناں گسیختہ کہ جسے دریا کہا جا سکتا ہے، اس مجلس میں کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا۔

یہ تعزیتی تقریب جس کا مرکزی موضوع نقطۂ غم ہے، طالبِ اختصار و ایجاز ہے۔ تاہم چلتے چلتے یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پنجاب یونیورسٹی میں خاں صاحب نے جو علمی مجالس قائم کیں، اُن میں تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند اور ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔ ان مجالس کے علاوہ اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ہے جو قائم تو پہلے سے تھا لیکن اگر ۱۹۶۶ء میں خاں صاحب اُسے سنبھالا نہ دیتے تو یہ آج اپنی پندرھویں اور سولھویں جلد تک پہنچ نہ سکتا۔

اور یہ کارنامہ بھی بہرحال قابلِ ذکر ہے کہ عام بے اعتنائی کی فضا میں غالب کی صد سالہ تقریب کا اہتمام بھی صرف اس لئے ہو سکا کہ حمید احمد خاں نے اُسے جذبے کا مسئلہ بنا لیا جس کے سہارے سخت مالی دشواریوں کے باوجود اُس یادگار کے انعقاد سے پاکستان بہر حال سرخرو اور نیک نام ہوا۔ میں نے جن بڑے بڑے منصوبوں اور بڑی بڑی مہمات کا اشارتاً ذکر کیا ہے اُن میں سے ہر ایک کے لئے

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

اب کسی مخلص دوست یا سعادت مند شاگرد کو وقت مل سکے، تو علم و ادب کے اس پروانے کی جسے دوسرے لحاظ سے کرمکِ شب تاب آردو بھی کہا جا سکتا ہے، سرگذشت لکھ ڈالے کہ نام نیک رفتگاں کو زندہ رکھنا روشن ضمیر اقوام کا خاصہ ہے۔

اب میں اس یاد نامے کو دعا پر ختم کرتا ہوں اور اپنے لئے بھی سب کی دعاؤں کا اور نیک تمناؤں کا طلب گار ہوں۔

پروفیسر اختر اقبال کمالی

پروفیسر حمید احمد خاں کی شخصیت

گزرنے والوں کی عظمت کا اعتراف کرنا ہو تو عموماً رسمی انداز میں کہا جاتا ہے کہ "مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے"۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے بارے میں بھی یہی کچھ کہا گیا ہے اور کہا جائے گا۔ مجھے اس کی صداقت سے انکار بھی نہیں، لیکن اس طرح کے خراجِ عقیدت کا مستحق میں ایسے لوگوں کو قرار نہیں دیتا جن کی شخصیت ان کے عظیم اور وقیع کارناموں کے بار سے اس طرح دب گئی ہو کہ فرد کو اس کے کارناموں سے الگ دیکھنا ممکن نہ ہو۔ میں سطور ذیل میں جس شخص کی یاد تازہ کرنے بیٹھا ہوں اس کی یہ خصوصیت مجھے بے حد عزیز تھی کہ بے شمار انجمنوں اور اداروں کی روح رواں ہونے کے باوجود اس کی منفرد شخصیت کبھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پاتی تھی اور ان کاموں میں بھی جو اس کے ہاتھ سے تکمیل پاتے تھے اس شخصیت کی چھاپ نمایاں نظر آتی تھی۔

ان سطور کا مقصد نہ ان کی زندگی اور سوانح کا خاکہ پیش کرنا ہے نہ ان کے کارناموں پر تبصرہ اور محاکمہ کرنا۔ یہ کام دوسرے لکھنے والے مجھ سے بہتر طریق پر سرانجام دے سکیں گے۔ میرا مقصد ان کے اور اپنے ذاتی روابط کی داستان قلمبند کرنا بھی نہیں۔ ذاتی روابط کا یہ زمانہ خاصا طویل ہے۔ میں نے کم و بیش چودہ سال ان کی رفاقت میں گزارے ہیں اور رفاقت کا زمانہ ختم ہونے پر بھی تجدید روابط کے مواقع میسر آتے رہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ زمانہ میرے اس دور زندگی کی جو پاکستان میں گزرا گراں مایہ ترین متاع ہے۔ اس زمانے میں ان کی طبیعت اور مزاج کے بے شمار پہلو میرے مشاہدے میں آئے۔ ان کے اندازِ فکر اور طریق کار کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی معیت اور راہنمائی میں کام کرنے کا

تجربہ ہوا ۔ ان تمام چیزوں کی بدولت ان کی شخصیت کا جو تاثر میرے ذہن پر مرتسم ہوا اُس کے بارے میں چند اشارات پیش کرنا میرے اس مختصر مضمون کا اصل مقصد ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک مختصر مضمون میں ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرنا ممکن نہیں ۔ میرے لئے اتنا کافی ہے کہ میں اس شخصیت کو جس سے مجھے ذاتی عقیدت رہی ہے اس انداز سے پیش کر دوں کہ وہ عناصر جو اس کی تشکیل میں بروئے کار آئے نمایاں ہو جائیں ۔ یہ وہ ادنیٰ خراج عقیدت ہے جو میں اس وقت انہیں پیش کر سکتا ہوں ۔ ان کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات میں میری نیاز مندی اور عقیدت ، اور ان کی نوازش و عنایت ایک ایسے نقطہ توازن پر پہنچ گئی تھی جسے وہ ازراہِ محبت دوستی کا نام دیتے تھے ۔ مجھے بھی کوئی دوسرا لفظ اس غیر مساوی رابطے پر منطبق ہوتا نظر نہیں آتا ۔ یہ داستان جو میرے حافظے پر نقش ہے طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی، لیکن یہاں اس کو چھیڑنا بے محل ہوگا۔ شاید اصل موضوع پر لکھنے کی توفیق بھی کبھی میسر آ جائے ۔

میری نظر میں پروفیسر حمید احمد خاں کی وہ خصوصیت جس کا ان کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حصہ تھا ، یہ تھی کہ ان کی ذات اس "ذہنی سالمیت" (Integrity of Mind) کا نمونہ تھی جو ان کے معاصرین میں بھی کمیاب تھی اور اب موجودہ دور میں تو یہ کمیابی مکمل فقدان کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے ۔ اب فکر و احساس اور شخصیت و کردار کے وہ سانچے ہی شکست و ریخت کی زد میں آ چکے ہیں جو ایسی شخصیتوں کی تشکیل میں بروئے کار آتے تھے۔ حمید احمد خاں مرحوم کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ عصرِ جدید کے فکری اور تہذیبی سرمائے اور اس کے مقتضیات سے اچھی طرح باخبر ہونے کے باوجود وہ اس دور کی یاد دلاتے تھے۔ جب انسانی فکر و احساس کی "کلیت" پارہ پارہ نہیں ہوئی تھی، شعر و ادب ، فلسفہ اور تہذیب کے مختلف مظاہر میں جہاں انہیں اس "کلیت" کا سراغ نظر آتا تھا وہ والہانہ شوق کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے تھے ۔ جہاں اس وحدت کو تقسیم کرنے والے عوامل کارفرما نظر آتے تھے ، ان کا ذہن ان کے خلاف مدافعانہ

روش اختیار کر لیتا تھا - میرا خیال ہے کہ یہ مسلک انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے آغاز میں ہی اختیار کر لیا تھا اور پایان عمر تک وہ اس پر کاربند رہے - اس کا سب سے نمایاں ثبوت ان کے فکر و نظر کی " راست روی " اور " راست بینی " میں ملتا تھا ، اور یہی چیز تھی جس نے بے شمار اور متنوع مصروفیتوں ، ذمہ داریوں اور مصلحت کوشیوں میں بھی (جن میں سے بعض ان کے طبعی رحجان سے مطابقت بھی نہ رکھتی تھیں) ان کے ذہن کو کج روی اور الجھاؤ سے محفوظ رکھا - میرا مطلب یہ نہیں کہ ان سے غلطیاں سرزد نہیں ہوئیں ، میری مراد صرف یہ ہے کہ شعوری سطح پر غلط اندازِ فکر اختیار کرنے یا اس پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھنے سے ان کی طبیعت ہمیشہ ابا کرتی تھی اور غالباً یہی سبب ہے کہ ہر موقع پر ان کے لئے اپنے منصب کے تقاضوں اور مصلحتوں کی پاسداری ممکن نہ ہوتی تھی- اپنے نصب العین اور اصولوں پر ان کی گرفت بہت شدید تھی اور اس معاملے میں وہ کسی مداہنت کے روادار نہ تھے-

شخصیت کا یہ انضباط جس کی جانب میں نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے یونہی حاصل نہیں ہوتا - یہ دولت سرِ راہ نہیں ملا کرتی - اس کے لئے انسان کو بڑی سخت ریاضت کرنی پڑتی ہے - اس نظر سے دیکھئیے تو معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں کی ساری زندگی ایک مسلسل ریاضت تھی - اس پس منظر میں ان کے ذاتی عزائم ، مادی کامیابیوں کی خواہش اور دنیوی اعزاز و مناصب کی طلب کی حیثیت بھی ثانوی نظر آنے لگتی ہے -

حمید احمد خاں کے بعض کرم فرما اور اکثر ناقد مختلف اوقات میں ان کے بارے میں تعریض کے طور پر یہ رائے ظاہر کرتے رہے ہیں کہ وہ " کتابی " یا "Academic" قسم کے آدمی تھے- مجھے اس الزام میں بڑی صداقت نظر آتی ہے- لیکن میری نظر میں ان کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ آغاز سن شعور سے آخر عمر تک اکیڈمک اندازِ فکر اور طالب علمانہ انداز مزاج سے بے نیاز نہ ہو سکے - وہ

پیشے کے اعتبار ہی سے نہیں طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے بھی پروفیسر تھے اور عمر بھر پروفیسر ہی رہے۔ جو شخص علمی اقدار کی کس مپرسی کے اس دور میں اپنا یہ امتیاز سرفراز رکھ سکے اُس کی عظمت میری نظر میں ہر شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار عمل تدریس کے تقاضوں پر گفتگو کرتے ہوئے اُنھوں نے اعتراف کیا تھا کہ ”کسی دل پسند موضوع پر لکچر دیتے وقت میری نظر بھی اپنی ذات کے اندر روشنی کے ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہے اور میں ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اُس تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن ضرورت اور تجربے نے مجھے یہ بھی سکھا دیا ہے کہ طلبہ کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو ساتھ لے کر نہ چلوں تو میری کوشش بار آور نہ ہوگی۔“ وہ تمام عمر ادب کے طالب علم اور اُستاد رہے لیکن مجھے علم ہے کہ ان کی نظر میں ادب کا مفہوم وہ نہ تھا جو مغرب سے مستعار نصابِ تعلیم میں مروج ہے۔ وہ حسنِ ادب کے پرستار تھے وہ ”آدابِ انسانیت“ کے تمام سرمائے پر حاوی ہے۔

خاں صاحب کی علمی کاوشوں کا اصل حاصل تو جو تمام ذہن ہیں جنھوں نے ان سے اکتساب فیض کیا۔ ان میں ان کے باضابطہ شاگرد بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی جنھیں ان کی معیت اور راہنمائی میں علمی کام کرنے کا موقع ملا۔ زندگی کی مصروفیات نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنا تمام علمی و فکری سرمایہ ضبطِ تحریر میں لا سکیں۔ ان کے تحریری کام کے مطالعے سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اگر وہ یکسوئی کے ساتھ اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کام کے لئے وقف کر سکتے تو اُردو کے علمی، تحقیقی اور تنقیدی سرمائے میں کتنا بیش بہا اضافہ ہوتا۔ تاہم جو کچھ انہوں نے چھوڑا ہے، اس کی اصل قدر و قیمت مقداری پیمانوں سے نہیں جانچی جا سکتی۔ ان کی محققانہ نظر، سلامتِ ذوق، گہری بصیرت، اصابت رائے اور متوازن قوت فیصلہ ایسی خصوصیات ہیں جو ہمارے تنقیدی ادب میں کم یکجا ہوئی ہیں۔ ان کی متفرق تحریروں میں بھی علم و بصیرت کی جو بلند سطح نظر آتی ہے اس کے بارے میں شاید یہی کہنا کافی

ہوگا ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

مطالعۂ ادب میں خاں صاحب کا ذہنی عمل جس "راست بینی" و "راست روی" کی نشاندہی کرتا ہے اس کی شہادتیں ان کے فکر و نظر کے ہر شعبے میں ملتی ہیں - مذہب، اخلاق، عمرانیات، سیاست - غرض ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں وہ ایک واضح اور معین نقطہ نظر رکھتے تھے اور بالالتزام اس کے حوالے سے سوچتے اور گفتگو کرتے تھے - کبھی ایک معین نقطہ نظر سے وابستگی میں لچک کی کمی بھی نظر آتی تھی - ان کا ذہن عصبیت سے بھی نا آشنا نہ تھا - لیکن ان کے تعصبات بھی اصولوں اور معیاروں سے وابستگی کی پیداوار تھے - اسی لئے تعصبات کی صلابت اور شدت بھی ذہن کے اس عمل میں حائل نہ ہوتی تھی جسے میں نے راست روی سے تعبیر کیا ہے - میرا عقیدہ ہے کہ یہ ذہنی صلاحیت کسی مثبت نصب العین پر محکم ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی - اور خاں صاحب کے بارے میں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قومی و ملی نصب العین اور اقدار پر ان کا ایمان غیر متزلزل تھا - مجھے ان کے اس ایمان میں ایک "مومن قانت" کی شان نظر آتی ہے اور میں اسے ان کے مذہبی عقائد و افکار سے الگ کر کے نہیں دیکھتا - جہاں تک ظواہر دین سے عملی وابستگی کا تعلق ہے، شاید خاں صاحب کے اکثر احباب و شناسا انہیں عرف عام میں مذہبی آدمی کہنے میں متامل ہوں گے - مجھے بھی اس پر اصرار نہیں لیکن یہ حقیقت میرے علم میں ہے کہ آزاد خیالی کے رجحان کے باوجود روحِ دین اور اصول دین سے ان کی آگاہی اور وابستگی بہت سے مستند علمائے کرام سے کم نہ تھی - عرصہ ہوا ایک بار انہوں نے ایک پرانے طویل مقالے کا مسودہ دکھایا تھا - مقالے کا موضوع سیرت نبوی کی جامعیت و کاملیت تھا اور اسے غالباً انٹرمیڈیٹ سائنس کے ایک نو عمر طالب علم نے حیدر آباد دکن کے ایک انعامی مقابلے کے لئے تقریباً نصف صدی قبل لکھا تھا - اس سلسلے میں انہوں نے یہ لطیفہ بھی سنایا تھا کہ مقالے کے عالمانہ طرز

استدلال اور اندازِ نگارش نے انعام کا فیصلہ کرنے والے حضرات کو اس شبہ میں مبتلا کر دیا تھا کہ غالباً اس طالب علم نے مقالہ کسی مستند عالم سے لکھوا کر پیش کیا۔ بالآخر صدر مجلسِ منصفین، نواب حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے طالب علم مذکور کو انٹرویو کے لئے طلب کیا اور طویل گفتگو کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا کہ یہ طالب علم ایسا مقالہ لکھنے کی استعداد رکھتا ہے۔ میں نے وہ مقالہ بالاستیعاب تو نہیں پڑھا لیکن سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوا کہ منصفین کے شکوک کلیتاً بے بنیاد بھی نہ تھے۔ میں نے بر سبیل تبصرہ عرض کیا ۔ "خاں صاحب ! اب تو آپ ایسی عالمانہ زبان نہیں لکھتے ۔" اس پر ہنسے اور کہنے لگے " یہ بھی تو سوچئے کہ یہ کس عمر میں لکھا گیا تھا ۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں 'پندار ہمہ دانی ' کا کیا عالم ہوتا ہے ۔ " مقالہ نگار حمید احمد خاں کا "پندار ہمہ دانی" تو عمر اور علم میں اضافے سے کم ہوتا گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ والہانہ جذبۂ عقیدت جو اس مقالے کی ہر سطر میں جھلک رہا تھا مدۃ العمر برقرار رہا اور عالم جاودانی کی طرف رحلت کے وقت وہی ان کے لئے زادِ راہ ثابت ہوا ہوگا ۔ یہ دولت انہیں غالباً خاندانی ورثے کے طور پر ملی تھی لیکن اسے محفوظ رکھنا خود ان کا کارنامہ تھا ۔ فکرِ اقبال سے ان کے شغف میں بھی اسی دینی جذبے کا اظہار ہوتا ہے ۔ اگرچہ یہ فیصلہ کرنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ افکار اقبال سے ان کی دلبستگی اس جذبے کا نتیجہ ہے یا سبب۔ بہر حال اس وابستگی میں ان کا خلوص شک و شبہ سے بالا تر تھا۔ مذہب کے رسمی تصور اور نام نہاد اہل مذہب کے عمل پر وہ اکثر بڑے تیکھے انداز میں طنز بھی کرتے تھے ۔ قول و عمل کا تضاد اکثر ان کی گفتگو میں تنقید و تعریض کا ہدف بنتا تھا۔ مذہبی پیشواؤں اور اجارہ داروں کے مذہب کی "عمارت گریِ گنبدِ دستار" کے مقابلے میں بعض اوقات کافروں کی مسلم آئینی کا اعتراف بھی کرتے لیکن اس طنز و تنقید میں بھی ایک درد مند مسلمان کا لب و لہجہ نمایاں ہوتا تھا اور انداز فکر واضح طور پر اسلامی ہی نظر آتا تھا ۔ اسلامی نظریۂ اخلاق و آداب معاشرت اور سیرت رسول ؐ سے اس کے بنیادی تعلق پر وہ راسخ ایمان رکھتے تھے اور اس موضوع

پر جب کبھی گفتگو ہوئی میں نے انھیں ایک راسخ الاعتقاد مسلمان ہی کے روپ میں دیکھا ۔ اسلامی افکار ، تہذیب اور تاریخ کا انھوں غائر مطالعہ کیا تھا اور اس مطالعے کے نقوش اتنے گہرے تھے کہ مغربی ادب و افکار کی تدریس سے عمر بھر وابستہ رہنے کے باوجود یہ نقوش مدھم نہ پڑ سکے ۔

میں نے یہاں خاں صاحب کے مذہبی نصب العین اور تصورات کا ذکر ذرا تفصیل سے یہ ظاہر کرنے کے لئے کیا ہے کہ پاکستان کی نظریاتی اساس پر ان کا مستحکم ایمان بھی ان کے لئے ایک دینی عقیدے کا درجہ رکھتا تھا اور اسی انداز فکر کا مرہون منت تھا۔ ان کے تمام سیاسی افکار کی بنیاد وہی مسلم قومیت کا تصور تھا جو تحریک پاکستان میں ایک محرک قوت کی حیثیت سےکارفرما تھا۔ اسی سےانھوں نے وہ معیار حاصل کیا تھا جو ہر تحریک اور ہر شخصیت کو جانچنے اور پرکھنے میں بروئے کار آتا تھا ۔ ان کے تعصبات بھی اسی کے پروردہ تھے اور ان کا ہدف وہ تمام تحریکیں اور شخصیتیں تھیں جنھوں نے پاکستان کی نظریاتی بنیاد کو تسلیم کرنے سے انکار کیا یا اس کی وحدت و سالمیت پر ضرب لگانے کی کوشش۔ بھارتی سامراج اور سرخ زاروں کے ان ایجنٹوں سے انھوں نے کبھی مصالحت نہ کی جو علاقائی قومیتوں کے نام پر پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرتے رہے ہیں ۔ پاکستان کے اس تصور سے ان کی ذہنی اور جذباتی وابستگی اتنی شدید اور بے لچک تھی کہ اپنی مادری زبان پنجابی کی حامی تحریکوں کے بارے میں ان کو ہمیشہ یہ شک رہتا تھا کہ یہ "اصحاب المیسرہ" کی سازش کا نتیجہ ہیں اور ان کا مقصد قومی زبان اُردو کو اس کے صحیح مقام سے محروم کرنے اور اس کے وحدت آفریں اثر کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ، اور جب شواہد اس شبہ کی تائید کر دیتے تھے تو وہ لسانی قومیت کی ہر تحریک کی اس شد و مد سے مخالفت کرتے تھے کہ ان کی استقامت اکثر کٹر اہل زبان حضرات کے لئے قابل رشک ہوتی تھی ۔ اُردو سے ان کی وابستگی اور اُردو کی حمایت میں ان کی سرگرمی بھی اسی فکری و جذباتی وابستگی کی پیداوار تھی جو انھیں تمام عمر پاکستان اور پاکستانی قومیت کے تصوراث کے ساتھ رہی اور

یہ وہ غیر مشروط اور غیر متزازل وابستگی تھی جو اپنے ساتھ کسی دوسرے مقصد، مفاد یا مصلحت کی شرکت قبول نہ کر سکتی تھی - وہ ان معدودے چند پاکستانی مفکرین میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں جن کا ہر متنازعہ مسئلے میں نقطہ نظر خالصتاً پاکستانی ہوتا تھا۔ مجھے بارہا ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس مقام تک، تعقل و استدلال کی راہ سے نہیں پہنچے تھے - یہ وہ کیفیت تھی جسے اقبال نے خیال و نظر کی مجذوبی سے تعبیر کیا ہے :

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں

اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عمر بھر علم و حکمت کی جستجو کرنے کے باوجود وہ اس کے بھی قائل تھے کہ ع

ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار اسی سیاق و سباق میں میں نے ان کے سامنے عارف رومی کا یہ شعر پڑھا تھا :

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
ہمہ ز آفتاب بینم ، ہمہ ز آفتاب گویم

اور وہ اس شعر کو دیر تک پسندیدگی کے انداز میں اس طرح دہراتے رہے تھے گویا ان کے اپنے دل کی بات ہو !

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی ذاتی صفات ان کی مروت ، شرافت ، عالی ظرفی، دیانت - راستبازی، خلوص اور ایسی بے شمار اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ چھوڑ جائے تو ایک مختصر مضمون تو کیا طویل مقالوں میں بھی کوتاہی داماں کا گلہ رہے گا میں نے گفتگو کو قصداً ان کے فکر و نظر کے چند ایسے پہلوؤں تک محدود رکھا ہے جو ان کی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما رہے - شاید انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کا مناسب طریقہ بھی یہی ہے کہ نئی نسل کی راہنمائی کے لئے فکر و نظر کی ان راہوں

کی نشاندہی کر دی جائے جن سے گزر کر وہ اپنے صحیح مقام تک پہنچ سکے - یہ راہیں آج بھی اہل ہمت کی منتظر ہیں اور شاید جوار رحمت میں جگہ پا کر بھی ان کی وہ دلی آرزو جس نے انھیں زندگی بھر بے چین رکھا اس شعر کی صورت میں ان کے لبوں پر مچل رہی ہو :

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

"ارمغانِ حالی" کا ایک باب

پروفیسر حمید احمد خاں کی کتاب " ارمغان حالی" ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی تھی - ذیل کا اقتباس اسی کتاب سے ہے - حالی کی نظم کے تعارفی الفاظ پروفیسر صاحب کے لکھے ہوئے ہیں -

شکریہ' مساعی' جمیلہ' مولانا ظفر علی خاں

(۱۹۱۳ء)

اس دلچسپ نظم کی دو حیثیتیں قابلِ ذکر ہیں - یہ مولانا حالی کی آخری نظم ہے ،کیونکہ گو مولانا نے وفات سے پہلے ہنگامہ' مسجدِ کانپور پر بھی تین رباعیاں تحریر فرمائیں ، لیکن رباعی آن معنوں میں نظم نہیں کہلاتی جن میں ذیل کے تئیس مسلسل اشعار حالی کی نظموں میں شامل قرار دئیے جائیں گے -

دوسری خصوصیت جو اس مدحیہ نظم کو ممتاز کرتی ہے وہ جنگِ بلقان و طرابلس کے سلسلے میں حالی کا بین الاقوامی اسلامی شعور ہے - مثلاً یہ شعر دیکھیے:

مشرق میں ہوں دردِ دل سے بے چین
مغرب میں سنیں جو رنجِ اخوان

مسلمانانِ پاکستان و ہند کے اس احساس میں ، کہ ترک ہمارے بھائی ہیں ، حالی برابر کے شریک ہیں - ترکوں پر جو مصیبت اس دور میں پڑی ، وہ دراصل خود ہمارے لئے ایک قومی مصیبت تھی - نظم کے تیرھویں شعر میں " غمِ قوم" کی ترکیب حالی کے اسی احساس کا اظہار کرتی ہے - یوں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے اس نظم کو مسلمانانِ برِ عظم کے ملّی شعور کا ترجمان بنایا ہے -

مولانا حالی نے اپنے خط مورخہ ۳ اگست ۱۹۱۳ء میں اس نظم کی تصنیف

کا حال خود بیان کیا ہے ۔ مولانا ظفر علی خاں کا ذکر کرکے فرماتے ہیں : " جب وہ مغرب کی جانب روانہ ہونے کو تھے ، میں نے چند ابیات اُن کی شان میں لکھی تھیں مگر جب وہ روانہ ہو گئے تو وہ نظم ناتمام رہ گئی ۔ کل بمقام دہلی پانی پت سے اُن کو تار دیا گیا تھا کہ لاہور جاتے ہوئے تھوڑی دیر یہاں بھی قیام فرمائیں ۔ ارادہ تھا کہ یہ نظم میں خود اُن کے سامنے پڑھوں گا ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ہمارے واجب التعظیم مسافر بالا بالا لاہور کو روانہ ہو گئے ۔"

اے مالکِ دفترِ "زمیندار" ۔۔۔ اے نازشِ قوم و فخرِ اقراں
اے روح و روانِ جمع احباب ۔۔۔ اے چشم و چراغِ بزمِ اخواں
اے دین کے امتحاں میں جاں باز ۔۔۔ اے نُصرتِ حق میں تیغ عریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر ۔۔۔ اے شیر دل، اے ظفر علی خاں !
قدرت نے بھرے تھے تجھ میں جوگن ۔۔۔ جب تک وہ رہے نظر سے پنہاں
فوقیت و برتری پہ تیری ۔۔۔ قائم کوئی ہو سکی نہ بُرہاں
ہر وقت کی تاک میں برابر ۔۔۔ ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ ۔۔۔ اُٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردی اہلِ دیں نے آخر ۔۔۔ جوہر ترے کر دیے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر ۔۔۔ دامن ہوا چاک تا گریباں
پھیلے وہ بہ شکلِ سیلِ آتش ۔۔۔ دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
ڈالا یہ تری پکار نے غُل ۔۔۔ جی اُٹھے وہ مُردے جو تھے بیجاں
جو دل غم قوم سے تھے بے حس ۔۔۔ چلنے لگیں اُن دلوں پہ چُھریاں
وہ بن گئے آپ اپنے رہزن ۔۔۔ جو مال کے اپنے تھے نگہباں
اسلام کی سمجھے اب حقیقت ۔۔۔ جو نام کے تھے فقط مسلماں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ ۔۔۔ سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں !
نازاں ہے وہ درسگاہ تجھ پر ۔۔۔ تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں
کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند ۔۔۔ جو قوم کے درد کے ہوں درماں

سوزِ غمِ دینِ حق سے جن کے　　سینے ہوں کباب دل ہوں بریاں
جو ملک و وطن کے ہوں فدائی　　جو قوم کے نام پر ہوں قرباں
مشرق میں ہوں درد دل سے بیچین　　مغرب میں سُنیں جو رنجِ اخواں
پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر　　ہے اُس کو یہ فخر و ناز شایاں
زندہ ہے وہ مُلک اور وہ ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

جناب مظفر احمد

حیمد زندہ باد!

جناب مظفر احمد پروفیسر حمید احمد خاں کے ماموں زاد بھائی اور منصور احمد مرحوم ، مدیر " ادبی دنیا " کے چھوٹے بھائی تھے - افسوس کہ اس مضمون کے چھپتے چھپتے وہ بھی دوسری دنیا میں جا بسے -

میں پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے متعلق کچھ لکھ رہا ہوں ، مگر حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر صاحب مجھ سے بہت دور بستے تھے۔ ہماری ملاقاتیں صحبتِ غیر میں سرِ راہے گاہے ہوا کرتی تھیں - یا پھر کبھی آن کے دولت کدے پر یا اپنے گھر ، دس پانچ منٹ یا گھنٹے دو گھنٹے کے لئے -

میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے مقابلے میں حمید سے زیادہ واقف ہوں - اس کے ساتھ میں نے بچپن اور نوجوانی کے دن گزارے اور مہینوں اور برسوں تک میں اور وہ کبھی آن کے گھر کبھی اپنے گھر اور کبھی چچا صاحب کے گھر اکٹھے رہتے رہے - حمید کی یادیں میری متاعِ گرانمایہ ہیں اور ذہن کے کونوں کھدروں میں دبی پڑی ہیں - ان میں سے جو ابھریں میں نے پیش کر دی ہیں - بعض واقعات شاید میں نے ایسے بھی درج کر دئیے ہیں جو براہ راست حمید سے تعلق نہیں رکھتے - لیکن واقعات کے تسلسل اور سیاق و سباق یا ماحول کی وضاحت کے لئے قلم سے ٹپک پڑے -

پروفیسر حمید احمد خاں کے متعلق مجھ سے بہتر لکھنے والے بہت ہیں - ان کے ہزاروں شاگرد ، آن کے سینکڑوں دوست اور بیسیوں عزیز اور رشتہ دار - میں نے چند سطور لکھی ہیں لیکن یہ آن کے تبحرِ علمی یا آن کے عظیم کارناموں پر نہیں

بلکہ میری آن کی ذاتی باتوں پر مشتمل ہیں -

وقت کے متعلق میرا احساس یہ ہے کہ ماضی اور مستقبل دو دیواریں ہیں جو انسان کے پیچھے اور آگے کھڑی ہیں - انسان ان دو دیواروں کے درمیان حال کو طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے اور دونوں دیواریں اس کے ساتھ ساتھ آگے کو سرکتی رہتی ہیں -

ماضی کی دیوار کچھ نیچی ہے ، جس کے اوپر سے انسان نیچے کو جھانک سکتا ہے اور گزرے زمانے کی دلچسپیاں ، کامرانیاں اور ناکامیاں ، اور شادی و غم کے بیتے ہوئے دن نہ صرف دیکھ سکتا ہے بلکہ اگر چاہے تو دوبارہ انھیں اپنے اوپر وارد بھی کر سکتا ہے - مستقبل کی دیوار کچھ اونچی ہے جس کے اوپر سے جھانکنے کے لئے ویسے ہی طویل قد و قامت کی ضرورت ہے - اگر کسی وقت انسان ان دیواروں کو پھلانگنے میں کامیاب ہو گیا تو زندہ جاوید ہو جائے گا -

ہم جموں کے محلۂ افغاناں کے ایک اوسط درجے کے مکان میں رہتے تھے - یہی ہمارا آبائی مکان تھا - زمانہ تقریباً ۷ - ۱۹۰۶ء کا ہوگا - زندگی پُر سکون اور بغیر کسی ہنگامے کے گزر رہی تھی کہ یکایک گھر میں " خاں صاحب" کی آمد کا چرچا ہونے لگا - " خاں صاحب آ رہے ہیں -" گھر میں صفائیاں ہونے لگیں- "کرم آباد سے خاں صاحب آ رہے ہیں -" بچوں کے کپڑے سیے گئے - " خاں صاحب کل پہنچ رہے ہیں" ہمارے گھر کے سامنے پنڈتوں کا ایک فراخ مکان تھا ، وسیع صحن اور دو تین بڑے بڑے کمرے - یہ مکان عاریتاً لے لیا گیا اور اس میں خاں صاحب کے قیام کا انتظام کیا گیا - ایک لمبا چوڑا قالین بچھایا گیا - دو تین کرسیاں اور تپائی سجائی گئی کہ یہ بھی عاریتاً حاصل کی گئی تھیں - پلنگ اور بستر کا انتظام ہوا - ایک لیمپ ، ایک لالٹین اور مٹی کا ایک بڑا سا دیا جس میں کوئی پاؤ بھر کڑوا تیل تھا مع روئی کی بتی کے ، طاقچے میں رکھا گیا اور پھر اگلی صبح والد صاحب انہیں لینے کے لئے سٹیشن کو روانہ ہوئے تو میں بھی ان کے ہمراہ تھا -

"خاں صاحب" گاڑی سے اترے - برقع میں ملبوس ایک خاتون اور بچے

اُن کے ہمراہ تھے۔ ان میں ایک موٹی موٹی آنکھوں والا ، سرخ و سفید ، معصوم صورت بچہ مجھے بہت ہی پیارا لگا ۔ یہ قریباً میرا ہم عمر تھا اور اس کا نام حمید تھا ۔

معلوم ہوا کہ خاں صاحب کو لینے کے لئے سرکاری فٹن آئی ہوئی ہے ۔ ہم سب اس میں سوار ہو گئے لیکن یہ گاڑی بجائے ہمارے گھر کی سمت مڑنے کے سیدھی منڈی مبارک کو نکل گئی ۔ منڈی مبارک مہاراجہ کے محلات اور سرکاری دفاتر پر مشتمل تھی ۔ منڈی کے بغلی دروازے سے متصل ایک حویلی میں خاں صاحب اور ان کے کنبے کو آتارا گیا ۔ میں اور والد صاحب واپس ہوئے ۔ شام کے قریب وہ خاتون اور بچے ہمارے گھر آ گئے ۔ یہ معلوم کر کے بے انتہا مسرت ہوئی کہ خاتون ہماری بڑی پھوپھی اور خاں صاحب (مولانا سراج الدین احمد خاں) ہمارے پھوپھا ہیں، جن کی خدمات تقریباً سولہ سال پہلے حکومتِ ہند سے ریاست جموں و کشمیر میں محکمہ تار و ڈاک کی تنظیم کے لئے مستعار لی گئی تھیں ۔ سبکدوشی کے بعد بھی ریاست میں آمد کے وقت حکومتِ جموں و کشمیر ان کی میزبان ہوتی تھی ۔

اگلی صبح میں اور حمید کھیلنے کے لئے پنڈتوں والے مکان میں چلے گئے ۔ کیا کھیلیں ؟ قالین پر قلابازیاں لگائیں ۔ تھوڑی دیر کے بعد آکتا گئے ۔ قالین پر ہاتھوں اور پاؤں کے بل چلتے ہوئے معلوم ہوا کہ ایک خاص رخ میں ہاتھ آگے کو پھسلتے ہیں ۔ معلوم نہیں کہاں سے آرٹ پیپر کے اوراق پھاڑے اور دونوں ہاتھوں کے نیچے رکھ کر جب پھلسنے کا تجربہ کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے ہاتھوں کے نیچے پہیے لگ گئے ہیں ۔ آ ہا ہا ! لطف آ گیا ۔ کچھ دیر اس میں منہمک رہے ۔ پھر مٹی کے دئیے پر نظر پڑی ۔ آؤ سر میں تیل لگائیں ۔ حمید اور میں دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے اور تیل میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر اور دونوں ہتھیلیوں میں مل کر سر کو چپڑنے لگے ۔ تیل کی مقدار کا اندازہ نہیں تھا اس لئے ہمیں زیادتی کا احساس اس وقت ہوا جب تیل سر سے نکل کر گالوں اور گردن پر بہنے لگا ۔ چنانچہ دئیے کو درمیان میں رکھ کر بالوں کی لٹوں کو دئیے میں نچوڑنا شروع کیا ۔ کتنا مزہ آیا اس کھیل میں ۔ ہنسی کے مارے ہم لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے ۔ اتنے میں کوئی بزرگ آ نکلے اور

ہمیں پکڑ کر گھر لے گئے جہاں ہمیں تیل سے نجات دلائی گئی -

حمید سے یہ میری پہلی ملاقات تھی -

سنا ہے کہ ریاست میں ڈاک خانوں کے قیام کے دوران ایک وزیر صاحب نے کہ کشمیری پنڈت تھے ، مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ سے شکایت کی کہ خان صاحب نے بہت سے مسلمانوں کو محکمے میں بھرتی کر لیا ہے - مہاراجہ نے سرِ دربار خاں صاحب سے استفسار کیا -

آپ نے فرمایا " مہاراج آپ نے ٹھیک سنا ہے - چند مسلمان میں نے ضرور بھرتی کئے ہیں لیکن اگر میں نہ کرتا تو کیا پنڈت - - - صاحب انہیں بھرتی کرتے - ان کو تو پنڈتوں ہی کو ملازمت دلوانے سے فرصت نہیں ملتی -"

اس جواب سے وزیر صاحب پر توگھڑوں پانی پڑ گیا اور مہاراجہ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ موضوعِ سخن بدل دیا جائے ، کیونکہ ریاست میں ہر ایسی اسامی پر جو پڑھے لکھے لوگوں کے لئے مناسب تھی ہندو پنڈت ہی قابض تھے -

آپا حمیدہ بیگم کی شادی پر ہم سب جموں سے کرم آباد گئے - آہا کتنی بڑی حویلی تھی اور ہر طرف چہل پہل اور رونق - حامد ، حمید ، منصور اور میں وسیع صحن کے ایک کونے میں بنے ہوئے مرغی خانے کی جالیوں کے اندر کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے - حامد نے کہا " منصور ، ون لائیٹ -" منصور مرغی خانے سے نکل کر حویلی کے کسی اندرونی کمرے میں گئے اور ایک لڈو لئے ہوئے آ گئے - (حامد علی خاں نے لڈو کے لئے انگریزی لفظ "لالیٹ" وضع کیا تھا - یہ لڈو پرانے زمانے میں بند مٹھی کی شکل کے شادی بیاہ کی تقریبوں میں بنائے جاتے تھے اور ان کے اندر میٹھی پنجیری بھری ہوتی تھی) دونوں نے لڈو آپس میں تقسیم کر کے کھا لیا - اب میں اور حمید بھی مصر ہوئے کہ ہمیں بھی کھلایا جائے - چنانچہ حامد نے حکم دیا " منصور ، ٹو لالیٹ -" اب کے دو لڈو آئے آدھا آدھا ہمیں بھی ملا - اور پھر یہ سلسلہ طول کھینچ گیا اور بہت سے بچوں نے مل کر دیکھتے دیکھتے ٹوکرے کو آدھا

ختم کر دیا ۔

اتنے میں کسی بچی کی آواز آئی " بھاؤؤ!" اور حمید اٹھ کر چلا گیا ۔ معلوم ہوا کہ زہرا، بھائی محمود احمد خاں کو "بڑے بھائی" حامد علی خاں کو "بھائی" اور حمید احمد خاں کو "بھاؤؤ" کہتی ہے ۔ کتنا لاڈ اور پیار رچا ہوا تھا اس ایک لفظ بھاؤؤ میں ، اس کا اندازہ کہنے والی کے لہجے اور کہلانے والے کے دل سے لگایا جا سکتا ہے ۔

یہاں کرم آباد کا ایک لطیفہ بھی سنتے چلیے ۔ غالباً ان دنوں کرم آباد کے محترم بانی مولانا سراج الدین احمد خاں ملازمت ترک کر کے " زمیندار" جاری کر چکے تھے ۔ گاؤں میں سب کو حکم ملا کہ پنجابی کی بجائے اردو بولا کریں ۔ ایک روز منشی شاہ محمد ملازم کو چائے کے لئے اندر سے دودھ لانے کو کہا گیا ۔ اس کے گھٹنے میں درد تھا کوئی عذر تو نہ کر سکا لیکن اندر جا کر شکایت کرنے لگا ۔ " آگے ہی میرا گوڈا (گھٹنا) نہیں ٹورتا (چلتا) مغروں (اس پر) مجھ کو ہی کہتے ہیں دودھ لاؤ ۔"

پیر بخش میراثی نے انکشاف کیا "اب ہم بھی اردو کوتے (بولتے) ہیں ۔"

مجھے خاندان کے ایک رکن کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ جب مولانا سراج الدین احمد خاں کی وفات کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے اخبار " زمیندار" کو دوبارہ لاہور لے جانے کا ارادہ کیا تو پھوپھی صاحبہ کو بلا کر سارا منصوبہ بتایا ۔ پھر کہا کہ اگر والد مرحوم کا کچھ نقد اثاثہ آپ کے پاس ہو تو اس وقت امداد فرمائیں ۔ پھوپھی صاحبہ بغیر کچھ جواب دئے اپنے کمرے میں گئیں اور ایک بڑا سا کیش بکس ملازمہ سے اٹھوا کر لے آئیں ۔ چابی مولانا کے آگے رکھ دی اور کہا کہ جو نقد اثاثہ موجود ہے وہ سب اسی میں ہے ۔ آپ جس طرح چاہیں اسے صرف کریں ۔

مولانا ظفر علی خاں جب "زمیندار" کو دوبارہ لاہور لے گئے تو غالباً

جنگ طرابلس کا زمانہ تھا ۔ میرے والد صاحب کو دفتر کا انتظام سنبھالنے کے لئے بلاوا آیا اور ہم سب لاہور آ گئے حضرت شاہ محمد غوث کی درگاہ سے ملحق وہ عمارت اب بھی موجود ہے جہاں مولانا ظفر علی خاں رہتے تھے ۔ اس کے نیچے آج کل نیشنل بنک آف پاکستان کی ایک شاخ ہے ۔ اسی مکان میں ہم لوگ وارد ہوئے ۔ اگلے روز ہمیں بارود خانے میں ایک مکان کرائے پر مل گیا ۔ "زمیندار" کا دفتر پہلے شاہ محمد غوث سے بدل کر ریلوے سٹیشن کے قریب ایک کوٹھی میں گیا پھر کیشو رام بلڈنگ برانڈرتھ روڈ میں منتقل ہوگیا ۔ اوپر کی منزل میں ایک طرف مولانا ظفر علی خاں کا کنبہ تھا اور دوسرے حصے میں پھوپھی صاحبہ اور بچے۔ نچلی منزل میں زمیندار کا دفتر اور پریس تھا۔ ان دنوں حمید اسکول میں پڑھتا تھا اور ایک استاد ماسٹر خیرات علی دونوں بھائیوں کو گھر پر پڑھانے آتے تھے ۔

اخبار "زمیندار" کے انتہائی عروج اور پھر اخبار کی متعدد ضمانتوں اور پریس کی ضبطی کا دور بھی یہی تھا ۔ خلیقی دہلوی کی ایک نظم ان دنوں کہیں پوسٹر کی شکل میں شائع ہوئی تھی جس کا ایک شعر ابھی تک یاد ہے :

خوبی تھی تم میں کون سی حضرت ظفر علی
اخبار پڑھ رہے تھے تمہارا گلی گلی

بڑا بے فکری کا دور تھا ۔ پھوپھی صاحبہ اور بچے ہمارے ہاں آتے ، ہم ان کے ہاں جاتے ۔ چند سال اسی طرح گزر گئے ۔

ایک زمانے میں ہم دہلی دروازے کے اندر رہتے تھے ۔ ان دنوں حمید غالباً میٹرک کا امتحان دینے والا تھا ۔ بے حد محنت کرتا تھا ۔ دن ہو یا رات بس کتابیں پڑھنے سے کام ہوتا ۔ والد صاحب کو بے حد تشویش ہوتی کہ کہیں اس کی صحت پر برا اثر نہ پڑے اس لئے اکثر اسے اتنی زیادہ محنت کرنے پر ٹوکتے رہتے ۔ ایک دن حمید اس بات پر برہم ہو گیا اور زمیں پر زور سے پاؤں مارتا ہوا بولا "جس بدبخت کے امتحان میں پندرہ دن رہ گئے ہوں وہ محنت نہ کرے تو کیا کرے ؟" حمید کو خیال ہوا کہ یہ مجھے غبی سمجھتے ہیں اس لئے اسے دکھ پہنچا ۔ والد صاحب

چپ ہو گئے ۔ اس کے بعد مزاحاً اکثر حمید کے سامنے زمین پر پاؤں مار کر یہ فقرہ دہرایا کرتے تھے اور حمید بے چارہ کچھ کہہ تو نہ سکتا تھا ، مسکرا کر خاموش ہو جاتا ۔

پھوپھی صاحبہ کرم آباد منتقل ہو گئیں اور ہم کسان بلڈنگ والے مکان میں آٹھ آئے ۔ اُن دنوں حامد علی خاں ماہنامہ "ہمایوں" کے ایڈیٹر تھے اور ہمارے ہاں مقیم تھے ۔ حمید بھی اکثر آ جاتا تو بڑی پر تکلف صحبتیں رہتیں ۔ حامد علی خاں رسالے کے لئے کوئی نظم یا غزل لکھتے تو حمید کو ترنم کے ساتھ پڑھنے کو کہتے ۔ ایسی ہی ایک صحبت میں والد صاحب ، منصور ، حامد علی خاں ۔ حمید اور میں اکٹھے تھے ۔ حامد علی خاں نے حمید سے اپنی ایک غزل پڑھنے کی فرمائش کی ۔ اس کا مطلع اور حمید کی میٹھی اور مترنم آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے ۔

نُور ہوں نُور کا سیلاب اُگلنا ہے مجھے
صورتِ چشمۂ خورشید اُبلنا ہے مجھے

والد بڑے سخن شناس تھے ۔ مطلع سن کر پھڑک اُٹھے ۔ کہنے لگے ، حامد کمال کر دیا ۔ مطلع واقعی مطلعِ خورشید ہے ۔ دیر تک داد دیتے رہے ۔

اور پھر یہ بساط بھی اُلٹ گئی ۔ منصور مرحوم ہوئے ، پھوپھی صاحبہ کا انتقال ہو گیا اور پھر اُن کی موت کے صدمے سے چند ہی روز بعد والد صاحب بھی رخصت ہوئے ۔

یوں ہی کئی سال گزر گئے ۔ ۴۲ء میں حمید احمد خاں کی شادی ہو گئی۔ ۴۴ء میں لاہور سے دہلی چلے گئے اور پاکستان آزاد ہوا تو واپس لاہور لوٹے ۔ دوبارہ اسلامیہ کالج میں آ گئے اور بیگم روڈ پر مقیم ہوئے ۔

ایک دن میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ لاہور میں جن مکانوں میں ہماری سکونت رہی ہے میں اُن سب کو پھر دیکھنا چاہتا ہوں ۔ اگر تم بھی ساتھ

چلو تو لطف رہے گا ۔ چنانچہ کیشو رام بلڈنگ ، کسان بلڈنگ بیرون اکبری دروازہ اور سب سے آخر میں بارود خانے والا مکان جس میں ہم پہلے پہل آئے تھے ، سب دیکھے گئے ۔ اتفاق سے اس مکان کے موجودہ مالک میاں نصیر الدین گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے ہمیں منڈلاتے دیکھ کر اندر بلا لیا اور جب ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو مکان کے مختلف کمروں میں ہمیں پھراتے رہے ۔

حمید احمد خاں کی عادت تھی کہ بغیر کسی تقریب کے اپنے عزیزوں کو کھانے پر مدعو کر لیا کرتے تھے اور بڑی پر تکلف دعوتیں ہوا کرتی تھیں ۔ اس ضمن میں مجھے یاد آیا کہ گوالمنڈی میں ایک شخص بڑے عمدہ پائے پکاتا تھا جو آپ کو بہت پسند تھے ۔ ایک روز آن کا ذکر کیا تو پھر اسی تقریب میں سب عزیزوں کی دعوت کر ڈالی ۔

ایک روز میں ملنے گیا تو خطائیوں کا ایک ڈبہ ساتھ لے گیا ۔ پوچھا اس میں کیا ہے ؟ میں نے کہاں بچپن کی یاد میں آپ کے لئے خطائیاں لایا ہوں ۔ ڈبہ کھول کر ایک خطائی کھائی اور پسند فرمائی ۔ بھابی صاحبہ ڈبہ آٹھا کر اندر لے جانے لگیں تو آن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگے یہ میرے لئے آئی ہیں ۔ انہیں یہیں رہنے دیجے۔ چائے آئی تو کہنے لگے اب سب کھا سکتے ہیں ۔

۱۹۶۲ء میں حمید احمد خاں پرنسپل اسلامیہ کالج نے محکمہ تعلیم کے ایماء پر گیارھویں بارھویں جماعتوں کے لئے آردو ایڈوانس کی کتاب "سفینۂ ادب" (نظم و نثر) مرتب کی ۔ اس کے پروف دیکھنے کا کام ویسے تو صوفی تبسم صاحب کے سپرد تھا لیکن چونکہ یہ کتاب انجمن حمایت اسلام شائع کر رہی تھی جہاں میں ملازم تھا اس لئے میں بھی تھوڑا بہت دخل در معقولات دیتا رہا ۔ کتاب شائع ہوگئی تو ایک روز کالج کا چپراسی مجھے کتاب کا ایک نسخہ اور پرنسپل صاحب کا ایک خط دے گیا ۔ جو یہ تھا :

۲۷ ستمبر ۱۹۶۲ء

برادر مکرم ۔ السلام علیکم ۔ اب یہ کام ختم ہوا ہے تو میں آس

محنت اور توجہ کے لئے جو آپ نے اس کتاب کی طباعت پر صرف کی اپنا دلی شکریہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کی مدد شامل نہ ہوتی تو جس صحت کے ساتھ یہ کتاب چھپی ہے اس کا عشر عشیر بھی اس کے حصے میں نہ آتا ۔ آپ نے محض پروف ریڈنگ نہیں کی بلکہ جابجا مجھے مفید اور فاضلانہ مشورے بھی دیے ہیں ۔ میں ان تمام نوازشات کے لئے بے حد شکرگزار ہوں ۔

خاکسار

حمید احمد خاں

میں کیا اور میرے فاضلانہ مشورے کیا ، لیکن خدا لگتی کہوں تو اس خط کو پڑھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا اور نے سمجھا کہ واقعی میں نے کوئی کارنامہ سر انجام دیا ہے ۔

اور پھر غالباً ۱۹۷۰ء یا ۱۹۷۱ء میں ایک ملاقات پر فرمایا کہ "سفینہ ادب" حصہ نظم میں 'شہر آشوب' کے نوٹ میں ایک فاش غلطی سرزد ہوئی ہے ۔ اس میں 'کاتبی خلد مکاں' کے الفاظ شہنشاہ اورنگ زیب کی صدری کے لئے استعمال ہوئے ہیں ، میں نے غلط تشریح کر دی ہے ۔ ایک صاحب نے خط کے ذریعے اس طرف توجہ دلائی ہے ۔" کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کر دی گئی تھی ۔

آپ کی وائس چانسلری کے زمانے میں یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب میرے پاس آئے اور بتایا کہ انہیں چار سال سے ترقی نہیں ملی اور ایک غیر ملکی وظیفے کے حصول سے بھی انہیں محروم رکھا گیا ہے جس کے وہ مستحق تھے ۔ وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ ایک خاص گروہ ان کے درپۓ آزار ہے ۔ میں ان کے بیان سے بڑا متاثر ہوا ۔ مجھے حمید احمد خاں کی کم فرصتی اور انتہائی مصروفیت کا علم تھا اس لئے میں نے گھر پر ملاقات کا وقت لیا ۔ اگلے روز ملا ۔ ساری روئداد خاموشی سے سنتے رہے ، پھر مسکرا دئے اور بولے: جو لوگ سفارش کا سہارا لیتے ہیں وہ ہمیشہ غلط بیانی

کرتے ہیں - انہیں اس بات پر بھروسا ہوتا ہے کہ سفارش کرنے والا ان کا کام بنا دے گا - مجھے اس ساری روئداد کے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں - بہرحال چونکہ آپ کی تسلی اس وقت تک نہ ہوگی جب تک میں ان پروفیسر صاحب کا فائیل نہ دیکھ لوں اس لئے میں ایسا ضرور کروں گا اور پھر اپنی نوٹ بک میں نام وغیرہ درج کرتے ہوئے انہوں نے دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر لیا -

اگلے روز فون آیا " وائس چانسلر صاحب سے بات کیجئے " اور پھر

" میں حمید احمد خاں بول رہا ہوں - میں نے پروفیسر - - - - صاحب کا فائیل دیکھا ہے - ان کا بیان بالکل صحیح ہے - ان سے کہیے جمعہ کے روز مجھ سے ملیں - میں نے اپنے سیکرٹری کو ہدایات دے دی ہیں -"

جمعہ کے بعد پروفیسر صاحب بڑے خوش خوش آئے اور بتایا کہ ان کا کام ان کی پوری تسلی کے مطابق ہو گیا ہے -

میرے چھوٹے بھائی محمود کی بیوی کے رشتہ داروں میں ایک صاحب ایک دور افتادہ مقام پر گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے - ان کی بیوی نے شاید چھٹی مرتبہ بی - اے کا امتحان دیا لیکن فیل ہوگئی - اپنے شوہر کو انہوں نے بتایا کہ اس دفعہ انگریزی کا پرچہ بہت اچھا کیا تھا لیکن یا تو نمبر غلط لگے ہیں یا ممتحن صاحب کی سختی کی نذر ہوگیا -

آپ جانیے بیوی کی بات پر کون سا شوہر شک کر سکتا ہے اور پھر ایک سخت گیر ممتحن کے مقابلے میں - چنانچہ وہ لاہور تشریف لائے اور میرے بھائی کو ساتھ لے کر اولڈ کیمپس پروفیسر حمید احمد خاں سے جا ملے - آپ نے ساری بات اطمینان سے سنی اور پھر فرمایا کہ " آپ پرسوں تشریف لائیے - میں پرچہ یہیں منگوا لوں گا - مقررہ وقت پر پرنسپل صاحب آئے تو وائس چانسلر صاحب نے فرمایا " آپ ایک تعلیمی ادارے کے پرنسپل ہیں - طلبا کے پرچے آپ بھی دیکھتے ہوں گے اور انہیں نمبر دیتے ہوں گے - میں ایک ایک سوال پڑھتا ہوں اور پھر پرچے میں لکھی

ہوئی عبارت بھی سناؤں گا ۔ آپ نمبر دیتے جائیے ۔ چنانچہ اس پر عمل شروع ہوا اور پرنسپل صاحب نے ہر سوال کے نمبر دینے شروع کئے ۔ جب میزان کی گئی تو حاصل جمع عین وہی نکلا جو پرچے پر درج تھا ۔ آپ نے فرمایا " پرنسپل صاحب ! اس دفعہ بیگم صاحبہ خوب محنت کر کے امتحان دیں تو انشاء اللہ کامیاب ہو جائیں گی اور آپ کو لاہور آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی ۔"

مارچ ۱۹۷۱ء میں مجھ پر بیماری کا ایک شدید حملہ ہوا ۔ ٹانگیں بے کار ہو گئیں ۔ جسم میں حرکت کی طاقت نہ رہی ، غذا کی نالی بند ہو گئی ۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا لیکن لاہور کے ہسپتالوں میں بستر ہمیشہ نایاب ہوتے ہیں ۔ میرا بڑا بیٹا سلیم یہ کہتا ہوا باہر بھاگا کہ میں چچا حمید کے پاس جا رہا ہوں ۔ آپ ابا جی کو لے کر میو ہسپتال پہنچیں ۔ ہماری ٹیکسی ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوئی تو البرٹ وکٹر ہسپتال کے سامنے حمید احمد خاں ایک ڈاکٹر کی معیت میں کھڑے تھے ۔ کہنے لگے وارڈ کے انچارج میرے شاگرد نکلے ۔ انہوں نے بستر کا انتظام کر دیا ہے ۔ داخلے پر معلوم ہوا کہ دس بستروں کے وارڈ میں گیارھواں بستر فالتو لگا کر میرے داخلے کا انتظام کیا گیا ہے ۔

آپ میری ڈیڑھ ماہ کی ہسپتال کی زندگی میں قریباً ہر روز پھلوں کی ٹوکری لے کر مع بھابی کے ، عیادت کو آتے رہے ۔ ایک روز شیشے کے ایک نہایت نفیس گلاس میں سیب کا رس لے آئے ۔ دوسرے روز میں نے کہا کہ آپ کا خوبصورت گلاس ٹوٹ نہ جائے ، اسے لے جائیے ۔ کہنے لگے آپ کو خوبصورت معلوم ہوتا ہے تو اسے یہیں رہنے دیجیے ۔ آپ کو اس کے استعمال میں لطف آئے گا ۔ میں نے بہتیرا اصرار کیا اور کہا کہ آپ کا سیٹ ادھورا رہ جائے گا ۔ لیکن وہ نہ مانے ۔

پھر جب میں گھر آ گیا تو یہاں بھی اسی طرح آتے رہے اور اکثر ان کے ہمراہ بھابی کے علاوہ بچے بھی ہوتے تھے ۔ ایک دن فرمایا کہ میں بچوں کو اس لئے ساتھ لاتا ہوں کہ انہیں بھی اپنے عزیزوں کے غموں اور خوشیوں میں شرکت کی تربیت ملتی رہے ۔

جناب کسریٰ منہاس

قطعہٴ تاریخ

بر وفات پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم و مغفور

چل بسے اس دیارِ فانی سے — وادریغا! حمید احمد خاں
ان کی شمعِ حیات تھی گویا — نور افروز دیدۂ عرفاں
معترف ان کے نامور نقاد — صاحبِ ذوق ان کے مرتبہ داں
ان کے چرچے رہیں گے مدت تک — زندگی، ان کی موت پر قرباں
آن کا وہ شیوۂ کرم کوشی — ان کی وہ خوے لطفِ بے پایاں
پردہٴ خاک میں ہیں در پردہ — علم و دانش کے وہ مہِ تاباں
یاد ان کی ستائے گی برسوں — ہائے! کیا تھے وہ با کمال انساں
جب ہوئی مجھ کو فکرِ سالِ رحیل — شعرِ کسریٰ ہوا یہ وردِ زباں

زیبِ باغِ جناں وہ مخزنِ علم

۱۹ ء ۷۴

روحِ خوبی حمید احمد خاں

۱۳ ھ ۹۴

جناب طاہر شادانی

باسمہٖ

قطعہ تاریخ وفات

پروفیسر حمید احمد خاں اعلی اللہ مقامہ

(۱)

چل بسے وہ حمید احمد خاں نام اُردو کا جن سے ہے زندہ
ان کی شخصیت ، اہل دانش میں علم و حکمت کی تھی نمائندہ
سالِ رحلت کے واسطے طاہر لکھ اُنہیں "گوہرِ درخشندہ"

۱۳۹۴ھ

(۲)

مردِ کامل حمید احمد خاں جس پہ نازاں رہیں گے فضل و کمال
معدنِ علم کا دُرِ یکتا تھا ادب میں جو آپ اپنی مثال
بجھ گئی آہ ! آج وہ قندیل جس سے روشن تھی بزمِ فکر و خیال
بولا ہاتف ، "خزینۂ اخلاص" میں نے پوچھا جو اس کا سال وصال

۱۳۹۴ھ

جناب کسریٰ منہاس

قطعۂ تاریخ

بر وفات پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم و مغفور

چل بسے اس دیارِ فانی سے   وادریغا! حمید احمد خاں
ان کی شمعِ حیات تھی گویا   نور افروز دیدۂ عرفاں
معترف ان کے نامور نقاد   صاحبِ ذوق ان کے مرتبہ داں
ان کے چرچے رہیں گے مدت تک   زندگی ، ان کی موت پر قرباں
آن کا وہ شیوۂ کرم کوشی   ان کی وہ خوے لطفِ بے پایاں
پردۂ خاک میں ہیں در پردہ   علم و دانش کے وہ مہِ تاباں
یاد ان کی ستائے گی برسوں   ہائے! کیا تھے وہ با کمال انساں
جب ہوئی مجھ کو فکرِ سالِ رحیل   شعرِ کسریٰ ہوا یہ وردِ زباں

زیبِ باغِ جناں وہ مخزنِ علم

۱۹۷۴ء

روحِ خوبی حمید احمد خاں

۱۳۹۴ھ

جناب طاہر شادانی

باسمہ

قطعہ تاریخ وفات

پروفیسر حمید احمد خاں اعلی اللہ مقامہ

(۱)

چل بسے وہ حمید احمد خاں نام اردو کا جن سے ہے زندہ
ان کی شخصیت ، اہل دانش میں علم و حکمت کی تھی نمائندہ
سالِ رحلت کے واسطے طاہر لکھ انہیں "گوہرِ درخشندہ"

۱۳۹۴ھ

(۲)

مردِ کامل حمید احمد خاں جس پہ نازاں رہیں گے فضل و کمال
معدنِ علم کا دُرِ یکتا تھا ادب میں جو آپ اپنی مثال
بجھ گئی آہ! آج وہ قندیل جس سے روشن تھی بزمِ فکر و خیال
بولا ہاتف ، "خزینۂ اخلاص" میں نے پوچھا جو اس کا سال وصال

۱۳۹۴ھ

پروفیسر حمید احمد خاں

غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک

یہ مضمون فروری ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا اور رسالہ "آج کل" دہلی میں چھپا۔ اس کے بعد متعدد رسالوں اور کتابی انتخابات میں چھپ چکا ہے۔

چاندنی چوک سے مُڑ کر بَلّی ماروں کے اندر کچھ دُور تک چلے جائیے تو شمسی دوا خانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ نئی کچھ پرانی عمارتیں، کچھ سنورتے کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر داہنے ہاتھ کو کوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے، اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کئے بغیر نہیں رہتے، وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں آونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے اس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے کے قریب تین شریف زادے، جو آپس میں بھائی بھائی تھے، قسمت آزمائی کے لئے بخارا سے روانہ ہوئے۔ منزل بہ منزل اٹک اور پنجاب سے گزرتے ہوئے، مٹتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اسی گلی میں آباد ہوئے جس کے نکڑ پر ہم آپ کھڑے اس وقت باتیں کر رہے ہیں۔ شہرت اور دولت ان تین بھائیوں میں سے کم از کم دو کے حصے میں ضرور آئی۔ پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ و ثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سرتاج تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک

بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا لوہارو اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا ۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے ۔ لیکن ہمارے یہاں کھڑے ہونے اور اس عام رہ گزر پر عقیدت کی آنکھوں کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ہے یا بجائے خود اس گلی کی پرانی داستان سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے ۔ ایک اور کشش ایسی ہے جو لوگوں کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی رہے گی ۔ اس کشش کو چار حرفوں کا ایک لفظ بیان کر دیتا ہے ، اور وہ لفظ ہے : غالب ۔

گلی قاسم جان کے چپے چپے کے ساتھ غالب کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے ، کسی نہ کسی منزل میں ، تعلق رہا ہے ۔ غالب کا اصل وطن آگرہ تھا ۔ لیکن ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دلی میں آ رہے تھے ۔ اس تبدیلیٔ وطن کے بعد وہ پچاس پچپن برس تک دلی میں رہے ۔ اس تمام مدت کا بیشتر حصہ انھوں نے گلی قاسم جان ہی کے کسی نہ کسی مکان میں گزارا اور اگر کبھی تھوڑے عرصے کے لئے باہر نکلنا بھی پڑا تو اسی محور کے گرد چکر کھاتے رہے ۔ لیکن غالب کی ذات سے قطع نظر ، اس تعلق کا سلسلہ خود غالب کے خاندان تک پہنچتا ہے ۔ اسی گلی میں ، شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے ، غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ہوا تھا ۔ دس پندرہ برس بعد جب غالب خود بالک دولھا بنے ہوئے عارف جان کی پوتی امراؤ بیگم کو بیاہنے آئے تو اپنی برات یہیں قاسم جان کی گلی میں لائے تھے ۔ اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد اور عزیز میت کو کندھا دیتے ہوئے جامع مسجد اور دلی دروازے کی راہ سے ، درگاہ حضرت نظام الدین کو روانہ ہوئے ۔ اس دن اسی گلی کے ایک مکان میں ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم میں جھکے ہوئے سر پر ایک سفید دوپٹہ اوڑھے اپنی اس بیوگی کے غم میں آنسو بہا رہی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوہر کی پہلی برسی کے دن موت کے ہاتھوں

ختم ہونا تھا -

سامنے کے سرے پر ، جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے ، ایک بڑی محراب نظر آ رہی ہے - اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو کی حویلی ہے - روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کا بھی مسکن تھی - اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب اٹھارہ بیس برس کی عمر میں جب ہمیشہ کے لئے دلی چلے آئے ، تو پہلے پہل چند سال تک اسی مکان میں رہے - عجیب اتفاق ہے کہ غالب کی زندگی کے آخری چند سال ایک ایسے مکان میں بسر ہوئے جو گلی کے اس دوسرے سرے پر ہے جدھر ہم مسجد اور دوا خانے کے درمیان کھڑے ہیں - دلی میں ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باہمی نسبت معنی خیز ہے - گلی کے پرلے سرے سے چل کر اس سرے تک آئیے تو گویا آپ نے غالب کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کر لیں - دلی میں ان کی زندگی لوہارو والوں کی عظیم الشان حویلی سے شروع ہوئی اور اس کھنڈر میں ختم ہوئی جس کی زیارت کے لئے ہم آپ گلی کے اس سرے پر کھڑے ہیں -

گلی میں چند قدم چلئیے تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک دوا خانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمیں ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی ہے - اندر جا کر دیکھئے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے بھر بھر کر کچھ اور مختصر ہو گیا ہے - صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے جو غالباً پشتِ مسجد کا سہارا لئے ہوئے ہیں ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لئے کھڑے ہیں - یہ ڈیوڑھی ، یہ صحن اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فرود گاہ کی یادگاریں ہیں- وہ بالا خانہ جو، خود ان کے بقول، ان کے "بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل" تھا، اب باقی نہیں رہا - بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اینٹوں کا یہ ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا - گلی کے دوسری طرف ، غالب کے دیوان خانے کے تقریباً

سامنے ہندوستانی دوا خانے سے متصل غالب کا زنان خانہ تھا ۔ یہاں اب ہندوستانی دوا خانے کا کارخانہؑ دوا سازی ہے لیکن اس کا حلیہ اب اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالب پھر کسی طرح یہاں پہنچ سکیں تو انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں خاصی دقت محسوس ہو ۔

غالب دن کا بیشتر حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے ۔ جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پا لیا ، ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اپنے بالا خانے کے دالان میں دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتے ۔ خط لکھ کر اوپر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلو بند کرکے ٹکٹ لگا دیتے تھے ۔ دوپہر کو قصے کہانی کی کوئی کتاب لے لیتے یا چوسر اور شطرنج سے جی بہلاتے ۔ کبھی عارف جان یا قاسم جان والوں میں سے کوئی لڑکا گلی میں سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بلا لیتے ۔ تھوڑی دیر اسی سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے کچھ اپنا مگر زیادہ اس کا دل خوش کرتے ۔ گرمیوں میں دوپہر کو بالعموم سو جاتے تھے ۔ سہ پہر کو اٹھتے تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر اس ڈیوڑھی میں ہوتیں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے ۔ اسی ڈیوڑھی میں مونڈھے پڑے رہتے تھے ۔ غالب بالا خانے سے نیچے آترتے ۔ دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت اور سہولت کے لحاظ سے جمع ہوتے اور یہیں بیٹھتے ۔ غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر جو لال کھاروے سے منڈھا ہوا تھا ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے ۔ چپلیں آگے پڑی رہتیں ۔ ذرا دائیں ہاتھ کی طرف حقہ ہوتا ۔ غالب اس عمر میں اونچا سننے لگے تھے ۔ جب کوئی شخص بات کرتا تو سننے کے لئے کان اس طرف کو جھکا دیا کرتے تھے ۔ ملنے والے اگر کہیں قریب سے آتے تو پیدل چلے آتے تھے ۔ فاصلے سے آنے والوں میں پابند وضع بزرگ پالکی میں تشریف لاتے ۔ پالکی دروازے کے سامنے رکی ، وہ بزرگ نیچے اترے ۔ غالب نے ذرا دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے میں (لفظوں کو خوب پھیلاتے ہوئے) کہا، ”آئیے ، آئیے ! آپ کا مزاج اچھا ہے ؟“

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حرم سرا

میں زندگی کا کیا نقشہ تھا جہاں غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقۂ حیات کے دن گزرتے تھے ؟ غالب کا ہر روز کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے ۔ یہاں وقت کس طرح گزرتا ، کیا باتیں ہوتیں، کیا قصے قضیے طے ہوتے ، ان تفصیلات پر بظاہر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے پہلے اسی گلی قاسم جان کے اندر لوہارو والوں کی اس حویلی میں جس کا ذکر ابھی آ چکا ہے ، ایک سن رسیدہ بی‌بی موجود تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی کے آخری دور کا یہ پہلو اپنی آنکھوں دیکھا تھا ۔ یہ بی‌بی عارف جان کی پرپوتی ، غالب کے دوست نواب ضیاء الدین خاں نیرِّ رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین‌العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بِگّا بیگم تھیں ۔ مجھے جولائی ۱۹۳۸ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بِگا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا ۔ بِگّا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں ۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر حکیم صاحب اور میں بیٹھ گئے ۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کئے جن کا جواب بِگّا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کی عمر اُس وقت نوے برس کے لگ بھگ تھی ، مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا ۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں ۔ گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساسِ ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے ۔ میں ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔

جو کچھ میں نے ان سے سنا ، اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بِگّا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لئے قابلِ قدر ہیں ۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ

کی عمر نہ پائی ۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (اور قاسم جان کے پرپوتے) زین العابدین خاں عارف کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا ۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا صاحب کے اُردو اور فارسی کلام دونوں میں موجود ہے ۔ جب عارف کا انتقال[1] ہو گیا تو غالب ان کے دونوں بیٹوں ، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو اپنے پاس لے آئے اور انھیں اسی لاڈ پیار سے رکھا جس سے اپنی اولاد کو رکھتے[2] ۔ بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی ۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی ، وہ یہی بگّا بیگم صاحبہ تھیں۔ ان تمام رشتوں کی کیفیت ذیل کے شجرے سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی :

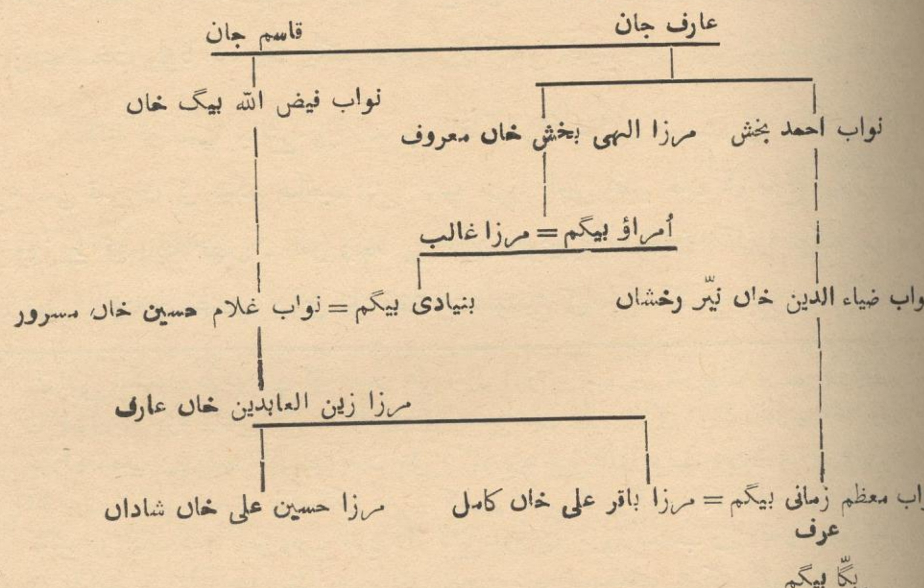

۱- ۱۸۵۲ء میں

۲- غالب کے اُردو خطوں میں اس کی طرف جابجا اشارے ملتے ہیں ۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط (بنام میر مہدی مجروح) میں لکھتے ہیں : ”لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو ، چاہو اپنے گھر جاؤ ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں ۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں ۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی ۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں ، یہ ہم روزہ خوار ہیں ، وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے : ’کھلونا منگا دو ۔ میں بھی بجار جاؤں گا۔‘“

بگّا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے: میں

اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لئے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے - کہیں کہیں جہاں آنھوں نے قیافے سے بات کی ہے ، ان کا بیان درست نہیں ہے (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق) مگر جو باتیں آن کی دیکھی ہوئی تھیں ، ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی - مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا تو فوراً بولیں : "سہج سہج چلتے تھے ، بڈھے تھے ، اسی برس کی عمر تھی-" ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً درست ہے - لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے-

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد تھے ، اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں - اس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی[1]- چنانچہ غالب بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ

نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے - پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت نازبرداری ہوتی - مرزا صاحب نے کہا ''ارے حسین علی آ کر پڑھ لے'' انھوں نے جواب دیا '' دادا جان، آتا ہوں-'' اور دوسری طرف نکل گئے - کھیل تماشے کا تو انہیں لپکا تھا - کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دئیے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوا دیجئے - مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا ''بھئی ، انہوں نے ایک پتھر اور مارا- دیدے بیس روپے-''

خضر مرزا مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا : ''ایک دن میں چلا جاتا تھا - بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے - مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی ''ابے لمڈو ! یہاں آؤ -'' ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لیے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے- میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا- ''ابے یہ کیا ! منہ سے کہا، میرے مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں !''

۱- اس ضمن میں ''یادگار غالب'' کی متعلقہ عبارت بھی پڑھنے کے قابل ہے -

بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے !" مگر یہ جھگڑا محض رندی و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا ۔ جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلاف مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا ۔ چنانچہ خود بگّا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی ۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں ۔ ان سے کہتی تھیں : "بیٹی تُو تو بچہ ہے بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر ، بڈھا تو دیوانہ ہوگیا ہے !"

اسی قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے ۔ ایک روز عصر کے بعد وہ واپس آئے ۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں ۔ وہ بھی اسی تخت پر نکڑ پر ہو بیٹھے ۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے : "واہ وا ! خوب ! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا ۔ کمہاری بونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے !"

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ برسات کے دن تھے ۔ مینہ بہت برسنے لگا ۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے ۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا ۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے ۔ میں یوں بیٹھی تھی ، گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی ۔ کہنے لگے : "ایک بیوی ، دو میں ، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا ! بہو ، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں ، تم کیوں بیٹھی ہو ؟" اس پر میری ساس بولیں : "اے توبہ ! بڈھا تو دیوانہ ہے ۔ اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہیے ۔ اب بہو ہی مل گئی ۔" میں اتنے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی ۔ اب انھیں یہ فکر کہ برسات کے دن ہیں اور کیڑے پتنگے کا موسم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں : "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا بُرا مانے گی !"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے ۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے

تھے ۔" نوکروں میں کلّو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا : "کلّو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے ۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے ۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آ کر رہے ۔ کلو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں ، بہویں ہیں یا بوڑھیاں۔ ایک اور نوکر مدار خاں تھا ۔ ان دونوں کا بیاہ آنھوں نے خود کیا ۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے ۔ میں نے سنا ہے ۔ مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا ۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا ۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلّو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا ۔"

"کھانا ایک وقت کھاتے تھے ۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے ، دال مربہ ، پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن[1] ۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے ۔ پکانے والا کون تھا ؟ ددا تھیں ۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے ۔ میں نے انھیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا ۔ چنے کی دال بیسن کڑھی پھلکیاں بہت کھاتے تھے ۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی ۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی ۔ مجھے پسند نہیں تھی ۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال ۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے۔ کہنے لگے : "ددا ، یہاں تو آ" ددا گئیں تو ان سے کہا : "پیسے نہیں تھے تیرے پاس ؟ بہو کی پسند کی چیز پکا لی ہوتی ۔" ددا نے جواب دیا : "نہیں ، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں ۔" بولے : "اوہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو ؟ توبہ توبہ !" پھر میری ساس سے کہنے لگے : "بیوی سنو" وہ بولیں : "میں نہیں سنتی !" اس پر مجھ سے کہا : "بیٹی، برا نہ مانیو ۔ ایک بات سناتا ہوں ۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں ۔ بھونتے ہیں ، تلتے ہیں ، آبالتے ہیں ، پیستے ہیں ۔ آخر میرا گناہ کیا ہے ؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا ، "دور ہو ۔ نہیں تو میں بھی تجھے

---

۱ ۔ بگّا بیگم صاحبہ نے قدرتاً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا لیکن عجب نہیں یہ حلوا سوہن ہی شراب کا قائم مقام ہو ۔

کھا جاؤں گا !"

یہ بات سناتے ہوئے خود بھی ہنستی رہیں ۔

میں نے پوچھا " مرزا صاحب کی یادگار کی کوئی چیز آپ کے پاس ہے ؟"
کہنے لگیں :" مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح ڈھونڈیں گے ؟ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ہے ۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے ۔" جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں : " ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا ؟ جہاں بیٹھے اسی مذہب میں ہو گئے ۔" میں نے یہ بھی پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا : "میں نے تو انھیں بہرا ہی دیکھا۔ جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے ۔ " غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا : " سرس کی گلی میں مارے گئے تھے[1] ۔ مسجد تہور خاں میں دفن ہوئے ۔" میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا: " دیوان خانے میں، جہاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ہے ۔ اس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب وہیں تھے ۔"

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا صاحب نے کس مرض میں انتقال کیا، بگّا بیگم صاحبہ نے کہا : " وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں ۔ بس مر ہی گئے ۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے ۔ چندو بیگم[2] کو بہت چاہتے تھے ۔ پوچھا " جیون بیگ کہاں ہیں ؟ بلاؤ" احمد بیگ ان کے خادم تھے ، انھیں بھیجا ۔ مرزا صاحب کہنے لگے ۔ " اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں گا ۔" یہ کہہ کر لیٹ گئے ۔ کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بےہوش ہو گئے ۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا ۔"

۱۔ فتح دہلی کے بعد ۱۸۵۷ء ۔

۲۔ بگّا بیگم صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کا عرف ہے جو اس وقت عمر کے چوتھے سال میں تھیں۔ مرزا غالب انھیں محبت سے ''جیون بیگ'' کہتے تھے۔ ان کی شادی نواب شجاع الدین خاں سے ہوئی ۔

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا : "جب میں بیاہی گئی تو وہ امچور کی پھانک تھیں ۔ جا نماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں : "اے اللہ ! تو کب بلائے گا ۔" ایک روز میں نے پوچھا : "پھوپھی جان ، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا ؟" کہنے لگیں : "بیٹی تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے ۔"

یہ ہے اُن معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔
(نظر ثانی : ۱۵ اپریل ۵۲ء)

ڈاکٹر وزیر آغا

آہ! حمید احمد خاں

آج سے صرف چند روز پہلے کی بات ہے کہ کوہِ ندا سے پروفیسر حمید احمد خاں کا نام پکارا گیا۔ وہ اٹھے اور اس منحوس آواز کی ڈور سے بندھے ہوئے زندگی کے پہاڑ کو عبور کر گئے۔ مگر جس مقام پر وہ پچھلے ستر برس سے کھڑے تھے وہاں اب روشنی کا ایک ہالہ سا موجود ہے۔ میں جب ان کے رخصت ہونے کی خبر سن کر اس منور ہالے میں داخل ہوا تو یادیں شہد کی مکھیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑیں۔ یہی یادوں کا وصفِ خاص بھی ہے کہ ان کے ہونٹوں پر شہد مگر پہلو میں نیش سدا موجود رہتا ہے۔ وہ حلاوت اور شیرینی بھی مہیا کرتی ہیں اور خلش بھی! یا شاید اصل بات یہ ہے کہ اس خلش ہی میں شیرینی موجود ہوتی ہے۔

یادوں کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ میں سادہ ورق پر صرف ان چند نقوش کو ابھارنے پر ہی اکتفا کروں گا جن کا میری اپنی ادبی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ میں جب ۱۹۵۸ء میں پروفیسر صاحب سے متعارف ہوا تو پہلا تاثر میں نے یہ قبول کیا کہ وہ ادب ہی نہیں زندگی کے دیگر جملہ معاملات میں بھی انتہائی باقاعدہ اور Thorough ہیں۔ تمام زندگی میں انسان بعض معاملات میں پوری طرح باقاعدہ اور سنجیدہ ضرور ہوتا ہے لیکن دیگر بے شمار معاملات کو محض چھو کر گزر جاتا ہے۔ حمید احمد خاں کے ہاں میں نے یہ بات دیکھی کہ وہ "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ" کے قائل نہیں تھے گو راہبر بالخصوص نام نہاد راہبر کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جب ایک بار کسی راہرو کے قدموں سے قدم ملا کر چل پڑتے تو پھر یہ اکثر و بیشتر عمر بھر کا ساتھ ہوتا تھا۔ اسی طرح جب وہ ایک بار کسی کام کا بیڑہ اٹھا لیتے تو پھر اسے پوری سنجیدگی اور عزم کے ساتھ

سر انجام دیتے - میری یہ دلی آرزو تھی کہ وہ میرے پی ایچ - ڈی - کے مقالے کا دیباچہ لکھیں جو آن دنوں کتابی صورت میں شائع ہونے کے لیے تیار تھا - انہوں نے حامی بھر لی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ مسودہ پڑھنے کے علاوہ مقالے کے بارے میں مجھ سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد ہی کچھ لکھ سکیں گے - کئی ہفتے مقالہ آن کے زیر مطالعہ رہا - پھر وہ چند روز کے لئے میرے پاس لاہور سے تقریباً سو سوا سو میل دور ، سرگودھا کے ایک دور آفتادہ گاؤں میں تشریف لائے اور وہاں نہر کے کنارے سیر کرتے ، کھیتوں میں گھومتے اور درختوں کے سائے میں چہل قدمی کرتے ہوئے انہوں نے اس کتاب کے مندرجات کا پوری طرح جائزہ لے ڈالا - وہ بعض حصوں کی تعریف کر کے میرا دل بڑھاتے - پھر بعض حصوں کے بارے میں مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے - ان کی اس طویل کاروائی کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ موضوع کے متعدد پہلو ایسے بھی تھے جن پر نئے نئے زاویوں سے مزید روشنی ڈالی جا سکتی تھی - لاہور واپس آ کر انہوں نے کتاب کے لئے ایک نہایت خیال انگیز دیباچہ لکھا اور موضوع کے بہت سے نئے امکانات سے مجھے آگاہ کیا - حقیقت یہ ہے کہ اگر حمید احمد خاں میری اس ابتدائی کتاب کے بارے میں مجھ سے یوں کھل کر باتیں نہ کرتے اور مجھے موضوع کے جملہ امکانات کو گرفت میں لینے کا درس نہ دیتے تو تحقیق و تنقید کی طرف اپنا رویہ ایک طرفہ اور ادھورا ہی رہتا -

میں نے خاں صاحب کے ہاں یہ عجیب بات دیکھی کہ اپنے موضوع کے سلسلے میں تو وہ زیادہ سے زیادہ معلومات اور حقائق جمع کرنے کے عمل کو ایک ادبی مشن قرار دیتے تھے (غالب پر انہوں نے جو اعلی پائے کا کام کیا ہے وہ اس طریق کار کا زندہ ثبوت ہے) مگر ان معلومات اور حقائق اور ان کے بارے میں اپنے مخصوص اور بخیل زاویہ نگاہ کا اظہار کرنے کے دوران میں مترادف الفاظ ، آرائشی تراکیب اور فاضل جملوں کو اپنی تحریر سے خارج بھی کرتے تھے - کفایتِ لفظی کے اس منفرد رحجان نے آن کے اسلوب میں ایک عجیب سی چاشنی پیدا کر دی تھی- وہ الفاظ کا انتخاب آن کی نمائشی استعداد یا آن سے اپنی کسی جذباتی وابستگی کی بنا

پر نہیں کرتے تھے اور نہ وہ اُس بات کی اجازت دیتے تھے کہ الفاظ اُن پر حاوی ہو جائیں بلکہ وہ تو اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے جیسا کہ ایک دور اندیش اُستاد اپنے شاگردوں سے کرتا ہے ، یعنی کسی کو تھپکی کسی کو سرزنش ، کسی کو بینچ پر کھڑے ہونے اور کسی کو کلاس سے باہر نکل جانے کا حکم ۔ چنانچہ اس لئے اُن کے اسلوب میں نہ کوئی شے فاضل ہوتی اور نہ کم ۔ ایک روز میرے ہاں تشریف فرما تھے ۔ میں نے پوچھا " خاں صاحب، آپ کا ایک خاص اسلوب ہے جو اُردو کے آرائشی اسالیبِ بیاں سے بالکل مختلف ہے ۔ یہ اسلوب آپ کو کہاں سے ملا ؟" مسکرائے ۔ پھر کہنے لگے۔ اس کا بھی ایک قصہ ہے ۔ میرے ایک انگریز اُستاد تھے ۔ میں نے ایک بار انگریزی میں ایک جواب مضمون انھیں لکھ کر دکھایا تو میرے ایک فقرے :

It was raining cats and dogs.

کو پڑھ کر مجھ سے پوچھنے لگے :

Hamid ! what do you mean by that?

میں نے کہا :

Sir ! I mean it was raining heavily.

تو کہنے لگے ،

Then say so.

بس اس ایک اشارے سے میں نے موڑ توڑ کر بات کہنے کے عمل کو رخصت کیا اور زبان کو اُس کی واقعی صورت میں استعمال کرنے لگا ۔

حمید احمد خاں صاحب تو یہ لطیفہ سنا کر رخصت ہوئے مگر میرے ذہن میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا ۔ اس واقعہ کے بعد خود میرے ادبی اسلوب میں آہستہ آہستہ تبدیلی آتی چلی گئی ۔ آج سے چند برس پہلے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی ایک ادبی تقریب میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ میری کتاب "تخلیقی عمل" زیر بحث تھی۔ خاں صاحب بولے : "ایک مدت سے میری یہ آرزو تھی کہ علمی کتاب کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا جائے ۔ آج یہ آرزو پوری ہوئی" ـــــ یہ بات انھوں نے بالکل

روا داری میں کبھی لیکن میں آن سے یہ نہ کہہ سکا کہ خاں صاحب یہ آپ ہی کی عطا ہے اور آس کا سلسلہ اس شام تک پھیلا ہوا ہے جب آپ نے مجھے اپنے " جواب مضمون " والا لطیفہ سنایا تھا ۔

کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ حمید احمد خاں صاحب کو روحانیت سے ایک خاص شغف تھا ۔ جب کبھی انہیں محسوس ہوتا کہ شہر لاہور میں شور زیادہ ہو گیا ہے اور اخبارات اس شور کو پھیلانے میں پوری جانفشانی سے مصروف ہو گئے ہیں تو وہ مولانا صلاح الدین احمد کو ٹیلی فون کرتے اور پھر یہ دونوں دوست چپکے سے لاہور اور اہل لاہور کو بتائے بغیر ٹرین میں سوار ہو جاتے۔ وہاں وہ میرے والد صاحب کو ملنے کے لئے جاتے تھے ۔ اور یہ ٹرین چند گھنٹوں میں آنہیں ہمارے گاؤں میں پہنچا دیتی ۔ میرے والد صاحب کی ساری زندگی تصوف کے مطالعہ میں گزری تھی اور وہ بہت سے روحانی مدارج سے آشنا بھی تھے ۔ میں نے اکثر دیکھا کہ گرمیوں کی دوپہر میں خاں صاحب ، مولانا صاحب اور والد صاحب صدیوں پرانے بڑ کے سائے تلے بیٹھے ہیں اور ہولے ہولے بڑی گہری اور گوڑی باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایسی ہی ایک سبھا کے بعد خاں صاحب نے مولانا سے کہا تھا ـــــ

" مولانا ! میں تو خود کو پھول کی طرح ہلکا محسوس کرنے لگا ہوں ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟" جس کے جواب میں مولانا نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا اور خاں صاحب کا ہاتھ پکڑ کر بڑے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا تھا ۔ آخری بار آج سے تقریباً دو برس پہلے خاں صاحب ہمارے گاؤں تشریف لائے ، لیکن اب مولانا آن کے ہمراہ نہیں تھے ۔ دوسری طرف اب والد صاحب بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے ۔ چنانچہ خاں صاحب آن کے مزار پر فاتحہ پڑھنے اور بڑ کے نیچے گھنٹہ بھر چپ چاپ بیٹھنے کے بعد واپس آ گئے ۔ اس کے بعد گاؤں میں آن کے لئے کشش باقی نہ رہی ۔ پچھلے دنوں جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ خاں صاحب بھی رخصت ہو گئے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مثلث جسے والد صاحب ، مولانا صاحب اور خاں

صاحب کی شخصیتوں نے مرتب کیا تھا ، اب اپنے آخری خطِ مستقیم سے بھی محروم ہوگئی ہے ۔ مگر وہ مقام جس کا احاطہ اس مثلث کے مستقیم خطوط نے رکھا تھا ، آج بھی درخشاں ہے اور میں اگر چاہوں تو محض اپنی آنکھوں کو ذرا سا میچ کر اس کی تابانی کو گم کر سکتا ہوں ۔

———

جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری

گزرے دنوں کی باتیں

ہاں ! ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو میت دفن کر دینے کے بعد دوسرے سوگواروں کی طرح میں بھی پلٹ آیا تھا - اپنے دور کے اس نابغۂ علم کی یاد میں قائم ہونے والی بزم "مجلسِ حمید احمد خاں" کے احباب میں، میں بھی موجود تھا۔ گیارہ مہینے گزر گئے - مجھے چپ لگی رہی -

اُن کے شاگردوں اور رفیقوں نے اور عالی پایہ صاحبانِ قلب و نظر نے اُن کی رحلت پر اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے - حمید احمد خاں کے حسنات اور ذات اور صفات نے ساری ملتِ پاکستان کو ایک روشنی عطا کی ہے -

اب تک میرے قلم سے یا زبان سے کچھ نہیں نکل سکا - وہ میرے پرانے دوست اور ساتھی تھے - اُن کے ساتھ گزری ہوئی محفلیں یاد آتی ہیں اور دل یقین نہیں کرتا کہ حمید احمد خاں ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے ہیں - اور اُن کے بعد اور پرانے دوست بھی ، جن سے حمید احمد خاں کی طرح پیار کی رسم و راہ تھی ، اسی منزل کی طرف رخ کرتے نظر آئے جس منزل کی طرف حمید احمد خاں روانہ ہوئے تھے۔ میں دیکھتا رہا -

آج اسلامیہ کالج کے مجلہ "فاران" کے لئے یہ چند سطریں لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا ہے - حمید احمد خاں اور میرے مابین مراسم کی بے شمار یادیں اسلامیہ کالج سے وابستہ ہیں - پہلے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے، جب اسلامیہ کالج ایک تھا اور پھر اسلامیہ کالج سول لائنز سے، جب کالج کے دو حصے ہوئے۔

میں نے سب سے پہلے حمید احمد خاں سے شناسائی کا شرف حیدر آباد دکن میں حاصل کیا تھا - وہ ان دنوں وہاں اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے اور پنجاب واپس

آنے کی تیاریوں میں تھے - مجھے ایک مشاعرے میں سن کر میری اقامت گاہ پر ایسے شوق کے ساتھ ملنے آئے اور میرے اشعار کی داد اس خلوص کے ساتھ دی کہ میں اُن کی سخن فہمی پر تعجب کرنے لگا - اسی ملاقات میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اس عالی پایہ بزرگ مولانا سراج الدین احمد خاں کے فرزند ہیں جن کے فرزند اکبر مولانا ظفر علی خاں نے ہمارے قلوب کو حرارتِ ایمانی عطا کی ہے -

لاہور میں انگریزی کا ایم- اے- کر لینے کے بعد اسلامیہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے - اس کالج میں ان کی موجودگی تک ان گنت تقاریب مجھ سے بھی تعلق رکھتی ہیں - پروفیسر تو وہ انگریزی کے تھے لیکن اس کالج میں اُردو زبان اور اس کے شعر و ادب کی ترقی کے لئے ہر بزم اور محفل میں پیش پیش ہوتے تھے - بارہا وہ مجھے اسلامیہ کالج کی محفلوں میں لے گئے اور میرا ذکر بہت اچھے لفظوں میں کرتے - میں آج بھی اس شخص کی حوصلہ افزائی سے فخر سا محسوس کر رہا ہوں -

ڈاکٹر تاثیر میرے دوست تھے ، وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہوئے تو یہ دونوں مجھے آئے دن اُردو ادب کی ہر تقریب میں جو اساتذہ اور طلبا پر مشتمل ہوتی ، میرے گھر کے فرش سے اُٹھا کر شہرت کے فرش پر لا بٹھاتے - صورتِ حال یہ ہو گئی ، یگانگی اتنی بڑھ گئی کہ ڈاکٹر تاثیر ، پروفیسر حمید احمد خاں ، پروفیسر منیر ، ڈاکٹر سعید اللہ ، پروفیسر عبدالواحد اور یہ خاکسار ، کوئی تقریب ہو نہ ہو ہفتے عشرے مل بیٹھنے کے بغیر چین نہ پاتے تھے - کبھی یہ سب میرے دفتر "مخزن" میں، کبھی تاثیر کی بیٹھک بارود خانے میں اورکبھی حمید احمد خاں کے گھر پر مل بیٹھتے تھے - شعر و ادبی لطائف ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ڈاکٹر سعید اللہ کی فلسفیانہ بحثیں اور تاثیر کے چھیڑنے پر قہقہے بھی بلند ہوتے تھے، اور حمید احمد خاں اپنی با ضابطہ مسکراہٹ کے ساتھ اس گفت و شنید اور بحث کے فیصلے کا حکم لگا دیتے تھے -

دسمبر کی تعطیلات کے دن تھے - حمید احمد خاں اپنے گاؤں کرم آباد چلے گئے تھے - ایک دن مجھے اُن کی طرف سے ایک رقعہ ملا - اس میں لفظ زیادہ نہ تھے ،

محبت بھرا حکم تھا ۔ میں اٹھا اور جا کر تاثیر ، پروفیسر منیر اور ڈاکٹر سعید اللہ کو پکڑا ۔ لاہور ریلوے سٹیشن سے گاڑی میں بیٹھے اور وزیر آباد کے پلیٹ فارم پر جا اترے ۔ بارش ہو رہی تھی اور سخت سردی تھی ۔ برساتی میں ملفوف ، سر پر کنٹوپ ، دو بازو پھیلے ہوئے ، دو آنکھیں مسکراہٹ کا نور بکھیرتی ہوئیں ، باری باری ہم سب کو لپٹ رہی تھیں۔ یہ تھے حمید احمد خاں۔ اولے پڑ چکے تھے مگر یہ ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ وزیر آباد سے تانگے لئے اور ان پر لدے ہوئے ہم دو میل کا سفر طے کر کے سرد ہوا اور پھوار کو سوں سوں کی راگنی سناتے ہوئے اور قہقہوں سے گرماتے ہوئے کرم آباد پہنچ گئے ۔ ایک باغ کے پھاٹک پر اترے اور سامنے کے بنگلے میں چمن کی روش کو روندتے ہوئے داخل ہوئے اور ایک وسیع ہال میں لے جا ڈالے گئے ۔ آتشدان میں جلتی ہوئی آگ ہی نہیں بلکہ چائے کے بجائے گرم گرم یخنی ہماری ٹھر ٹھر کو گرمانے لگی ۔

دو دن اور دو راتیں یہ قافلۂ احباب اس خاندان کا مہمان رہا جس نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو اپنے علم و فضل سے ہندو اور انگریز سے آزادی کی راہ دکھائی تھی اور دو دن یہاں لطائف و ظرائفِ علم اور ادب و فن و انشا کی محفل جمی رہی ۔ البتہ طعام اور طعام کے بدل میں حفیظ جالندھری کو ہر مرتبہ اپنا کلام سنانا پڑتا تھا ۔

آہ کہ پھر نومبر ۱۹۵۰ء میں تاثیر کا اچانک انتقال ہو گیا ۔ حمید احمد خاں اس وقت اسلامیہ کالج کے مجلہ " کریسنٹ " کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی فرمائش پر میں نے کریسنٹ کے تاثیر نمبر کے لئے ایک نظم لکھی ۔ اس نظم کا آغاز میں نے حمید احمد خاں کو مخاطب کر کے یوں کیا تھا :

اے رفیقِ شفیقِ ہم سفراں　　میرے پیارے حمید احمد خاں
یاد ہوگا تجھے کہ اک شب و روز　　چند احباب تھے ترے مہماں
کرم آباد ـــــ باغ اور بنگلہ　　پُر تکلف ، وسیع دستر خواں
ہم میں تاثیر بھی تھا اور بھی تھے　　خوش مذاق اہل علم و فن و لساں

میں تو شاعر ہی تھا مگر تم سب نقد و حکمت کے بحرِ بے پایاں
اور وہ گفت و شنید کا سیلاب ہائے وہ قہقہوں کا اک طوفاں

میں یہ ساری نظم لکھنا نہیں چاہتا۔ میرا اس وقت کا لکھا ہوا ایک شعر اسی نظم میں موجود ہے جو میرے اور حمید احمد خاں کے تعلقات پر حاوی ہے۔

اک زمانہ اسی روش پر تھے
ہم علی الرغم جورِ دورِ زماں

بعد میں حمید احمد خاں اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور پھر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں کالجوں اور سکولوں میں جا کر نوجوانوں کو شاہنامۂ اسلام اور پاکستان کے لئے جو نظمیات ہیں وہ سناؤں۔ جب وہ پرنسپل تھے تو اس کے لئے انھوں نے مجھے کئی دفعہ کالج میں بلایا اور میں گھنٹوں طلبا سے خطاب کرتا اور ان کو اپنی نظمیں سناتا۔ حمید احمد خاں جلسوں اور مشاعروں میں میرا تعارف طلبا سے اس طرح کراتے جیسے میں اردو زبان کا ایسا شاعر ہوں ، ایسا انشا پرداز ہوں جس کے اشعار اور افسانہ نویسی طلبا کے لئے فائدہ مند ہیں۔ آج یہ لفظ لکھتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔

حمید احمد خاں مجھ سے کہتے تھے کہ پاکستان میں بعض لوگ پاکستان دشمن اور اسلام دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے اور ملک میں "ففتھ کالم" (Fifth Column) کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ طرح طرح کے طریقوں سے اسلام اور پاکستان کے خلاف فضا پیدا کر رہے ہیں جو ملک و قوم کے لئے اچھی نہیں ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں سارے پاکستان میں سکولوں اور کالجوں میں طلبہ اور طالبات سے خطاب کروں اور انھیں اپنا کلام سناؤں۔ حمید احمد خاں کا طریقِ کار یہی تھا کہ وہ گندگیاں صاف کرنے کے لئے بارانِ رحمت برسانے کے طریق اختیار کرتے تھے۔ وہ جھگڑالو نہیں تھے۔ اپنے اصول کو اپنے کردار و رفتار و گفتار کے ذریعے پیش کرنے کے عادی تھے۔ حمید احمد خاں کی تحریک پر میں کالجوں اور سکولوں میں جا کر یہ فرض ادا کرتا رہا ہوں۔

میں امید کرتا ہوں کہ خدا مجھے اس حالت علالت سے تھوڑی بحالی عطا کرے کہ میں پھر ایک بار قوم کے بچوں کی کوئی خدمت کر سکوں جو حمید احمد خاں کی یاد دلاتی رہے - باقی رہی ان کی یادگار ، میری نظر میں یہ جو آن کا پیکر مٹی میں دفن ہوا ہے، میرا ہے - وہ روح جو پیکر میں بند رہ کر ملک و ملت پر نورافشانی کر رہی تھی وہ اب آزاد ہے اور آپ سب نوجوانوں کے وجود اس سے مستفید ہو رہے ہیں - حمید احمد خاں کی یادگار کتابوں کے صفحات میں بھی ہے اور آپ سب نوجوان بھی اپنے قلب و نظر کو ان کے حسنات سے معمور کئے ہوئے حمید احمد خاں کی یادگار ہی تو ہیں - خود میں اپنے پیکر کو اسی فرشتے کے سپرد کرنے کا منتظر ہوں جو حمید احمد خاں کے پیکر کو اٹھا لے گیا ہے -

وہ خاکی جسم بھی آس کا بہت ہی بیش قیمت تھا
جسے تم جلوہ سمجھے تھے وہ پردہ بھی غنیمت تھا

پروفیسر حمید احمد خاں

اسلامیہ کالج کی پنج سالہ کارگزاری کا جائزہ

(روداد سالانہ)

اسلامیہ کالج کا ایک جلسۂ عطائے اسناد و انعامات ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء کو ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ، وائس چانسلر ، سندھ یونیورسٹی ، کی صدارت میں منعقد ہوا - پروفیسر حمید احمد خاں (پرنسپل) نے جو سالانہ روداد اس موقع پر پیش کی ، ذیل کے اقتباسات اُس سے ماخوذ ہیں۔

صدر محترم ، خواتین و حضرات ،

کالج کا سالانہ جلسہ اس لحاظ سے بڑی مبارک تقریب ہوتا ہے کہ کالج کے ہمدرد و بہی خواہ از راہِ اخلاص و عنایات یہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں اور اساتذہ و طلبہ کی کارگزاری کا بیان سن کر گویا ہمارے رنج و راحت میں شریک ہوتے ہیں - ہماری کارگزاری کا یہ بیان لازماً ایک روکھی پھیکی روداد کی شکل اختیار کرتا ہے کیونکہ درس و تدریس کی دنیا کے ہنگامے قدرةً کتاب ، قلم اور دوات تک محدود ہوتے ہیں - اس بے آب و رنگ دنیا کی سیر کے لئے صرف وہی قدم اُٹھتے ہیں جن کے ساتھ ساتھ محبت کی روشنی چلی آتی ہو - کالج میں آج سہ پہر آپ کی آمد اسی شانِ کرم گستری کا ثبوت ہے ، اور ہمارے دل آپ کے اس احسان کے شکریے سے لبریز ہیں - اربابِ فضل و کمال کے اس مجمع میں کالج کے یارانِ قدیم کے علاوہ ہماری تعلیمی و تہذیبی زندگی کے عمائد اور ہمارے بعض انگریز احباب بھی رونق افروز ہیں - ان سب کی موجودگی ہمارے لیے صد گونہ مسرت کا باعث ہے -

لیکن خود آپ کی نوازشات پر ، جنابِ صدر ، ہمارے حقوق کی نوعیت ذرا مختلف ہے - آپ نے اپنی زندگی میں طالب علم ، معلم اور ماہرِ تعلیم ، تینوں حیثیتوں

سے ایک ایسی روشن مثال قائم کی ہے جس سے ہمارے ملک میں ہزاروں شمعیں فروزاں ہونی چاہییں - ہمارے طلبہ و اساتذہ عرصہٴ دراز سے اس موقع کے منتظر تھے جو آج آپ کی تشریف آوری سے میسر ہوا ہے - اس جلسے کے نوجوان حاضرین کے لیے آپ کے زمانہٴ طالب علمی کا تذکرہ ایک نئے اندازِ حیات کا پیغام بننا چاہیے ، اس لیے میں ان کی خاطر کم از کم اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ نے اوائل عمر ہی میں اپنے انہاک اور فراست کی بدولت سائنسی علوم ، بالخصوص ریاضی ، میں قابلِ ذکر امتیازات حاصل کیے - جب معلمی کی زندگی کا آغاز ہوا تو درس و تحقیق کے دونوں متصل میدانوں میں آپ کے کارناموں کا شہرہ اس برِ عظیم سے باہر کے علمی حلقوں تک پہنچا اور آپ کے فلسفیانہ مقالات نے ہماری قومی زبان کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا - پشاور اور حیدر آباد کی یونیورسٹیاں جنھیں آپ کی قیادت کا شرف حاصل ہوا ، آپ کے حسنِ تدبیر کی شاہد ہیں - پاکستان کے نظام تعلیم کو محکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے آپ نے گزشتہ پانچ برس میں جو خدمات سر انجام دیں ، اُن کو تاریخی اہمیت حاصل ہے - الغرض آپ کا ذاتی اور علمی کمال خود سفارش کرتا ہے کہ اسلامیہ کالج جیسی قدیم قومی درس گاہ کو آپ کی عنایت اور توجہ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملے -

جنابِ والا ، اس ضمن میں ایک اور استحقاق بھی ہے جس کی حیثیت ذاتی ، بلکہ جذباتی ، قرار پائے گی ، لیکن مجھے بجا طور پر یقین تھا کہ آپ کا خلقِ کریمانہ اُس پرانے تعلق کو نظر انداز نہ کرے گا جو آپ کے اور میرے درمیان ایک مشترک تعلیمی نسب نامے کی بنا پر قائم ہے - جہاں دنیا کو یہ معلوم ہے کہ آپ اُس باغ کے گلِ سر سبد ہیں جسے اب ناچار مرحوم جامعہٴ عثمانیہ کا نام دینا پڑتا ہے ، وہاں مجھے بھی فخر ہے کہ میں اُسی اُجڑے ہوئے باغ کی گیاہِ ناچیز ہوں ، اور اس نسبت کی بنا پر سعدی نے مجھے آپ سے یہ کہنے کا حق دیا ہے کہ ع

صحبت نہ کند کرم فراموش !

گر نیست جمال و رنگ و بویم　　آخر نہ گیاہِ باغ اویم ؟

حمید احمد خاں

آنیس سو تیسوں میں

شیخ منظور الٰہی (سیکریٹری وزارت تعلیم) کے ساتھ کالج میں (۱۹۶۳ء)

تصویر میں پروفیسر خواجہ غلام صادق اور (بائیں طرف)

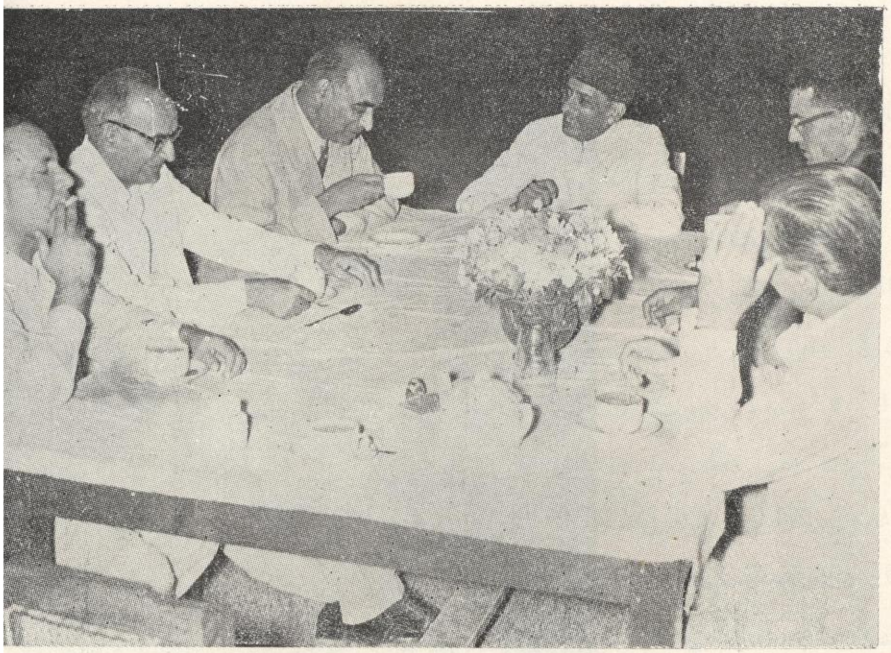

چودھری محمد علی اسلامیہ کالج میں (۱۹۶۲ء)
بائیں سے : شیخ عبدالمجید اصغر ، چودھری محمد علی ، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اختر
اور پروفیسر حمید احمد خاں

فرانس کے صدر پامپیدو کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں
پامپیدو اس وقت فرانس کے اور بھٹو (بیچ میں) پاکستان کے وزیر خارجہ تھے

اب میں آپ کی اجازت سے گزشتہ سال کی روداد آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۔

اس سال کا اہم اور قابلِ ذکر واقعہ پہلی سہ ماہی میں طلبہ کی ہڑتالوں کا تسلسل ہے ۔ یہ ہڑتالیں نظامِ تعلیم کے بعض نئے اور بعض پرانے اجزا پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوتی رہیں ۔ اس وقت مجھے ان ہڑتالوں کے اسباب سے بحث نہیں ہے ۔ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ طلبہ کے پیہم خروج نے لاہور میں تعلیمی کام کو کئی ہفتوں تک معطل رکھا ۔ یونیورسٹی میں ہم نے حکومت کے فیصلے کے مطابق تعلیم کی مدت اور امتحان کے شرائط میں مناسب تبدیلیاں کیں مگر طلبہ کے انبوہ کچھ عرصے تک رعایتوں کی بھیک مانگنے کے لئے بدستور نکلتے رہے اور اُن کے نت نئے مطالبات پر غور کرنے کے لئے یونیورسٹی کی کمیٹیاں ہفتوں تک مسلسل بیٹھتی رہیں ۔ میں خوش ہوں کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے اس ہلڑ بازی میں کوئی حصہ نہ لیا ، نہ یونیورسٹی کو بزور شمشیر فتح کرنے کی کوشش کی ۔ مگر اس تمام افراتفری اور قواعد و ضوابط کے پے در پے تبدیلیوں سے ہمیں یہ نقصان ضرور پہنچا کہ ہمارا تعلیمی سال ستمبر ۱۹۶۲ء کے بجائے عملاً جنوری ۱۹۶۳ء سے شروع ہوا ۔ اندیشہ یہ ہے کہ آئندہ امتحانات پر ان ہنگاموں کی وجہ سے بُرا اثر پڑے گا ۔

اس کالج کے طلبہ کا ہڑتالوں میں شامل نہ ہونا کالج کے پرنسپل کے بارے میں دو طرح کی قیاس آرائیوں کا باعث ہوا ۔ جن صاحبوں کے نزدیک ہڑتالیہ پن مردانگی کی علامت ہے آنھوں نے مجھ سے گلہ کیا کہ میں نوجوانانِ قوم کو ہڑتال ، جلوس ، احتجاج وغیرہ تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکتا ہوں ، آنھیں سڑکوں پر نکلنے نہیں دیتا ، اور بہ جبر کالج کے کمروں میں بٹھائے رکھتا ہوں ۔ خواتین و حضرات ، ایسے وسیع پیمانے پر جبر کی تنظیم عملاً ناممکن ہے ۔ اور پھر اس سال تو بالخصوص یہ حال رہا ہے کہ کالج کے کسی طالب علم کا نام سزا کے طور پر خارج نہیں ہوا اور ، اگر میرا حافظہ خطا نہیں کرتا ، تو کسی طالب علم سے تادیبی جرمانہ وصول کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی ۔

اس سلسلے میں دوسرا قیاس آن احباب کی طرف سے پیش ہوا ہے جو ہڑتال بازی کو طالب علمی کی شان کے منافی سمجھتے ہیں - ان اصحاب کے حسنِ ظن سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اس کالج کے پرنسپل کے ہاتھ میں کوئی ٹونا ٹوٹکا ہے جو کالج کو بد امنی سے بلا تکلف بچائے چلا آتا ہے - جنابِ صدر ، میں جس طرح جبر کے الزام سے مبرا ہوں ، آسی طرح شعبدہ گری کی تہمت سے بھی پناہ مانگتا ہوں - حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ضمنی اور بعض بنیادی اسباب کی بنا پر اس کالج کے طالب علم تخریب کے فتنۂ آخر زماں سے محفوظ رہے ہیں - ہماری اس نجات کے ضمنی اسباب میں ایک قابلِ ذکر سبب یہ ہے کہ یہاں صرف بی - اے اور ایم - اے کے طلبہ تعلیم پاتے ہیں - جنابِ والا ، میں اپنے اس بیان کی ذرا سی تشریح بھی کر دوں تو مناسب ہوگا - سال ہا سال سے میرا تجربہ ہے کہ تفریحی شرارت اور تخریبی شرارت دونوں کی صحیح استعداد بالعموم بارھویں جماعت کے طالب علم میں پائی جاتی ہے - نوجوانی کا یہ زمانہ کچھ ایسا رنگ برنگ دور ہے کہ ایک ایک برس کا فرق اپنی الگ کیفیت رکھتا ہے - چنانچہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ گیارھویں جماعت کے طالب علم کی معصومیت اور تیرھویں والے کی سنجیدگی شرارت کی متحمل نہیں ہوتی - ان گزارشات سے مقصد صرف یہ ہے کہ کالج میں بارھویں جماعت کا نہ ہونا ایک حد تک خود ہی نظم و ضبط کے مسئلے کا حل بن گیا ہے -

میں دامن ہی نہیں رکھتا جو اُلجھے خار دامن میں

لیکن اس قسم کی ضمنی کیفیتوں سے قطع نظر دو بنیادی سبب ایسے ہیں جنھوں نے کالج کو ہر قسم کی بد امنی سے بالا تر رکھا - پہلا یہ کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ بے حد شریف اور قرینہ شناس ہیں - ان میں سے اکثر ایسے غریب گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں جو اب بھی بزرگوں کی عزت اور اسلامی دستور العمل کو لازمۂ حیات سمجھتے ہیں - یہ سب طالب علم پرانی روایات کے قدردان اور حفظ مراتب کا خاص لحاظ کرتے ہیں - اس بنا پر میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ جیسے سعادت مند اور نیک سیرت نوجوان ملک کے بہت کم کالجوں کو نصیب ہوئے ہیں -

دوسرا اہم سبب جس نے کالج میں شایستگی کی فضا برقرار رکھی ، کالج کے اساتذہ کا باہمی اتحاد ہے - میں یہ نہیں کہتا کہ میرے رفقا سب کے سب آپس میں گہرے دوست ہیں ، لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آن کی بہت بڑی اکثریت کالج کی تنظیم کے لئے متحد ہے اور ہر نازک مرحلے پر پرنسپل کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی ہے - بس یہی ہے وہ جبر اور یہی ہے وہ شعبدہ بازی جس نے اس کالج کے طلبہ کو گزشتہ سال کے بلووں اور ہنگاموں میں ایک با وقار اور سنجیدہ جماعت بنائے رکھا -

درسی کامیابیوں کے علاوہ بعض طلبہ نے سالِ گزشتہ کے دوران میں مفید علمی و ادبی کام کیا - بی - ایس سی - آنرز کے طالب علم رحمت علی مجاہد نے آردو اکیڈمی مغربی پاکستان کے انعامی مقابلے میں شرکت کی - "آڑن مشین" کے موضوع پر آن کا مقالہ قابلِ انعام قرار دیا گیا - ُکل پاکستان سائنس کانفرنس میں بھی "بنیادی ذرات" پر ایک مقالہ پیش کر رہے ہیں - بی - ایس سی - آنرز کے ایک اور طالب علم محمد انیس عالم نے سائنس کی ایک عام پسند کتاب Mr. Thompkin in Wonderland کا سلیس آردو میں ترجمہ کیا - کالج کے دو اور طالب علم تبسم کاشمیری اور گوہر نوشاہی آردو میں اچھے پیمانے کا ادبی اور تنقیدی کام کر رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ آگے چل کر آردو کے نامور ادیب بنیں گے - نثر کے علاوہ ان دونوں کو نظم سے بھی شغف ہے اور اس شغف میں کالج میں ایک اور ذہین طالب علم صابر کیفی بھی آن کے ساتھ برابر کے شریک رہے - بی - اے کے طالب علم وحید اطہر نے کالج کے رسالے کے لیے کئی ُپر لطف مضامین لکھے جن میں سے ایک اس سال کا بہترین مضمون قرار پایا ہے - دوسرے فنونِ لطیفہ میں ڈراما اور مصوری اس سال خصوصیت سے نمایاں رہے - اس کالج میں ناٹک کی کوئی مستقل روایت نہیں ہے مگر ڈراما کلب نے اس سال جو دو کھیل ("موم کے ُبت" اور "نوج سے واپسی") پیش کیے وہ مقبول ہوئے اور ان میں ذوالفقار علی اور صوفی نیاز علی کا کام خاص طور پر پسند کیا گیا - ایم - اے (فائن آرٹ) کے طالب علم غلام

رسول نے کالج ہوسٹل میں اپنی تصویروں کی نمائش لگائی اور پھر امجد رشید اور محمود احمد کی مدد سے نقاشی اور سنگ تراشی کی ایک ُکل پاکستان انٹر کالجیئٹ نمائش کا اہتمام کیا - یہ نمائش اس وقت اس ہال کے آوپر کی گیلری میں موجود ہے - مجھے آمید ہے کہ اس تقریب کے خاتمے پر ، چائے کے بعد ، آپ تھوڑی دیر کے لئے اس نمائش کو دیکھنے اور نوجوان فن کاروں کی حوصلہ افزائی کی خاطر ہال کی گیلری میں تشریف لے جائیں گے -

ڈراما کلب اور فائن آرٹ سوسائٹی کے علاوہ کالج میں اکثر درسی مضامین کے نام پر تہذیبی مجالس قائم ہیں - ان میں بزمِ فروغِ آردو اور اکنامکس ، پولیٹیکل سائنس ، ہسٹری ، جیاگرفی اور فلاسفی سوسائیٹیز وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کا ثبوت دیتی رہیں - انگریزی کی سوسائٹی ولی فرڈ سٹڈی سرکل نسبتاً زیادہ سرگرمِ عمل رہی - یہ کارگزاری سرکل کی با ہمت خاتون سیکرٹری شناور خاں کی کوشش سے ممکن ہوئی - شناور خان ایم - اے (انگریزی) کی طالب علم ہیں - سٹڈی سرکل کی طرح ایک اور تہذیبی مجلس "ینگ رائٹرز" اپنے انگریزی نام کے باوجود آردو ادب و تنقید کے لیے مستعدی سے کام کرتی رہی - ان تہذیبی مجالس کی محفلوں میں کالج کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ ملک کے مشاہیر ، پروفیسر وقار عظیم ، مسٹر ممتاز حسن ، میاں ریاض الدین احمد ، مسٹر الطاف گوہر ، پروفیسر انیس احمد عباسی ، وغیرہ تشریف لاتے رہے - پاکستان سے باہر کے جن اہلِ علم نے ان جلسوں میں شرکت فرمائی آن میں مسٹر محمد فرید اور ڈاکٹر محمد مصطفیٰ مصر کے ثقافتی مرکز کی معرفت ، مسز ڈبلیو - جے - کریگ برٹش کونسل اور مسٹر جے سٹیوارٹ ، مسٹر پال اینگل اور ڈاکٹر ولیم - سی - کرک یونائیٹڈ سٹیٹس انفرمیشن سروس کے توسط سے تشریف لائے - ان سرگرمیوں سے قطع نظر ، ہماری مجلسِ اسلامیات اس سال نمائشِ کتبِ سیرت کا اہتمام کر رہی ہے - یہ نمائش اس مہینے کے آخری ہفتے میں ہوگی -

سائنس کے مضامین فزکس ، کیمسٹری ، زوآلوجی اور باٹنی کی مجالس نے چودھری محمد علی ، ڈاکٹر فوسٹر ، ڈاکٹر ریاض الدین اور ڈاکٹر وولڈ جیسے صاحبِ

علم حضرات سے استفادہ کیا ۔ ان مجالس میں طلبہ بھی اپنے مختصر مقالات پیش کرتے ہیں ۔ چنانچہ زوآلوجی کی مجلس میں محبوب احمد اور خالد وغیرھم نے مقالے پڑھے جو پسند کیے گئے ۔ فزکس کی مجلس نے لاہور کے اٹامک انرجی سنٹر کے بعض ماہرین سے وعدہ لیا ہے کہ وہ اپنے اپنے خاص مضمون پر آنرز کے طلبہ سے خطاب فرمائیں گے ۔ ان مجالس کے علاوہ تمام کالج کی مشترک مجلس ، کالج یونین ، نے اس سال بھی اپنا مفید کام جاری رکھا ۔ محمد علی یونین کے نائب صدر ، اور عبدالستار سیکرٹری منتخب ہوئے ۔ یونین نے اس مرتبہ بھی متعدد دلچسپ مباحثوں کا انتظام کیا ۔ منجملہ ان مباحثوں کے ، اردو اور انگریزی کے سالانہ کل پاکستان بین الجامعی انعامی مباحثے تھے جو با رونق رہے ۔

کرکٹ میں اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کے سالانہ مقابلے کو اب ایک ایک ثقافتی میلے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے ۔ گزشتہ بارہ برس کے کھیل کے متعلق اگر کوئی بات مجموعی طور پر ہمارے حق میں کہی جا سکتی ہے تو وہ یہ کہ ہم نے اس میلے کی رونق میں کسی طرح کمی نہیں آنے دی ۔ اس کے علاوہ جو بات قابلِ ذکر ہے ، وہ یہ کہ ۱۹۵۰ - ۱۹۵۱ء کے کرکٹ میچ سے شروع کر کے سالِ رواں تک ہم ہر سال مسلسل ہارتے چلے آئے ہیں ۔ اس سے پہلے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۹ء تک کے عرصے میں ، یعنی مسلسل گیارہ برس تک ، ہم گورنمنٹ کالج کو شکست دے کر یونیورسٹی کی کرکٹ چیمپئن شپ برابر جیتتے چلے گئے تھے ۔ اس بنا پر ہمارا خیال تھا کہ گیارہ برس کی مسلسل فتح کے بعد گیارہ برس کی مسلسل شکست ہمارے لیے مقدر ہو چکی ہے ۱۹۵۷ء میں چونکہ میچ نہیں ہو سکا تھا اس لیے گزشتہ سے پیوستہ سال کرکٹ میں ہماری مسلسل شکستوں کا شمار صحیح عدد ، یعنی گیارہ ، تک پہنچ گیا ۔ اب دونوں طرف حساب برابر تھا ، اس لئے توقع کی جا رہی تھی کہ بارھویں برس مسلسل فتوحات کا گیارہ برس کا جشن پھر شروع ہوگا ۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی نہیں ۔ ہمیں پھر شکست ہوئی اور شکست بھی ایسی جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی ۔ گورنمنٹ کالج کی کرکٹ ٹیم کچھ ایسی ناقابل

تسخیر ٹیم نہ تھی ، اور پھر اس کے دو بہت اچھے کھلاڑی محض سوءِ اتفاق سے مقابلے میں شامل نہ ہو سکے تھے - اس کے باوجود یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ٹیم بارھویں مرتبہ ہار کر تاریخ کے دانت کھٹے کرنے پر تُلی ہوئی تھی - یہ ٹیم لاہور سے کراچی تک فاتحانہ یلغار اور بے شمار مقابلوں میں کامیابی کے بعد واپس آئی اور خود اپنے تجویز کردہ میدان ، لاہور سٹیڈیم ، میں ۱۶۶ دوڑوں سے ہار گئی - خواتین و حضرات ، یہ کرکٹ میچ میرے دو پیش رووں کے جگر کا ناسور بن گیا تھا اور اب یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ میں خود ایک داغِ حسرت لیے ہوئے اپنے جانشین کے لئے وہ وصیت چھوڑ جاؤں گا جو خواجہ حالی نے دہلیٔ مرحوم کے بارے میں فرمائی تھی -

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت ، اے سیاح
دیکھ ، اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

کرکٹ ، ہاکی ، فٹ بال اور کشتی رانی کی شکستوں سے قطع نظر ، ہم اس سال کبڈی ، والی بال اور کراس کنٹری ریس میں یونیورسٹی کے چیمپئن بنے - ہماری کبڈی ٹیم کے ارکان عبدالستار ، محمد سعید اور محمد شریف نے فائنل میچ میں بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا - یونیورسٹی کے والی بال فائنل میں ہماری ٹیم نے گورنمنٹ کالج کو شکست دے کر یونیورسٹی کی ٹرافی جیت لی - ہماری ٹیم کے دو کھلاڑی خالد مسعود اور شوکت علی قومی مقابلوں میں شرکت کے لئے پنجاب کی ٹیم میں منتخب ہوئے ، نیز خالد مسعود پنجاب یونیورسٹی ٹیم کے کپتان مقرر ہوئے - کراس کنٹری ریس میں ہمارے کھلاڑی فیاض محمود اول آئے اور یونیورسٹی ٹرافی ہمارے ہاتھ رہی - پنجاب یونیورسٹی ریلے ریسز اور ضلع لاہور کے اولمپک مقابلوں میں ہماری ٹیم دوسرے نمبر پر رہی - پنجاب یونیورسٹی ایتھلیٹکس میں ہم رنر اپ رہے - ہمارے کھلاڑی ۴۰۰ میٹر کی رکاوٹوں کی دوڑ میں اور احمد سلیم ۱۵۰۰ میٹر کی کھلی دوڑ میں اول آئے -

کالج کی کوہ پیما کلب حسب معمول اس سال بھی مستعد رہی ، کلب کے تیرہ رکن گزشتہ موسم سرما میں وادئ کاغان کے ماؤنٹینیرنگ کیمپ اور مری یوتھ ہوسٹلنگ کیمپ میں شریک ہوئے ۔ کاغان میں پانچ میل کی دوڑ اور مری میں اٹھائیس میل کی ہائیک میں حصہ لے کر ہمارے طلبہ نے جفاکشی کا بہترین مظاہرہ کیا ۔

جناب والا ، طلبہ کے متعلق ان کوائف کے بیان کے بعد میں مختصراً اساتذہ کا بھی تذکرہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ اس سال کے دوران میں میرے بعض رفقا مختلف حالات کے ماتحت کالج چھوڑ کر چلے گئے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی صدر شعبۂ فارسی کا یونیورسٹی اورینٹل کالج میں تقرر ہو گیا ۔ اُن کی جگہ ہمارے صدر شعبۂ اُردو افتخار احمد صدیقی صاحب فارسی کے صدر کے فرائض بھی بجا لا رہے ہیں ۔ مرزا محمد وسیم سول سروس میں گئے اور ان کی جگہ مسٹر ذوالفقار خاں کا تقرر ہوا ۔ ذوالفقار خاں صاحب نے ۱۹۶۰ء میں اسی کالج سے ایم ۔ اے (انگریزی) کا امتحان دے کر نمایاں کامیابی حاصل کی تھی ۔ مسٹر فیاض الرحمن لیکچرار باٹنی کے مستعفی ہونے کے بعد ان کی خالی کی ہوئی اسامی پر ڈاکٹر رفیق احمد خاں کا تقرر ہوا ۔ ڈاکٹر رفیق احمد خاں علی گڑھ اور خود اسلامیہ کالج کے مشہور تجربہ کار اساتذہ میں ہیں۔ اب وہ دیال سنگھ کالج کی پرنسپلی سے فارغ ہوئے تو ہم دوبارہ اُن کی خدمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔

جناب صدر ، یہ تقریب اُس پنج سالہ دور کی آخری تقریب ہے جو اس کالج میں ایف ۔ اے کے حصے کی علیحدگی کے بعد اپریل ۔ مئی ۱۹۵۸ء سے شروع ہوا تھا ۔ مناسب ہے کہ اس دور میں جو تعمیری و تنظیمی کام ہوا اس کی مختصر کیفیت آپ کے گوش گزار کر دوں ۔

اس دور کے آغاز ہی سے کالج میں مختلف تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا ۔ مثلاً پہلے سال میں طلبہ کے لئے ایک خوبصورت چائے خانہ تعمیر ہوا ۔ گزشتہ سال بائیسکلیں رکھنے کے لئے ایک شیڈ بنا ، اور اس دوران میں پورے کالج کی چمن بندی

بڑے سلیقے سے تکمیل کو پہنچی - کالج ہوسٹل کا بڑا حصہ ، جو ناجائز قابضین کے تصرف میں تھا ، بہ تدریج واگزار کرایا گیا - اور اس سال کے دوران میں وہ ۲۷ کمرے بھی کالج کے قبضے میں آ گئے جو اب تک پولیس کے استعمال میں تھے - پروفیسر غلام صادق ، جو ہوسٹل کے نگراں بھی ہیں ، محنت اور تن دہی سے ہوسٹل کی اصلاح میں مصروف ہیں -

کالج کے کتب خانے کی تنظیم کا کام اس سال نہایت توجہ اور قرینے سے ہاتھ میں لیا گیا ہے - یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ مرکزی وزارتِ تعلیم کے چار لاکھ روپے کے عطیے کا ایک حصہ لائبریری کی مد پر صرف ہونے لگا - جون ۱۹۵۸ء میں ۹۰۰۰ کتابیں کالج کے ریلوے روڈ والے کتب خانے سے موجودہ کتب خانے میں منتقل ہوئی تھیں - یہ کتابیں گزشتہ سال تک لائبریری کے بالا خانے کے فرش پر پڑی رہیں کیونکہ نہ الماریاں بنوانے کے لئے رقم میسر تھی ، نہ وہ عملہ موجود تھا جو ٹیکنیکل طور پر ان کتابوں کی فہرست بندی کر کے انھیں قابلِ استعمال بنا سکے - بالآخر مرکزی حکومت کے عطیے کی مدد سے کتب خانے کی تنظیم کے لئے گزشتہ سال شیخ محمد امین کا تقرر عمل میں آیا - شیخ صاحب کالج کے پرانے لائبریرین اور اس سے بھی پرانے طالب علم ہیں - انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود نوجوانی کی ہمت کے ساتھ اپنا کام سنبھال لیا ہے - کتابوں کے ڈھیر فرش سے اٹھ کر الماریوں میں پہنچ گئے ہیں - اس کے علاوہ امین صاحب نے سال ہا سال کے پرانے بل مرتب کر کے متعلقہ کتب فروشوں کے حسابات بیباق کر دیے ہیں - بارہ ہزار سے زیادہ کتابوں کا اندراج ایکسیشن رجسٹروں میں ہو چکا ہے - اس سال ۱۹۵۵ کتابیں Classify اور ۷۹۱ Catalogue ہوئیں - اگر کام کی یہی رفتار جاری رہی تو امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ دو سال کے عرصے میں لائبریری کا موجودہ جنگل مہذب اور صاحبِ علم قارئین کے لئے صاف ستھرے مطالعہ خانے کی صورت اختیار کر لے گا - اس سال ۷۵۰۰ روپے کی مزید کتابیں کالج لائبریری میں آئیں - ان کتابوں کی خرید بھی مرکزی حکومت کے عطیے سے ممکن ہو سکی - حکومت کے عطیے سے جو

۴۲ کمرے حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں وہ اسی مہینے سے اساتذہ کے استعمال میں آنے لگیں گے ۔

ان بیرونی تعمیرات کے علاوہ اس عرصے میں کالج کی ذہنی تعمیر نظر انداز نہیں ہوئی ۔ اس دوران میں کالج کے نظم و ضبط کو تعلیمی حلقوں میں نیک شہرت نصیب ہوئی ۔ کالج میں علمی زندگی کے پاکیزہ نصب العین کا حصول ، جس کے لئے جمیعت ِ خاطر پہلی شرط ہے ، ہمیشہ ہمارے پیش ِ نظر رہا ۔ کالج کے برآمدے شور و غوغا سے پاک رہے اور بے آئین زندگی کی جارحیت کے مقابلے میں معلم اور طالب علم دونوں کی حفاظت کی گئی ۔ حدود ِ معینہ کے اندر آزادی ِ فکر و عمل کا استحکام کیا گیا اور ہم دلی و ہم کاری کے لئے رفاقت کی سازگار فضا کی پرورش مسلسل ہوتی رہی ۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کے اسلامی جذبے اور قومی شعور کی تربیت ہوئی ۔ اور مجھے یقین ہے کہ ضرورت پڑی تو اس کالج کے تربیت یافتہ نوجوان پاکستان دشمن طاقتوں سے بھڑ جانے کے لیے ایک بار پھر اسی طرح اٹھیں گے جس طرح ۱۹۴۶ء میں قیام ِ پاکستان کی خاطر انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی ۔

جناب ِ والا ، اب میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ مستحق طلبہ کو اپنے ہاتھ سے انعامات دے کر مفتخر فرمائیں ۔

———

خراج عقیدت

۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو حکومت پاکستان نے پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اُن کو ''ستارۂ امتیاز'' عطا کیا ۔ اس موقع پر ایک خاص اجلاس میں کالج یونین کی طرف سے خاں صاحب کو مندرجہ ذیل لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ۔

بخدمت آستادِ محترم جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ، ستارۂ امتیاز ،
پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

آستادِ گرامی قدر !

۲۳ مارچ کی مبارک صبح کو جب ہمیں اخبارات سے یہ معلوم ہوا کہ حکومتِ پاکستان نے آپ کو "ستارۂ امتیاز" کا اعزاز عطا فرمایا ہے ، اس وقت چونکہ آپ بنگالی اکیڈیمی کی دعوت پر ہماری قومی زبان آردو کی نمائندگی کے لئے ڈھاکہ تشریف لے جا رہے تھے، اس لئے ہمیں یہ موقعہ نہ مل سکا کہ آپ کی موجودگی میں اپنے جذباتِ مسرت کا اظہار کر سکتے۔ اس خوش خبری کے بعد آج یہ پہلا دن ہے کہ آپ کالج تشریف لائے ہیں، لہذا ہم یہاں جمع ہوئے ہیں تا کہ آپ کی موجودگی میں جشنِ مسرت منائیں اور آپ کے قدموں پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کریں ۔

آستادِ محترم !

یہ ہماری بہت بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہمیں آپ جیسا پرنسپل ملا ہے جو علمی کمالات اور اخلاقی فضائل کا مجموعہ، ایک عظیم آستاد اور ایک عظیم انسان ہے - بحیثیت استاد اور بحیثیت انسان، آپ کی عظمت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ کی

ذاتِ میں مشرقیت اور مغربیت ، قدامت اور جدت دونوں کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جس کی مثالیں ہماری قوم میں بلکہ برِ عظیم پاک و ہند میں خال خال ملتی ہیں ۔ انگریزی زبان و ادب کے ایک ممتاز عالم ہونے اور مغربی تہذیب کے بہترین عناصر کو اپنی شخصیت میں رچا لینے کے باوجود آپ نے ہمیشہ قومی روایات اور اسلامی اقدار کا پرچم بلند رکھا ہے ۔ دیگر اخلاقی اور ذہنی اوصاف کے علاوہ آپ کے کردار کی یہ خصوصیت ایسی ہے جس کی بنا پر آپ کو اس قومی ادارے کا ایک مثالی پرنسپل قرار دیا جا سکتا ہے ۔

محبوب پرنسپل !

آپ نے گزشتہ ربع صدی میں، مختلف حیثیتوں سے ، اسلامیہ کالج کی جو بے لوث خدمات انجام دی ہیں وہ اس ادارے کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی ۔ آپ کی گو نا گوں خدمات کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع نہیں ۔ مختصر یہ کہ اس تمام عرصے میں آپ کی ذات کالج کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا سرچشمہ رہی ہے ۔ متحدہ کالج کی تقسیم سے پہلے ڈگری کالج کے مجوزہ پرنسپل کی حیثیت سے آپ نے عمارت کے اختلافی مسئلے کو جس جد و جہد کے ساتھ سلجھایا اور اس کالج کے لئے موزوں ترین ماحول اور مناسب مقام حاصل کیا ، یہ آپ کے عزم و تدبّر اور اس کالج سے دلی محبت کا ایک ناقابلِ فراموش ثبوت ہے ۔ آپ نے ڈگری کالج کے پرنسپل کی ذمہ داریاں ایسے وقت سنبھالیں جو اس کالج کی تاریخ میں نازک ترین دور تھا ۔ لیکن چند سال کے قلیل عرصے میں آپ نے اپنی شبانہ روز محنت اور ان تھک کوششوں سے اس ادارے کی بنیادیں مستحکم کیں اور اس کے وقار کو اتنا بلند کیا کہ آج اس کالج کے نظم و ضبط کا اعتراف ، نہ صرف محکمۂ تعلیم کے حکام بلکہ حکومت کے ذمہ دار ارکان بھی کرتے ہیں ۔

جنابِ والا !

اس کالج کے علاوہ قومی تعلیم کے وسیع تر میدان میں آپ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ تعلیمی کمیشن کی

سفارشات کو عملی جامہ پہنانے میں ہر قدم پر محکمہ تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی آپ کے مشوروں سے مستفید ہوتی رہی ہے ۔ ملک کے نظامِ تعلیم میں قومی زبان کو ایک باوقار مقام دلانے کے لئے آپ گزشتہ چند سال سے جو مسلسل کوششیں کرتے رہے ہیں وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو اردو کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا ۔

آستادِ مشفق !

اس درس گاہ میں آپ نے نہ صرف طلبا کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے لئے بہتر سے بہتر انتظامات کئے بلکہ اپنے عملی نمونے اور اپنی بے پایاں شفقت سے ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں کالج کے اساتذہ اور طلبا ایک خاندان کے افراد کی طرح متحد اور باہمی تعاون و یگانگت کے رشتوں میں منسلک ہوگئے ہیں ۔ یہ اس درس گاہ کی ایک ایسی انفرادی خصوصیت ہے جس سے ہر طالب علم کالج کی حدود میں قدم رکھتے ہی متاثر ہو جاتا ہے ۔ اساتذہ اور طلبہ کے اس کنبے میں آپ ایک حقیقی رہنما اور روحانی باپ ہیں ۔ آپ کی محبوب شخصیت سے ہمارے دلوں میں محبت اور عقیدت کے جو جذبات ہمیشہ سے موجزن ہیں ۔ اُن کے اظہار کا ہمیں یہ مناسب موقع میسر ہوا ہے ۔ اس مبارک موقعے پر ہم کالج یونین کے ارکان آپ کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کالج اور ملک و قوم کی بیش از بیش خدمات انجام دینے کے لئے صحت ، ہمت اور استقامت عطا فرمائے ۔ آمین !

اسلامیہ کالج لاہور
۲۸ مارچ ۱۹۶۲ء

ہم ہیں، آپ کے نیاز مند
اراکین کالج یونین

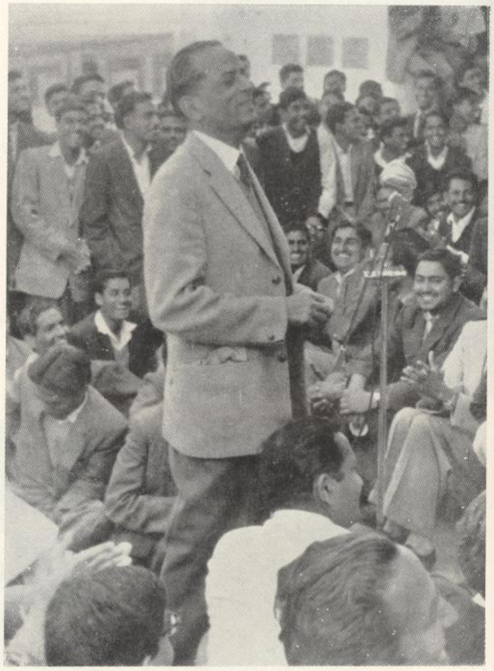

ایک تھا پرنسپل

اسلامیہ کالج کا ، جس نے کالج کو گھر اور تمام اساتذہ و طلبہ کو ایک ہی
کنبہ بنا دیا تھا

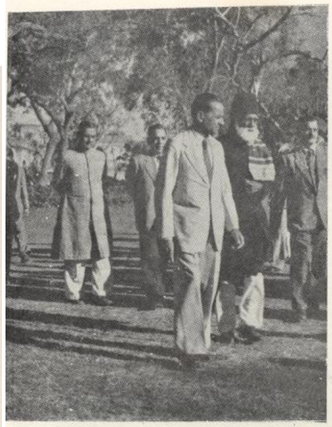

بابائے اردو کے ساتھ
اسلامیہ کالج کے سبزہ زار میں
(۱۹۵۹ء)
پیچھے (دائیں سے) :
پروفیسر عابد احمد علی
پروفیسر خواجہ محمد اسلم
اور
پروفیسر ڈاکٹر سعید اللہ

مشاعرۂ شمع تاثیر کی ایک جھلک (۱۹۶۲ء)
تصویر میں (دائیں سے): پروفیسر حمید احمد خاں ، ڈاکٹر سید عبداللہ (پیچھے)
ڈاکٹر نذیر احمد اور بیگم تاثیر

پروفیسر سجاد باقر رضوی

پرنسپلی کے زمانے کا ایک واقعہ

پروفیسر حمید احمد خاں (مرحوم) ایک مثالی استاد تھے - ان کے ذہن میں استاد اور شاگرد کے رشتے کا ایک مثالی تصور تھے - وہ استادوں اور شاگردوں کو دو علیحدہ فریق گرداننے کے بجائے انھیں ایک ہی ٹولی کے افراد سمجھتے تھے - اسی لیے وہ کالج کے اساتذہ کو ہمیشہ یہ تلقین کرتے رہتے تھے کہ وہ طالب علموں سے ذاتی تعلقات استوار کریں - خود بھی اپنے اس مسلک پر ہمیشہ قائم رہتے - طالب علموں کے مسائل کو وہ پورے کالج کے مسائل سمجھتے تھے اور اسی لیے وہ اس بات کے حق میں نہ تھے کہ طلبہ استادوں کو اعتماد میں لیے بغیر اپنے حقوق کے حصول کے لیے ایک علیحدہ فریق کی صورت میں جد و جہد کریں -

یہ واقعہ ۳۱ جنوری ۱۹۶۲ع کا ہے - اسلامیہ کالج (سول لائنز) کے طلبہ نے کالج میں ٹیوشن فیس کی زیادتی کے خلاف اجتماع کیا اور ایک جلوس کی صورت میں کالج سے باہر نکل کر لاہور کی سڑکوں پر مظاہرے کیے - پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے لیے یہ صورتِ حال اِنتہائی تکلیف دہ تھی - طالب علموں سے اِنتہائی محبت و شفقت کے باعث اُنھیں اُن پر پورا اِعتماد تھا - اس اِعتماد کی بِنا پر طلبہ کا یہ مظاہرہ ان کے لیے نہایت اَذیّت ناک ثابت ہوا - اُن کے اِعتماد کو ٹھیس پہنچی اور اس صورت میں انھوں نے ایک باہمیت شخص کی طرح وہی کیا جو ان کے شایانِ شان تھا - پروفیسر حمید احمد خاں نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر پرنسپلی کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا - ان کا موقف یہ تھا کہ ان کے عزیز طالب علموں کو اب ان کی ذات پر اعتماد نہیں رہا جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ کالج کے باہر سڑکوں پر مظاہرہ کرتے پھرے -

پروفیسر حمید احمد خاں کے استعفیٰ کا، جو انگریزی زبان میں تھا، ترجمہ حسب ذیل ہے :

کمرے میں گیا ۔ ایک عجیب پریشانی سی تھی جو میری طرح ہر ایک کے چہرے سے نمایاں تھی ۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں ۔ میں نے اُن سے کہا ''خان صاحب آپ استعفٰی نہ دیں'' ۔ خاں صاحب نے میری طرف دیکھا اور اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں (جس میں شفقت بھی شامل تھی) جواب دیا ''اچھا چچا باقر ! میں آپ کے مشورے پر غور کروں گا ۔'' مجھے اس جواب پر شرمندگی تو ہوئی مگر جوابی کارروائی کے لیے میں بالکل تیار تھا ۔ میں نے ایک کاغذ لیا اور جلد جلد استعفٰی کی دو سطریں گھسیٹ کر اُن کے سامنے رکھ دیا ۔ انھوں نے کاغذ دیکھا اور پوچھا یہ کیا ؟ میں نے جواب دیا ''میرا استعفٰی'' ۔ اپنی جیب میں رکھ لیا ۔ میں نے ان کے استعفٰی کی طرف ہاتھ بڑھایا ، جس پر وہ دستخط مثبت کر چکے تھے ۔ میں نے کہا اگر آپ میرا استعفٰی جیب میں رکھیں گے تو میں آپ کا استعفٰی اپنی جیب میں رکھ لوں گا ۔ اس منطقی بات کا جواب انھوں نے دیا کہ اچھا تو دونوں استعفٰی ساتھ جائیں گے ۔ میں مطمئن ہو کر باہر آ گیا ۔ کچھ دیر بعد ہی کالج کے باقی اساتذہ نے بھی ایک جوائنٹ استعفٰی پرنسپل صاحب کو پیش کر دیا ۔

بالآخر ہوا یہ کہ کالجز کمیٹی نے خاں صاحب کا استعفٰی قبول نہ کیا ، فیسوں میں کمی فوری طور پر منظور ہو گئی اور کمیٹی کے اراکین کے سمجھانے بجھانے پر خاں صاحب اس روز ۳۱ جنوری کو رات گئے اپنا استعفٰی واپس لینے پر تیار ہو گئے ۔

ان تمام واقعات کا اثر پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے حساس دل پر بہت زیادہ ہوا اور اگلے دن انھوں نے کالج کے بڑے لان میں طلبہ اور اساتذہ کے سامنے جو تقریر کی اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

''ایک غم زدہ دل کے ساتھ اور خود کو کل کی نسبت آج زیادہ معمر محسوس کرتے ہوئے میں کالج واپس آ گیا ہوں تا کہ کل کی راکھ اور مٹی میں عزت و ہمیت کی کوئی چنگاری تلاش کروں ۔ کل موت کا ہاتھ اندھیرے میں ابھرا —— جیسا کہ اس کا قرینہ ہے —— اور اس کی ایک ہی ضرب میں وہ کچھ ختم ہو گیا جو ہمیں عزیز تھا اور جسے ہم نے مہینوں اور برسوں کی محنت و مشقت سے پروان چڑھایا تھا ۔

۳۱ جنوری ۱۹۶۲ء

ڈیر شیخ صاحب

آج صبح جب میں کالج میں آیا تو غیر متوقع طور پر یہ پتا چلا کہ طلبہ کا ایک بڑا گروہ اس کالج میں فیسوں کی زیادتی کے خلاف اِحتجاج کرتا ہوا باہر نکل گیا ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ کالجز کمیٹی نے میرے ایما پر فیسوں کی موجودہ شرح کو کم کرنے کے لیے اِقدامات کیے ہیں ۔ میں نے ان اِقدامات کے بارے میں طلبہ کو مطلع کر دیا تھا ۔ اس کے باوجود ان میں سے کچھ نے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ شہر کی سڑکوں پر مظاہرے کیے جائیں ۔

اب معلوم ہوتا ہے کہ میں کالج کے طلبہ کے ایک خاصے بڑے گروہ کا اعتماد کھو چکا ہوں لہٰذا میں اپنی ، نیز کالج کی بہتری دیکھتے ہوئے بطور پرنسپل کام کرنے سے قاصر ہوں ۔ میں اپنا استعفٰی پیش کرتا ہوں جسے مخصوص صورتِ حال کے پیشِ نظر فوری طور پر قبول فرمایا جائے ۔ اگر آپ مُتفق ہوں تو میں آج بعد از دوپہر یا کل صبح اپنی ذِمہ داریاں وائس پرنسپل پروفیسر اے ۔ ایچ ۔ بیگ صاحب کے سپرد کر دوں ۔

خلوص کے ساتھ

آپ کا

حمید احمد خان

بخدمت شیخ عبدالمجید اصغر

اعزازی معتمد

کالجز کمیٹی ۔

پروفیسر حمید احمد خاں ابھی اپنا استعفٰی ٹائپ کرا رہے تھے کہ سارے کالج میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ۔ میں اس زمانے میں شعبۂ انگریزی میں لکچرار تھا ۔ خاں صاحب مرحوم کی شفقت اور محبت میں سے ، جو ہر شخص کے لیے عام تھی ، مجھے بھی حیثیت سے زیادہ حصہ ملتا تھا ۔ یہ خبر سنتے ہی میں ان کے

”نوجوانوں کی نیکی سے میرا اعتماد اُٹھ گیا ہے ۔ بدی کی روح نے لاہور کی سڑکوں پر گشت کیا ۔ کالج کے تابندہ نام کو داغ دار کیا ۔ اور دنیا کی نگاہوں میں اُسے روسیاہ کیا ۔ اب ہمارے چاروں طرف ذلت و رسوائی کی فضا ہے ، جس سے ہم میں سے بہترین لوگ بھی دوچار ہیں ۔

”کل تک ہمارے پاس ایک نام تھا اور ایک جھنڈا ۔ اب ہمیں اپنی نئی حیثیت کے مطابق اس جھنڈے کو سرنگوں کر دینا چاہیے ۔ کل تک جو کچھ ہمارا سرمایا تھا ـــــ عزت ، نیک نامی ، اعلٰی کردار ، مہذب برتاؤ ، خلوص و رواداری اور خدمت کے ذریعے حاصل کردہ سکون روح ـــــ سب کچھ جاتا رہا اور اسی نقصان کے غم میں اس جھنڈے کو سرنگوں رہنا چاہیے ۔

”کم از کم کچھ طالب علم اور کچھ استاد اس اندوہ کو جو میرے دل میں ہے ، سمجھ سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں اور وہ میری طرح افسوس اور شرم سے اپنا سر جھکا لیں گے ۔

آج کا دن ہمارے لیے غم کا دن ہے ۔“

پروفیسر حمید احمد خاں نے استعفٰی تو واپس لے آیا لیکن کالج کا جھنڈا سرنگوں ہو گیا ۔ طالب علم عام طور پر اپنے کیے پر بے حد شرمندہ تھے ۔ طلبہ کے نمایندوں اور بہت سے نمایاں طالب علموں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا ۔ چند طالب علموں نے پرنسپل صاحب کو خطوط بھی لکھے جن میں شرمندگی اور ندامت کے اعلان کے ساتھ ان سے معذرت بھی کی ۔ بی ۔ ایس سی ۔ (میڈیکل) کے ایک طالب علم جاوید اقبال کے خط سے ایک اقتباس دیکھیے :

”اے رجل عظیم ! آپ کے اخلاق و کردار کی ایک انجانی تصویر جو میں نے اپنے خیالوں کی دنیا میں بنائی تھی ، وہ آپ کو زیادہ قریب ہو کر دیکھنے کے بعد اور زیادہ دلکش اور حسین دکھائی دیتی ہے ۔ آپ نے کالج کے پھول کی آب یاری اپنے خون جگر سے کی تھی ۔ (اس پھول کی شگفتگی و رعنائی کو مٹی میں ملتے دیکھ کر جو ٹھیس آپ کے دل کو لگی اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا) اور اس پھول کی دوبارہ

آبیاری کا عین وقت پر ذمہ لے کر (اور وہ بھی اپنی عزت نفس کی قربانی دے کر) اس (کالج) پر ایک ایسا احسان عظیم کیا ہے جو کالج کی تاریخ میں رہتی دنیا تک آپ کی یاد کو زندہ جاوید رکھے گا ۔

"۳۱ جنوری کو آپ نے اپنی عقل سلیم کے بل بوتے پر ، . . . حالات کے گھناؤ نے رخ پر قابو پا کر کالج کو دوبارہ زندگی دی ۔ میں بیان نہیں کر سکتا اس تشکر اور آپ کے احسان مندانہ قدم کے جذبے کو جو میرے دل میں ہیں . . . اے کاش میں اس درد کی کسک کو اپنا دل چیر کر دکھا سکوں ۔"

ایک اور خط میں جو کسی نامعلوم طالب علم نے لکھا ہے اور نام نہ لکھنے کی وجہ ندامت و شرمندگی بتائی ، ان جذبات کا اظہار اس طور کیا گیا :

"یہ باپ کے خلاف بغاوت نہ تھی اور نہ یہ گھر کے خلاف بغاوت تھی بلکہ یہ اس کے خلاف بغاوت تھی جس نے ہمارے باپ کی بات نہ مانی تھی یالیت واحل کی تھی ۔ بیٹے جانتے تھے کہ باپ ان کے لیے لڑ رہا ہے لیکن کم عقل یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ ہار گیا ۔ (کاش انھیں وقت پر پتا چل جاتا کہ وہ جیت گیا ہے) اور اس کی ہار بیٹے کیسے برداشت کر سکتے تھے . . . سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ کسی نے آن کے باپ سے کہہ دیا کہ بیٹے نافرمان ہو گئے ہیں ۔

"پیارے باپ ہم تجھ سے بے پناہ پیار کرتے ہیں ۔ اس گھر کے ذرے ذرے سے ہمیں عقیدت ہے — لیکن آہ تو نے کتنی کڑی سزا دی ہے ہمیں . . . ہماری آنکھیں کیوں نہ پھوٹ گئیں جب ہماری غفلت کی علامت شکست اور نومیدی کے نشان میں تبدیلی ہوئی — کیا ہماری ندامت کے آنسو ہمیں بے آبروئی سے بچا سکتے ہیں ۔

فقط

ایک معصوم گنہگار"

اسی قسم کا ایک معزرتی خط کالج یونین کے صدر عزیز احمد نے بھی لکھا

جس سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

''جھنڈے کے سرنگوں ہونے کی وجہ سے مجھے جتنا صدمہ ہوا اس کا علم یا تو مجھے ہے یا خدائے ذوالجلال کو - جھنڈا تو چند بالشت نیچے ہوا لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اوج ثریا سے گر کر تحت اثری میں پہنچ گیا . . .

''طلبا اپنے کیے پر نادم ، پشیمان اور شرمسار ہیں اور معافی کے خواستگار ہیں - . . . میں اپنی اور طلبا کی طرف سے یہ التجا کرتا ہوں کہ خدارا عفو و درگذر سے ہماری خطاؤں ، غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائیں - سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے لیکن آئندہ انشا اللہ تعالیٰ اس کالج کے طلبا سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی اور نہ ہوگی جو کالج کے وقار کے منافی ہو اور آپ کے لیے ناپسندیدہ'' -

اس موقع پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایم اے ، پی ایچ ڈی نے ، جو آج کل یونیورسٹی اورینٹل کالج میں شعبہ اردو سے منسلک ہیں اور اس زمانے میں اسلامیہ کالج میں بی اے کے طالب علم تھے ، اپنے احساسات کا اظہار ایک نظم میں کیا جو کالج کے رسالے ''فاران'' جنوری - فروری ۱۹۶۲ء میں بطور اداریہ شائع ہوئی :

پرچم اسلامیہ کالج نگوں ہے !
اور احساس ندامت سے ہمارے سر جھکے ہیں !
کون تھے وہ ناخلف ، نااہل فرزندان کالج ؟ ! !
جن کے نازیبا عمل سے ،
احتجاج بے محل سے ،
شور بے ہنگام سے ، رسوا ہوا کالج ہمارا ،
جن کی ناشائستگی ، بے اعتمادی ،
باعث آزردگی اس کے لیے ہے ،
جس کی دل سوزی نے برسوں کی ادب آموزیوں سے

جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

نذرانۂ عقیدت

کسی درسگاہ کی عمارت اینٹوں کا انبار نہیں ہوتی ، روشنی کا مینار ہوتی ہے - اس کے در و دیوار کے تعمیری حسن سے تاج محل نہیں ابھرتا ، علم و دانش کا روپ سنورتا ہے - وہاں کے دانش آموزوں، اور دانشوروں کی شخصیت سے اس کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں -

پروفیسر حمید احمد خاں نے اس کالج میں قدم رکھا تو اس کی حیثیت ایک عام درسگاہ کی تھی لیکن انھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کی کایا پلٹ کر دی - وہ خود علم و ادب کے دلدادہ تھے اور انھوں نے اپنی زندگی اسی کے لئے وقف کر دی تھی - وہ خاموش کارکن تھے- انھوں نے خاموشی سے کام کیا اور اپنی علم دوستی اور ادب نوازی کے جذبے کو اپنے طلبہ اور اپنے رفقائے کار کے دلوں میں ابھارا اور ایک ایسی فضا پیدا کی کہ یہ کالج ایک درس گاہ کے ساتھ ساتھ ایک ادب گاہ بھی بن گیا -

حمید احمد خاں ایک پختہ کار استاد اور معلم بھی تھے اور ایک دانشمند منتظم بھی - علاوہ بریں وہ جوہر شناس بھی تھے - انھیں طلبہ اور اساتذہ میں جہاں کہیں کوئی جوہرِ قابل نظر آیا اس کی حوصلہ افزائی کی - بچوں میں تعلیم کا شوق اور استادوں میں تدریس کا ذوق پیدا کیا - رفتہ رفتہ اس درسگاہ کو شہر لاہور اور صوبۂ پنجاب کی اعلیٰ اور قدیم درسگاہوں کے مقابل کھڑا کر دیا - یہ ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے -

---

پروفیسر حمید احمد خاں کی یاد میں بزمِ فروغِ اردو ، اسلامیہ کالج (سول لائنز) کے زیر اہتمام اجلاس میں کہے ہوئے صدارتی کلمات -

اس وقت جو حضرات یہاں اس تعزیتی اجتماع میں شریک ہیں ، اس وقت آن کی کوئی موزوں یادگار قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں - میری ناقص رائے میں پروفیسر حمید احمد خاں کی سب سے بڑی یادگار یہی کالج ہے - اس کالج کے در و دیوار ، اس کے دریچوں سے آن کی یادوں کی روشنی آتی رہے گی اور اس کالج کے کمروں کے ہر گوشے سے آن کی آواز گونجا کرے گی -

ہمارے ایک دوست نے مجھ سے پہلے یہ فرمایا کہ ہم لوگ بڑی بڑی شخصیتوں کی آن کی زندگی میں قدر نہیں کرتے اور مرنے کے بعد انھیں بالعموم بھول جاتے ہیں - میرا احساس یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت کبھی نہیں مرتی ، ہمیشہ زلدہ رہتی ہے - عظیم شخصیت ، ہم لوگوں کی بنائی ہوئی مادی یادگاروں سے قائم نہیں ہوتی وہ خود ایک محکم یادگار ہوتی ہے -

یہ اس کالج کی خوش نصیبی ہے کہ وہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب جیسی جامع شخصیت سے وابستہ رہا - میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا ، یہ چند الفاظ محض نذرانۂ عقیدت ہیں -

میں آمید کرتا ہوں کہ آن کے اقارب ، آن کے احباب ، آن کے ہمکار ، اور آن کے عزیز شاگرد آن کی زندگی سے سبق حاصل کریں گے اور اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے آن کی یادوں کو تازہ رکھیں گے -

---

پروفیسر سید ابوبکر غزلوی

پروفیسر حمید احمد خاں کی شخصیت

جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی شخصیت کی بعض خصوصیتیں جو ابھری ہوئی تھیں میں آپ سے عرض کرتا ہوں - آن کی شخصیت کی ایک بات جس میں میرے لیے بڑی جاذبیت تھی ، یہ تھی کہ آن کی تحریر و تقریر میں آن کے الفاظ اور معنی دونوں میں کوئی ابہام نہیں ہوتا تھا - کوئی تعقید نہیں ہوتی تھی - آن کا تخمیل بہت صاف ستھرا اور اس کے لیے الفاظ کا انتخاب ہمیشہ بہت موزوں ہوتا تھا - وہ الفاظ کے چننے میں بڑی احتیاط برتتے تھے - بعض اوقات لوگ کہتے تھے کہ آن کی تقریر میں وہ روانی نہیں ہے جو عام خطیبوں کے ہاں ہوتی ہے - میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ وہ الفاظ کی موزونیت پر اس قدر زور دیتے تھے کہ بعض حالتوں میں آن کے سامنے بیسیوں لفظ کھڑے ہوتے تھے اور انتخاب میں انھیں وقت لگتا تھا - بات بڑی مرتب اور مربوط کرتے تھے - نجی گفتگو میں بھی آن کا انداز یہی ہوتا تھا - وہ الفاظ کی تکرار کے بھی دشمن تھے اور معنی کی تکرار کے بھی دشمن تھے - میں نے دیکھا کہ فالتو لفظ نہیں بولتے تھے - بلکہ اکثر پوچھا کرتے تھے کہ آپ نے یہ دو لفظ استعمال کیے ہیں ، کیا ایک لفظ کافی نہ تھا ؟

اسی طرح میں نے دیکھا کہ وہ بہت دقتِ نظر سے لفظوں کا تجزیہ کرتے تھے - میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک ماہر لسانیات (Linguist) تھے - اور ماہر لغات یا لغوی (Philologist) تھے - ایک دن آن کو ایک عبارت بنانا تھی - میں دفتر سے باہر کسی کام سے چلا گیا - جب لوٹا تو میں نے پوچھا ، کہیے وہ عبارت بن گئی ہے ؟ ڈرافٹ مکمل ہو گیا ؟ کہنے لگے نہیں ، میں سوچ رہا ہوں کہ ''آس کے متعلق'' ہونا چاہیے یا ''آس سے متعلق'' ہونا چاہیے ! اور اس پر وہ میری رائے پوچھنے لگے ! وہ

ایک ایک لفظ کے انتخاب میں بے حد احتیاط برتتے تھے -

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک صاحب انگزیری میں تقریر کر رہے تھے - میں آس وقت خاں صاحب کے قریب بیٹھا ہوا تھا - مقرر نے جب یہ کہا کہ Firstly, it happened like this... اور پھر کہا کہ ...Secondly ، تو خاں صاحب نے کہا کہ یہ آدمی Secondly نہیں کہ سکا - یعنی اس کا صحیح تلفظ تو ''سیکنڈلی'' ہے مگر یہ ''سیکینڈ'' کہہ رہا ہے ، جیسے پنجابی میں کہتے ہیں - مجھے خود علم نہیں تھا اس بات کا ! مگر میں نے اسے پلے باندھ لیا - کیونکہ مجھے بھی اس بات کا ذوق تھا - ایک طالب علم جہاں کہیں سے اچھی بات سنے ، آس کا فرض ہوتا ہے کہ آسے پکڑ لے - تو یہ تلفظ کی بات ، لب و لہجہ کی بات ، الفاظ کے انتخاب کی بات ، آس میں خاں صاحب بہت محتاط تھے - بات کو مرتب اور مربوط کرنا آن کی شخصیت کی بڑی ابھری ہوئی خصوصیت تھی -

میں نے یہ بھی دیکھا کہ آن کو کوئی باک نہیں ہوتا تھا یہ اس طرح کی بات پوچھنے میں بھی کہ یہ جو لفظ ہے اس کا کیا مفہوم ہے - ایک دن مجھے کہنے لگے کہ عربی کا شعر ہے :

تزول جبال الراسیات و قلبنا
عن المحبّ لا یخلو ولاّ یتغرلزل

جبال الراسیات کا یہاں کیا مفہوم ہے ؟ یہ بھی ایک علم دوست آدمی کی بہت بڑی خصوصیت ہے کہ علم کی تلاش اور طلب میں آس کے اندر ایک تواضع ہو - اور آدمی جھوٹے لبادے اوڑھ کر نہ بیٹھا رہے - کسی سے علم کی بات پوچھنے میں آس کو تامل نہ ہو - یہ بات بھی میں نے آن میں دیکھی -

انگریزی خاں صاحب کا مضمون تھا - اور آن کو بہت دسترس تھی انگریزی زبان پر - اس کے باوجود آن کی شخصیت کے بارے مین میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ مشرقیت آن کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی ، آن کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی - جس کو وہ اپنے اندر سے خود بھی نہیں نکالنا چاہتے تھے - یہ مشرقیت آن کو بڑی عزیز تھی -

ادھر وہ مغربی ادب کے بھی طالب علم تھے ، اور آن کی پوری زندگی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گزری تھی - اس لیے وہ مغربی تہذیب سے بھی بہت اچھی طرح سے آشنا تھے - اور یوں ہمیں آن کے ہاں مشرقیت اور مغربیت کا ایک حسین امتزاج نظر آتا تھا - آن کی مشرقیت آن کے مغربی لباس کے اندر سے بڑی آسانی سے نظر آتی تھی - بعض اوقات میں نے دیکھا کہ وہ آردو بولتے ہوئے عربی اور فارسی کے بہت بھاری بھر کم لفظ بولا کرتے تھے - یہ بھی آن میں موجود مشرقیت ہی کی ایک نشانی تھی - جب خاں صاحب کیمرج سے (غالباً ۱۹۵۴ع میں) واپس آئے تو آن کے اعزاز میں اسلامیہ کالج میں ایک عشائیہ ہوا - آن دنوں کالج کے پرنسپل میاں محمد شریف صاحب تھے - جیسا کہ دستور ہے ، عشائیہ کے بعد پہلے میاں شریف کھڑے ہوئے اور انگریزی میں تقریر شروع کی - انھوں نے کافی تکلف سے انگریزی میں چند جملے کہے - اس کے بعد خاں صاحب کھڑے ہوئے اور انھوں نے بات کا آغاز حاضرین کو یوں خطاب کر کے کیا ''میرے معزز دوستو اور عزیزو'' اور اس کے ساتھ انھوں نے آردو میں اپنی تقریر شروع کی - عشائیہ کا ماحول اس خیال سے مرآتب کیا گیا تھا کہ خاں صاحب کیمرج سے آئے ہیں اور کالج میں شعبۂ انگریزی کے صدر ہیں ، لیکن خاں صاحب تھے کہ بڑی منجھی ہوئی اور شستہ آردو میں تقریر کر رہے تھے - میں بہت محظوظ ہوا - خاں صاحب کی شخصیت میں ایک شائستگی ، ایک سلیقہ ، ایک قرینہ ، ایک وضع داری ، جو اب معاشرے میں عنقا ہوئی جاتی ہے ، نظر آتی تھی -

خاں صاحب گو اس دور کے آدمی تھے اور بعض اعتبار سے تجدد پسند بھی تھے لیکن آن میں یہ بات نہ تھی کہ زبان پر کچھ ہو اور دل میں کچھ ہو - ہمیشہ آن کی زبان آن کے دل کی رفیق ہوتی تھی - وہ جب بھی کوئی بات کہتے تھے تو ہم سمجھتے تھے کہ واقعی یہ بات اپنے جی سے کہہ رہے ہیں - آج دفتروں میں جب افسروں سے ملاقات ہوتی ہے تو ہمیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ہم آن کے سامنے کہاں کھڑے ہیں ، اور وہ جو بات کہہ رہے ہیں وہ کسی حد تک درست ہے اور کس حد تک محض ڈپلومیسی - یہ خاں صاحب کی نقاہت کی بات تھی - ہم یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ یہ بات کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی کریں گے -

خاں صاحب بہت حساس آدمی تھے - خود گفتگو کرتے ہوئے بہت محتاط تھے اور کسی کو ناخوش گوار بات کہنا یا خلاف تہذیب بات کرنا آن کو بہت ناگوار ہوتا تھا - اسی وجہ سے اگر کوئی شخص بھی آن سے ناشائستگی کی بات کرتا تو سخت برہم ہوتے تھے - انھیں اس سے بہت تکلیف ہوتی تھی - اور اس تکلیف کو وہ چھپاتے بھی نہیں تھے - وہ بہت واضح طور پر آن کے چہرے سے عیاں ہو جاتی تھی - مجھے آن کی یہ بات پسند تھی - میرا خیال یہ ہے کہ آدمی کی حسوں کا کند ہو نا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے - اور ذہین ہونا اور حساس ہونا ، یہ دو مترادف باتیں ہیں - پھر وہ آدمی جس کا دل خود صاف ہو اور جس کے مزاج میں لطافت ہو ، آس کے جی پر بڑی تیزی سے غبار آتا ہے اور آس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے -

آن کی وضع داری کی وجہ سے بعض اوقات آدمی آن سے خوفزدہ بھی ہوتے تھے - بعض صورتوں میں خاں صاحب خود یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ شخص میرے ساتھ ناشائستگی یا بدتہذیبی نہ کرے آس کو کچھ فاصلے پر رکھتے تھے - آن کے ذہن میں یہی ہوتا تھا کہ یہ آدمی جو حدود میں نہ رہنے کا عادی ہے کہیں مجھے تختۂ مشق نہ بنائے - اور اگر میں اپنی متانت اور سنجدیدگی کی وجہ سے اس کی زد سے بچ سکوں تو بہتر ہے - مگر اس کے ساتھ جب میں نے آن کو اندر سے جھانکا تو آن میں ایک عجب بھر پور تواضع بھی پائی - شاید اس تواضع کو ہر آدمی نہ دیکھ سکا ہو -

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ کوئی شخص واقعی صحیح طالب علم ہے یا یہ فن جانتا ہے تو آس شخص کے لیے ، آس کے فن کے لیے ان کے اندر عجب تعظیم اور احترام نظر آتا تھا - میں نے علم کی دنیا میں بھی ایک بخل پایا ہے ، جیسے سرمایہ داروں کی دنیا میں دولت کے بارے میں ایک بخل ہوتا ہے - میں نے دیکھا ہے کہ دوسرے کے علم یا آس کے فن کی تعریف کرنے میں علماء بہت بخیل ہوتے ہیں - لیکن خاں صاحب کو جب کوئی چیز اچھی لگتی تھی تو اپنی تمام وضع داری اور احتیاطوں کو چھوڑ کر وہ بے ساختہ اور دل کی گہرائیوں سے داد دیتے تھے - ایک دفعہ (غالباً ۱۹۷۲ع میں) شام ہمدرد میں احترام بارگاہ الٰہی کے موضوع پر میری تقریر تھی - اس تقریب میں

خاں صاحب بھی تشریف رکھتے تھے - جب میں نے تقریر ختم کی تو خاں صاحب نے نہایت گرم جوشی سے مجھے داد دی - مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے جو دعا دی وہ آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے - فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شعلۂ جوالہ کو تیز تر کرے - میں سمجھتا تھا کہ خاں صاحب میری حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں - مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی تھی بلکہ میں تو سمجھتا تھا کہ میں ایک طالب علم ہوں - لیکن آس وقت میں یہ ضرور سوچتا تھا کہ یہ کس قدر علم نواز آدمی ہیں ، کس قدر علم دوست شخص ہیں اور ان کے قلب میں کتنی وسعت ہے کہ ان کو کچھ خیال نہیں ہے کہ یہ مجھ سے کتنے سینیر ہیں - تو یہ میں آن کے حوصلے کی وسعت کی بات کر رہا ہوں ——

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

حضرت والد علیہ الرحمہ (حضرت مولانا داؤد غزنویؒ) پر مولانا ظفر علی خاں کے کچھ اشعار ہیں - جب کبھی خاں صاحب موڈ میں ہوتے تو مجھے دیکھ کر وہ شعر پڑھتے -

پہلے ان اشعار کا پس منظر سن لیجیے - بات یوں ہوئی کہ تحریک نمک میں جب پولیس نے میرے والد علیہ الرحمہ کو گرفتار کر لیا تو آپ پولیس کے ساتھ جاتے نہیں تھے - پولیس نے مجبور ہو کر آپ کو اٹھا کر موٹر میں بٹھا دیا - جب کورٹ پہنچائے گئے تو موٹر سے اترتے نہ تھے - پولیس نے آپ کو اٹھا کر جج کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا - جب سزا ہوئی تو جیل جاتے نہ تھے - پولیس نے اٹھا کر موٹر میں بٹھایا - جیل پہنچنے تو اترتے نہ تھے - پھر پولیس نے اٹھا کر موٹر سے اتارا - مولانا ظفر علی خاں بھی جیل میں تھے - یہ کشمکش دیکھ کر چند اشعار برجستہ انھوں نے کہے :

دی مولوی داؤد کو چڈی جو پولیس نے
احباب نے پوچھا بہ تعجب کہ یہ کیا ہے
کیوں لد کے چلے دوش حکومت پہ حضور آج
حضرت کی سواری کا طریقہ یہ نیا ہے

فرمانے لگے ہنس کے کہ میں عالم دیں ہوں
اور مرتبہ سرکار مین عالم کا بڑا ہے
اس واسطے مرکب کے عوض فرط ادب سے
خود اپنے تئیں آپ حکومت نے کہا ہے
ہے فخر یہ مجھ کو کہ مری ران کے نیچے
خود حضرت عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہے

یہ شعر وہ مجھے ہنس ہنس کر سناتے تھے -

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی سیرت پر طالب علمی کے زمانے میں ایک مقالہ لکھا تھا جو کتابی صورت میں ابھی چند سال پہلے ہی چھپا - آسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلٰوۃ و السلام سے خاں صاحب کو کتنی محبت اور عقیدت تھی - یہ کتاب میں بازار سے خرید کر لایا اور جب میں نے پڑھی تو مجھے یاد ہے کہ پڑھتے پڑھتے مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کتاب پر گرے اور کتاب ختم کرتے ہی خاں صاحب کو میں نے خط لکھا - حضور علیہ الصلوۃ و السلام کے ساتھ جس محبت اور عقیدت کا اظہار اس مقالے میں انھوں نے کیا ہے آس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنے دین دار آدمی تھے -

اسلامیہ کالج سول لائنز میں آن سے چند بار قرآن مجید پر گفتگو ہوئی - قرآن مجید کی زبان اور آس کے صوری محاسن (forms) پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ قدیم فن بلاغت کی روشنی میں لکھی گئی ہیں - علماء دین جب قرآن مجید کی زبان کا تجزیہ قدیم فن بلاغت کی روشنی میں کرتے ہیں تو اس دور کے طالب علم کے ذہن کو سخت دھچکا لگتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کئی صدیوں پرانے معاشرے میں چلا گیا ہے - خاں صاحب یہ چاہتے تھے کہ قرآن کی زبان کا جو حسن ہے ، اس کی جو ترکیبیں ، بندشیں ، اور محاورے ہیں اور اس کے الفاظ کا جو صوتی تاثر ہے ، ان سب کی بات اس دور کے اسلوب اور اس دور کے اصول تنقید کی روشنی میں کرنی

چاہیے - تو میں نے جو مقالہ لکھا ”قرآن مجید کے صوتی اور معنوی محاسن کا اجمالی جائزہ“ آس کے محرک خاں صاحب تھے - اور اس مقالے کو پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ہی کی نذر کروں گا -

مجھے ایک واقعہ یاد آیا - پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ، سید ذولفقار علی شاہ صاحب (سابق پرنسپل ایچیسن کالج) ، سید یعقوب شاہ صاحب (سابق آڈیٹر جنرل) اور میں ایک دفعہ ایک سرکاری کمیٹی کے رکن تھے - ہماری ایک مشاورت سید ذولفقار علی شاہ صاحب کے گھر ہوئی - اس میں مغرب کی نماز کا وقت آ گیا - اور میں کچھ مضطرب ہوا - خاں صاحب نے یہ بھانپ لیا - میں نے ان سے کہا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں نماز ادا کر لوں - تو انھوں نے کہا کہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہاں میٹنگ میں مغرب کا وقت ہو جائے گا اور وہاں نماز ہوگی - اس لیے میں ٹوپی بھی ساتھ لایا ہوا ہوں - ہم نماز اکھٹے پڑھیں گے - میں نے ان سے درخواست کی کہ نماز آپ پڑھائیں ، آپ میرے بزرگ ہیں - وہ مصر رہے کہ نہیں نماز میں آپ کے پیچھے پڑھوں گا - اور یہ بھی کہا کہ میں مولویوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا ، مگر آپ کے پیچھے میں ضرور نماز پڑھوں گا - تو میں الامر و فوق الادب آن کے حکم کی بجا آوری میں مصلّے پر کھڑا ہوا اور ہم نے اکھٹے نماز پڑھی - یہ آن کے اندر مشرقیت بھی تھی اور ایک تدین بھی تھا - ہوسکتا ہے کہ وہ تدین چھپا ہوا ہو یا اس کا اظہار بر ملا نہ کرتے ہوں مگر میں نے یہ دونوں باتیں ان کی شخصیت میں دیکھیں -

میں کچھ خلوت پسند آدمی ہوں - پنجاب یونیورسٹی میں بہت سے وائس چانسلر ہوئے ہیں - آن میں سے بعض ایسے بھی تھے جن سے میرے مراسم تھے - جن سے میرے خاندانی تعلقات تھے - مگر میری خلوت پسندی کہہ لیجیے کہ جب وہ وائس چانسلر ہوئے تو کبھی میں آن کے پاس مبارک باد دینے کے لیے نہیں گیا یا یوں کہہ لیجیے کہ نہ جا سکا - لیکن جب خاں صاحب وائس چانسلر ہوئے تو مجھے اس پر ایک خاص خوشی ہوئی اور میں اپنی خلوت پسندی کی عادت کے بالکل خلاف اپنے آپ کو آن کے کمرے میں جانے سے نہ روک سکا - جب میں وہاں پہنچا تو آن کے سیکریٹری نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کس کام سے آئے ہیں ؟ میں نے کہا مجھے

کوئی کام نہیں ہے - کیا کرنا ہے ؟ میں نے کہا میں صرف اس کرسی پر ان کو بیٹھے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں - مجھے ایک چٹ دی گئی ، جس پر ملاقاتی اپنا نام اور کام لکھتے تھے - اور مجھے کوئی بات سوجھتی نہیں تھی کہ میں اس پر کیا لکھوں کہ میں کیسے آیا - جب وہ چٹ اندر گئی تو انھوں نے کہا کہ فوراً اندر بھیج دیجیے ان کو - میں نے اس وقت اُن کو بڑی بے تکلفی سے شاید پہلی بار زندگی میں (کالج میں ہوتے ہوئے ایک تکلف سا تھا جو اب جاتا رہا) ، اور بڑی محبت سے جیسے کوئی دوست کسی دوست کو دیکھتا ہے ، اس طرح میں نے اُن کو دیکھا اور میری آنکھوں میں اس وقت بڑی شرارت تھی - وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے اُسی طرح جھکے ، اور شرارت سے انھوں نے مجھے اسی طرح دیکھا جیسے میں نے اُن کو دیکھا تھا - میری آنکھوں میں بھی تھا کہ ''اچھا تو آپ اب یہاں بیٹھے ہوئے ہیں - خوب ! بہت لطف آیا !'' اور ان کی آنکھوں میں بھی میں نے یہ بات پڑھی کہ ہاں دیکھو تمہارا دوست یہاں بیٹھا ہوا ہے ، اور تم مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو رہے ہو - یہ بات بزبان حال ہم دونوں نے اُس وقت کی -

خاں صاحب ایک مدت تک وائس چانسلر رہے اور میں اس ملاقات کے بعد بھی ان کے پاس جاتا رہا - مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ نظام تعلیم کے سلسلے میں مشرقی زبانوں پر جمود توڑنے کے لیے بعض تجاویز لے کر ان کے پاس گیا - انھوں نے مجھے وقت دیا اور میں وہاں پہنچا - مجھے یاد ہے کہ باہر بڑی بڑی شخصیتیں بیٹھی تھیں اور ان کے رقعے آ رہے تھے مگر وہ مسلسل میرے ساتھ ایک گھنٹہ گفتگو کرتے رہے - مجھے انھوں نے عصر کا وقت دیا تھا ، غالباً پانچ سے چھ بجے تک - میں چونکہ ان کے مزاج کو جانتا تھا تو جوں ہی چھ بجے ، میں نے گھڑی کو دیکھا اور ان سے کہا کہ میں معذرت خواہ ہوں ، میں نے آپ سے جو وقت لیا تھا وہ ختم ہو چکا ہے - تو انھوں نے کہا 'کیا واقعی ایک گھنٹہ ختم ہو گیا ہے ؟' میں نے یہ دیکھا کہ چاہے کتنی ہی بڑی شخصتیں باہر بیٹھی تھیں اور ایک درویش آدمی اُن کے پاس اندر بیٹھا ہوا تھا ، انھوں نے اس بات کی کچھ پرواہ نہ کی اور پورا گھنٹہ میرے ساتھ گفتگو میں منہمک رہے - اور مجھے آخری جملہ اُس وقت انھوں نے یہ کہا . . . کیا واقعی ایک گھنٹہ ختم ہو گیا ؟

پروفیسر نذیر احمد

''اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں''

''میرا تعلق مردہ دنیا سے ہے - اس لیے میرے افکار و احساسات آپ کو بہت قدیم معلوم ہوں گے - میں تقریباً چالیس برس قبل اس کالج سے تعلیم حاصل کر کے شاہراہ زندگی پر گامزن ہوا تھا -''

کچھ اس قسم کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں - ۱۹۷۳ع کی بات ہے - میں نے ایم - اے - کے طلبا او طالبات کے ساتھ ورڈز ورتھ پڑھنا مکمل کیا تھا - دل میں خیال گزرا کیوں نہ اپنی کمیوں کے ازالے کی خاطر اپنے استاد کو زحمت دوں - چنانچہ میں انھیں ملنے کلب روڈ پہنچا - پہلے کی طرح اب بھی ان کی گرج دار آواز دروازے کے باہر سے سنائی دے رہی تھی ، وہی نظم و ضبط ، وہی رکھ رکھاؤ ، جب میں اندر داخل ہوا تو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے - میں نے مدعا بیان کیا تو افسردہ ہو گئے :

''۶۹ع میں میں نے تعلیمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا - میری آخری تقریر راجشاہی یونیورسٹی کی کانو وکیشن کا خطبہ تھا - اس کے بعد سے تعلیمی درس گاہوں سے دور رہتا ہوں - اس کونے میں بیٹھا کتابیں بیچتا ہوں - میں کتب فروش ہوں - مجھے معاف کیجیے -''

میں نے اصرار کیا تو میری دعوت قبول کر لی - کیوں کہ وہ شاگردوں کی بات آسانی سے نہیں ٹال سکتے تھے - وہ ہمیشہ احترام کر کے احترام کرنا سکھاتے - شاگردی ان کے نزدیک سب سے بڑی سفارش تھی - کہا میں آپ کے مہمان کی حیثیت سے کالج میں جاؤں گا اور آپ کے طلبا سے بات کروں گا - ورڈز ورتھ کی شاعری اور فطرت میرا موضوع ہوگا -

تمہید کے طور پر میں نے چند کلمات کہے اور پھر انھوں نے تمہید شروع کی جس کی ابتدا میں اوپر نقل چکا ہوں ۔ ڈیڑھ گھنٹے تک لیکچر جاری رہا ۔ اردو اور فارسی شعروں سے مرصع لیکچر ۔ میرے طالب علمی کے زمانے کے ایک دن کی بازیافت ! وہی عالمانہ ثقاہت ، وہی ادیبانہ لطافت ۔ اس کے بعد انھوں نے متعدد سوالوں کے جواب دیے ۔ بردباری ، شفقت اور پیار کے ساتھ ۔ جاتے ہوئے مجھے چند کتابیں دے گئے ۔ آپ کے ہاں آ رہا تھا ۔ سوچا میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہی سہی ۔

کافی دیر تک کالج میں گھومتے رہے ۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ اپنی یادوں کو تازہ کرتے رہے ۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک عجیب قسم کے ناستیلجیا میں گرفتار ہیں ۔ اور جیسے کالج سے باہر جانے کو ان کا دل نہ چاہ رہا ہو ، مگر شاید انھیں کتب فروشی کا مشغلہ یاد آ گیا ۔ تیز تیز چلتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے اور کار میں سوار ہو کر کاب روڈ روانہ ہو گئے ۔

آج روایتی قدروں اور علم کا شیدائی استاد ہم میں موجود نہیں ۔ چند روز قبل پروفیسر حمید احمد خاں کے انتقال کی خبر اخباروں کے کونوں کھدروں میں چھپی اور یوں مردہ دنیا کی باتیں کرنے والا اسی دنیا کو سدھار گیا ۔ مجھے اپنی آخری بھرپور ملاقات یاد آئی ۔ ملاقات تو کمرۂ جماعت ہی میں زیادہ تر ہوئی ۔ مگر اس میں بھی میرے لیے خلوت کا ایک پہلو تھا ۔ جیسے اچانک یادوں کی لمبی ڈوری ہاتھ لگ جائے ۔ اور آج اس کی لمبائی اتنی ہی خوف ناک ہے ، جتنی موت اور حیات کے درمیان حائل خلا ! نموں نموں کرتا ہوا خلا ، جس کی معنویت کی تلاش میں ہم سب سر پھوڑتے رہتے ہیں ۔

ہر چھوٹا بڑا واقعہ ہمارے جذبات کی ترتیب اور ان کے آہنگ میں ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے ۔ بعض مرتبہ ایک وصفی تبدیلی ۔ موت ایک ایسا ہی واقعہ ہے ۔ اس کے نتیجے میں ایک دوری حائل ہو جاتی ہے ، جو صرف موت ہی کے ذریعے بایاب ہو سکتی ہے ۔ کسی ایسے شخص کی موت سے جس سے زندگی کا ایک قابلِ لحاظ عرصہ منسلک رہا ہو ۔ آدمی بحران سے دوچار ہوتا ہے ۔ ہر طرف یادوں کی چاندنی بکھر جاتی ہے ۔ ایسی چاندنی جو سب کے لیے ہوتی ہے ۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی موت سے ان کے

ہزاروں طالب علموں اور احباب کے ذہنوں میں جو چاندنی بکھری ہے ، اس میں میرا بھی حصہ ہے ۔

۱۹۵۴ع میں میں ایک دیہاتی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا ۔ ایک روز ہمارے انگریزی کے استاد نے بتایا کہ حبیبیہ ہال میں سال اول کے تمام طلبہ کے لیے ایک لیکچر ہوگا ۔ گبھرائے ہوئے چہروں سے ہال بھر گیا ۔ اچانک سٹیج پر تیکھے نقش و نگار اور سرخی مائل چہرے والا درمیانے قد کا ایک شخص نمودار ہوا ۔ سوٹ میں ملبوس ، موٹی ناٹ کی نکٹائی لگائے ، انھوں نے فر فر انگریزی بولنا شروع کر دی ۔ کہیں کہیں توقف کرتے جیسے اپنی باتوں کی تاثیر کا جائزہ لے رہے ہوں ۔ بیان انگریزی تلفظ کا تھا ، لفظ 'Syllable' کا بار بار تذکرہ ہو رہا تھا ۔ اکا دکا بات سمجھ میں آئی ، مگر مجھے ایک جستجو سی لگ گئی کہ آخر 'Syllable' کس بلا کا نام ہے ؟ انگریزی عروض سے مجھے آج تھوڑی سی جو واقفیت ہے ، سمجھتا ہوں اسی ابتدائی جستجو کی دین ہے ۔

یہ پروفیسر حمید احمد خاں سے میرا پہلا تعارف تھا ۔ دو سال تک ہم ان کو کالج میں آتے جاتے دیکھتے رہے ۔ کبھی چھوٹی سی صاف ستھری گاڑی میں ، اور کبھی سائیکل پر چشمے لگائے ، سولا ہیٹ پہنے ۔ اس زمانے کا مجھے صرف ایک واقعہ یاد ہے ۔ ایک کمرے سے قہقہے کی آواز آ رہی تھی ۔ اندر گھسا تو معلوم ہوا ڈرامے کی ریہرسل کروائی جا رہی ہے ۔ خاں صاحب بار بار قہقہہ لگاتے اور کہتے ، انگریز یوں قہقہہ لگاتا ہے ۔ آواز میں یہی لہجہ آنا چاہیے ۔ میں نے جو پانچ منٹ اس کمرے میں گزارے ، یہی فعل دہرایا جاتا رہا ۔

جب میں سال سوم میں پہنچا تو کالج کا ڈگری حصہ سول لائینز میں ڈی اے وی کالج کی عمارت میں منتقل ہو چکا تھا ۔ میں نے سوچا انگریزی آنرز کرنا چاہیے ۔ اس وسیلے سے میری حاضری پروفیسر صاحب کے کمرے میں ہوئی ۔ ہم کل چار طالب علم تھے ۔ میرے پاس کوئی کتاب نہیں تھی ۔ مجھے پروفیسر صاحب نے ہدایت کی کہ اگلی مرتبہ کتابیں لے کر آنا ۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا ، مجھے ایسا لگا کہ انھوں نے میرے بارے میں ایک رائے قائم کر لی ۔ اور یوں ہم میں محبت ، نفرت کا

ایک رشتہ قائم ہو گیا ۔ آہستہ آہستہ کتابوں والے آنرز چھوڑ گئے اور میں باقی رہ گیا ۔ باوجودیکہ پروفیسر صاحب مجھے کچھ زیادہ پسند نہ کرتے تھے ، انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی ۔ پانچ ، چھ استاد جو مجھے آنرز پڑھانے پر مقرر تھے ، انھوں نے مجھے بھی چھوڑ دینے کی ترغیب دی مگر پروفیسر حمید احمد خاں نے کہا جاری رکھیں ، شوق پورا کریں ۔ مجھے تنہا سمجھ کر بعض استاد قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے تھے ۔ ایک روز خاں صاحب نے پوچھا : کام کیسا چل رہا ہے ؟ میں نے عرض کیا شاعری پڑھانے والے استاد نے بالکل کچھ نہیں پڑھایا ۔ ایک دم طیش میں آ گئے ۔ ٹائم ٹیبل منگایا ، اور مجھے ہمراہ لے کر سیدھے اس کمرے میں پہنچے جہاں وہ استاد کلاس لے رہے تھے ۔ میری موجودگی میں ان کو سختی سے تاکید کی کہ ان کا کورس ختم ہونا چاہیے ۔ چنانچہ اس کے بعد کورس اتنی تیزی سے ختم ہونے لگا کہ میں استاد کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکا ۔ تاہم اتمام حجت ہوا ۔ خاں صاحب ان دنوں سربراہِ شعبۂ انگریزی تھے ۔ نہایت مصروف دکھائی دیتے تھے ۔ اپنی کلاسیں باقاعدگی سے لیتے اور اپنے ماتحت تمام استادوں پر کڑی نگرانی رکھتے ۔

آنرز کے دوران میں اگرچہ خاں صاحب سے مرا رابطہ بہت قریبی تھا اور وہ میری پڑھائی میں باقاعدہ دلچسپی لیتے تھے ، تاہم اس تعلق میں گداز پیدا نہ ہو سکا ۔ مجھے ان سے خوف آتا اور بعض مرتبہ مجھے لگتا کہ خاں صاحب مجھے پسند نہیں کرتے ۔

انھیں دنوں میں کبھی کبھار بزم فروغ اردو کے جلسے میں چلا جایا کرتا تھا ۔ وہاں پروفیسر صاحب کو اکثر شستہ اردو میں گفتگو کرتے سنا ۔ کبھی غالب پر ، کبھی اقبال یا ابن خلدون پر ۔ ان کا لہجہ ہمیشہ نپا تلا اور انداز متین ہوتا ، کبھی کبھی بات کرتے کرتے رک جاتے ، جیسے اچھے لفظوں کی تلاش ہو ۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانیں بولتے ہوئے وہ لفظوں کے انتخاب کا التزام کرتے ۔ مگر غصے میں بولتے تو ان کی تقریر میں بلا کی روانی پیدا ہو جاتی ۔ غالباً ان کی بہترین تقریریں بلحاظ خطابت کے ، وہ ہیں جو انھوں نے شدید غصے کے عالم میں کیں ۔

چند محفلوں کا جن میں پروفیسر صاحب نے شرکت کی ذکر کرتا ہوں ۔ ثقافت پر مذاکرہ تھا ۔ مقررین میں بڑے بڑے بلند پایہ دانشور شامل تھے ۔ پروفیسر صاحب

کی باری آئی تو انھوں نے اپنی بات میتھیو آرنلڈ سے شروع کی ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ، وہ مزاجاً آرنلڈ سے ہم آہنگ تھے ۔ اس لیے کہ ان میں بیک وقت نئے ، پرانے ، جدید اور قدیم کی طرف رحجان موجود تھا اور وہ عقل و وجدان دونوں کے مؤید تھے ۔ جزو کے بجائے ُکل کو ترجیح دیتے تھے ۔ ان کی نظر میں اجتماعیت کو انفرادیت پر تفوق حاصل تھا ۔ ان کو تاریخی ادوار میں گم اور زمانے کی گردش سے بے نیاز صداقتوں اور عمدگیوں سے لگاؤ تھا ۔ اسی ذہنی پس منظر کی بنا پر آرنلڈ کی وضع کردہ مشہور عالم تعریف کہ کلچر نور و لطافت Sweetness and Light سے عبارت ہے ۔ انھیں بہت مرغوب تھی ۔ ثقافت کی تعریف میں وہ ان تمام چیزوں کو شامل کرتے تھے ، جن کا اندراج اس ذیل میں مستند کتابوں میں ملتا ہے ۔ گو موسیقی سے انھیں واجبی سا لگاؤ تھا ، تاہم وہ اسے ثقافت کا اہم جزو تصور کرتے تھے ۔ ویسے بعض مرتبہ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جب وہ موسیقی کا ذکر کرتے ہیں ، تو ان کے پیشِ نظر کون سی موسیقی ہوتی ہے ؟ کلاسیکی موسیقی سے ، جہاں تک میں جانتا ہوں انھیں ایک چڑ سی تھی ۔ میں نے ایک مرتبہ استاد بڑے غلام علی خاں پر ان کا تبصرہ ایک نجی محفل میں سنا تھا ۔ وہ انھیں آواز کا بازی گر تصور کرتے تھے ۔ ہلکی پھلکی موسیقی ان کی ثقاہت کے منافی تھی اور مغربی موسیقی کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ مصوری کے بارے میں انھیں بہت سی علمی باتیں معلوم تھیں مگر جذباتی دلچسپی محدود سی تھی ۔ مجھے یاد ہے ، ایک مرتبہ عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں کی نمائش دیکھتے ہوئے وہ بار بار توصیفی جملے کہتے تھے ۔ صاحب کیا بات ہے ، چغتائی صاحب نے مغلیہ دور کے نقش و نگار کو کس خوبصورتی سے ابھارا ہے ۔ حسن و رعنائی کے پیچ و خم کو رنگوں میں نمایاں کر دیا ہے ۔ اس کے علاوہ مصوری میں ان کی دلچسپی کی مجھے کوئی مثال یاد نہیں ، جب کبھی تجریدی مصوری کا ذکر ہوا تو انھوں نے شد و مد سے مخالفانہ رائے دی ۔

مذہب کو وہ ثقافت سے علیحدہ نہیں سمجھتے تھے ، مگر ان لوگوں کے سخت خلاف تھے جو ثقافت کو مذہب سے الجھاتے ہیں یا اسے مذہب کا ایک حصہ بتاتے ہیں ۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک سالانہ جلسے کے موقع پر صدارتی خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے

اور کمروں کے باہر طالب علموں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے ۔ مگر اس غیر مربوط جشن آدم میں بھی وہ ہمیشہ طالب علموں اور اپنے درمیان افہام و تفہیم اور محبت و احترام کے پل تعمیر کرتے رہے ۔ انفرادی سطح پر پروفیسر صاحب نے سینکڑوں ایسے رشتے استوار کیے اور ان کو بڑی وضع داری سے نبھایا ، فی زمانہ بہت کم اُستاد ایسے ہوں گے جنھوں نے میکانکی نظام تعلیم کے خلاف عملی طور پر اتنی طویل جدوجہد کی ہو یا طالب علموں کی اتنی کثیر تعداد پیدا کی ہو جن پر کسی نہ کسی طور اُستاد کے رویوں کی چھاپ ہو ، جتنی کہ پروفیسر حمید احمد خاں نے ۔

پروفیسر صاحب زبان کے بہت بڑے اُستاد تھے ، نہ صرف یہ کہ وہ خود انگریزی اور اُردو کے عمدہ نثر نگار تھے ، بلکہ طالب علموں کو الفاظ کا صحیح استعمال سکھانے پر بڑی محنت صرف کرتے تھے ۔ زبان کا غلط یا الجھا ہوا استعمال انھیں ہمیشہ پریشان کر دیتا ۔ مجھے یاد ہے ہمارے ٹیو ٹوریل گروپ میں شامل ایک طالبہ کو انھوں نے بار ہا سمجھایا کہ سیدھے سادے فقرے لکھا کریں ، لفظوں کا زیاں نہ کریں ۔ سادگی اور صراحت سے بڑھ کر نثر کی اور کوئی خوبیاں نہیں ہو سکتیں ، جب وہ ہر مرتبہ مضمون لکھ کر لائیں تو فقرے بڑے طویل ، پیچیدہ ہوتے اور ان کی ترتیب غیر منطقی ۔ ایک روز کاپی دیکھتے ہوئے پروفیسر صاحب زور سے گرجے : میں کہتا ہوں پاؤں کے بل چلا کریں ، آپ کو سر کے بل چلنا کیوں بھاتا ہے ؟ اس ڈانٹ کے ساتھ ہی محترمہ کے آنسو بہنے لگے اور کاپی ہوا میں لہرائی ۔ مگر اس واقعہ کے بعد یقیناً خاتون لکھنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچتی ہوں گی اور کیا عجب ہے کہ آج اچھی زبان لکھنے والی بن گئی ہوں ۔

پروفیسر حمید احمد خاں سے مضمون درست کرانا ایک تجربہ تھا ۔ جہاں کوئی اچھا جملہ یا لفظ آیا ، وہاں توقف کرتے ، ہاں میں اس طرح کی تحریر پسند کرتا ہوں ، اور جہاں کچھ ان کی طبیعت پر بار گذرا فوراً عینک اتارتے ۔ ان کے جذبات چہرے پر لکھے ہوتے کلمات ادا ہونے سے پہلے ہی مفہوم واضح ہو جاتا ۔ سامنے بیٹھا شاگرد عجیب و غریب کیفیت سے دوچار ہوتا ۔ اس سے بے خبر کہ کب استاد کے منہ سے توصیفی کلمہ نکلے یا کب ڈانٹ پڑے ۔ دونوں واقعے ناگہانی معلوم ہوتے ۔

جن دنوں ہم پڑھتے تھے مجھے پروفیسر صاحب کا طریق کار اچھا نہیں لگتا تھا ، مگر آج جب کبھی انگریزی یا اردو میں کوئی خوبصورت جملہ لکھ پاتا ہوں تو ان کی شبیہہ نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے ۔ وہی چمکیلی آنکھیں ، مسکراتے لب جو بہت کم موقعوں پر زوردار قہقہے کے لیے حرکت کرتے ، ورنہ زیادہ تر ان کا کام انگریزی ، فارسی ، عربی ، ہندی اور اردو الفاظ کا صحیح تلفظ کرنا تھا ۔

پروفیسر حمید احمد خاں انسانی رشتوں کے روایتی ڈھانچے کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ انھیں مشرقی نظام خاندان کی افادیت پر پختہ یقین تھا ۔ وہ کالج ، یونیورسٹی بلکہ پورے معاشرے کو خاندانی اکائی کی توسیع خیال کرتے تھے اور اپنے آپ کو ان سب کا ذمہ دار ۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک زبردست تبلیغی جذبہ تھا ، اور ان کی انا بڑی توانا تھی ۔ مجھے اکثر اوقات یوں لگتا جیسے وہ سنگھاسن پر بیٹھے ہوں اور ہم سب ان کے گرد بیٹھے مطیع پیروکار ہوں ۔

دوستی ، محبت ، رواداری اور علم کو پروفیسر صاحب بڑی قدریں تصور کرتے تھے ۔ مگر جب کبھی روابط اصولوں سے ٹکراتے تو وہ دو ٹوک فیصلہ کر لیتے ۔ ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد جو اچھے سرکاری عہدے پر فائز ہیں ، ان سے ہماری ایک ہم جماعت طالبہ کی سفارش کرنے آئے ۔ خاں صاحب نے بڑے تحمل سے سمجھایا مگر وہ اصرار کرتے رہے ۔ پروفیسر صاحب کے چہرے پر سرخی کا شیڈ ایک دم گہرا ہو گیا اور انھوں نے زور سے کہا :

'Mr.— you have for ever gone out of my mind.'

اس قسم کے فیصلے وہ شاذونادر ہی کرتے ۔ زیادہ تر بردباری اور رواداری سے کام لیتے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ ان کے مراسم عمر بھر قائم رہے ۔ ان میں غالباً سرفہرست میاں بشیر احمد مرحوم ، مدیر 'ہمایوں' تھے ۔ میاں صاحب سے خاں صاحب کے روابط ان دنوں قائم ہوئے جب وہ نیو ہوسٹل میں رہتے تھے اور گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم تھے اور میاں صاحب ہمایوں کے مدیر تھے ۔ خاں صاحب گھر پر زیادہ ملاقاتیں پسند نہیں کرتے تھے ۔ مگر چند مرتبہ مجھے ان کے مکان واقعہ

بیگم روڈ پر جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے میاں صاحب کو شام کے وقت ان کے گھر پر پایا ۔ پروفیسر صاحب دیر آشنا تھے مگر جب ایک مرتبہ رابطہ قائم ہو جاتا تو اسے نبھانا خوب جانتے تھے ۔

پروفیسر صاحب کو ساری عمر یہ احساس رہا کہ وہ علیل تھے ۔ جب ہماری جماعت کو انھوں نے وداع کرنے کے لیے گھر پر مدعو کیا تو مجھے یاد ہے کہ باتوں باتوں میں انھوں نے اپنے ان خطوط کا ذکر کیا جو وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں اپنی والدہ صاحب کے نام لکھتے رہے ۔ بڑے دکھ سے کہتے ایک خط بھی تو ایسا نہیں جس میں لکھا ہو بالکل ٹھیک ہوں ۔ ان کے دمکتے چہرے کو دیکھ کر ان باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا مگر یہ حقیقت ہے کہ ان میں جسمانی توانائی اتنی نہیں تھی جتنی وہ اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ضروری خیال کرتے تھے ۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کے ارادوں کی تکمیل کو ان کی جسمانی صحت مانع نہیں تھی ۔ ان میں بلا کا اعتماد تھا ۔ ان کے پاس بصیرت ، مشاہدہ اور مطالعہ کا ایک قابلِ رشک ذخیرہ تھا ۔ علمی اور ادبی منصوبوں کی بھی کمی نہ تھی ۔ تحقیق و تنقید کے لیے ان کا مزاج بڑا موزوں تھا اور انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی فضیلت سے کم لوگوں کو انکار ہوگا ۔ سید عابد علی عابد مرحوم جیسے صاحبِ ذوق نقاد اور صاحبِ نظر عالم نے پروفیسر حمید احمد خاں کے غزل پر لکھے ہوئے طویل مقالے کو بطور سند کے من و عن اپنی کتاب ''انتقاد و ادبیات'' میں درج کیا ہے ۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ، غزل پر پروفیسر صاحب کے اس مقالے سے بہتر شاید ہی کچھ لکھا گیا ہو ۔ نکتہ رسی اور خیال فروزی کا امتزاج ! اسی طرح شاعری میں ہیجان پسندی پر چند صفحے کا ایک مضمون ہے ۔ ذرا دیکھیے اردو تنقید میں آپ کو اس قدر سلیقے کی تحریر نہیں ملے گی ۔ مثال اور دلیل ہاتھ ملائے قاری کو ساتھ لیے بصیرت کا دروازہ وا کرتے ہیں ۔ انگریزی زبان میں لکھے ہوئے دو مقالے میں نے محفل میں پروفیسر صاحب کی زبانی سنے ۔ ان کو کبھی چھپے نہیں دیکھا ۔ تاہم میرے ذہن میں ان کا گہرا تاثر محفوظ ہے ۔ سعدی اور غالب سے میری صحیح واقفیت

پروفیسر صاحب کے انھی مقالوں سے ہوئی ۔ عنوان مجھے یاد ہیں ۔ درج ذیل کیے دیتا ہوں ۔

1. Catagorical Comparative of Sa'adi.
2. Is Ghalib a Pessimist?

تقریر ہو یا تحریر پروفیسر صاحب سننے اور پڑھنے والے کے سینے میں اتر جاتے ۔ نہ علم کا ڈھیر دکھاتے ، نہ لفظوں کی منڈی لگاتے اور نہ ہی عبارت آرائی کرتے ۔ سیدھے سادھے انداز میں بات کہتے اور کیا خوب کہتے ۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ انھوں نے علمی و ادبی کام بہت کم کیا ۔ غالب ، حالی ، اقبال پر ان کی تحریریں خلافِ توقع حد تک کم ہیں ۔ میرے نزدیک اس کا باعث ان کی طبیعت میں تکمیل پسندی کا غالب رجحان تھا ۔ وہ ہر بات ، ہر تفصیل کو بہترین طریقے پر کرنا چاہتے تھے ۔ کچھ وقت ان کا دوسروں کو سدھارنے میں گزر جاتا ۔ مثلاً میں نے انھیں اپنے چپراسیوں کو سکھاتے ہوئے دیکھا ہے کہ فون کیسے سننا ہے ؟ بات کیسے کرنی ہے ؟ چلنا کیسے ہے ؟ دوسروں سے پیش کیسے آنا ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ ممکن ہے آپ کو یقین نہ آئے مگر ہے یہ امر واقعہ ۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہاسٹل میں قلعی کرکے دکھائی ۔ ایک دفعہ مجھ سے ذکر کیا کہ میرا ارادہ ہے کسی روز ہوسٹل میں لڑکوں کو کپڑے دھو کے دکھاؤں ۔ اگر ان کی نظر کسی نوٹس پر پڑ جاتی تو انھیں دکھ ہوتا کہ اس میں زبان کی غلطیاں ہیں اور جس تحریر پر ان کے دستخط ہونے ہوتے یہ ناممکن تھا کہ وہ لکھے لکھائے پر دستخط ثبت کر دیتے ۔ پہلے اس کی کایا پلٹ ہوتی ۔ چاہے تحریر کتنا ہی غیر اہم نوٹس کیوں نہ ہو ۔ وہ جب پرنسپل بھی تھے تب بھی نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دیتے تھے ۔ مجھے ایک دو مرتبہ انھوں نے کالج کی طرف سے دعوتوں میں بھیجا تو بلا کے پوچھا ۔ جوتے پالش کیے ہیں ؟ ٹائی کون سی باندھیں گے ؟ اسلامیہ کالج میں میرے آخری دنوں کا ذکر ہے ۔ خاں صاحب نے حکم دیا کہ تمام طالب علم یونیفارم پہنیں گے اور جن کے پاس پیسے نہیں انھیں کالج یونیفارم بنوا کے دے گا ۔ کالج کی طرف سے جن طلبہ کو یونیفارم ملی ، ان میں میں بھی شامل تھا اور میرے لیے پہلا موقع تھا کہ کسی درزی سے کوٹ سلواؤں ۔ ظاہر ہے اچھے درزی سے نہ سلوا سکا ۔ خاں صاحب نے

جب بلیزر پہنے دیکھا تو بڑی ڈانٹ پلائی ۔ کتابیں پڑھنے سے ہی تو عقل نہیں آ جاتی کپڑے سلوانا بھی آنا چاہیے وغیرہ . . .

ہر سال جب پروفیسر صاحب طالب علموں کے لیے تصدیق نامے لکھتے تو وہ ہر ایک کی شخصیت کے جلی اور خفی پہلؤں کو پیش نظر رکھتے ۔ ان کے لکھے ہوئے سرٹیفکیٹ ایک طرف تو طالب علموں کے کارناموں کا جائزہ ہوتے دوسری طرف ان کی مخفی صلاحیتوں کی نشان دہی کرتے ۔ کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر صاحب نے جو کچھ سرٹیفکیٹ میں لکھا ، مجھے لگتا ہے گویا انھیں خطوط پر معاشرتی سطح پر میرا شخصی اظہار ہوا ہے یا ہو رہا ہے ۔

باریک بینی اور جزرسی کے اس شغف نے ان کی توانائی چوس لی اور ان کے پاس اپنے علمی اور ادبی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت کم وقت بچا ۔ وہ جو کچھ غالب ، اقبال یا قائداعظم پر لکھ سکتے تھے ، نہ لکھ سکے ۔ مغربی ادب و فلسفہ پر وہ نظر رکھتے تھے ۔ مگر یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ان کا تنقیدی و تحقیقی جوہر چھوٹی چھوٹی مصروفیات کی نذر ہو گیا ۔ پروفیسر اے ۔ ایس ۔ بخاری کی موت پر انھوں نے کہا تھا کہ بخاری صاحب عظیم آدمی تھے ۔ مگر ان کی عظمت بوجوہ زائل ہو گئی ۔ کسی حد تک اس محاکمہ کا اطلاق خود خاں صاحب پر ہوتا ہے ۔ حمید احمد خاں نے بہت کم لکھا ہے مگر انھوں نے جتنا کام کیا ہے ، اس سے ان کی صلاحتیں مترشح ہیں ۔ وہ ہمارے تنقیدی سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کر سکتے تھے ۔ تعلیم کے موضوع پر نئی بات کہہ سکتے تھے انھوں نے انشایے بھی لکھے ہیں ۔ لیکن ان میں برجستگی کی کمی ہے ۔ غالباً وہ طبعاً اس صنف کے لیے موزوں نہ تھے ۔ مجھے ان کا ایک انشائیہ خاص طور پر یاد ہے ۔ ''انگلستان میں کتے کا معاشرتی مقام'' برجستہ اور شگفتہ ہونے کے بجائے انشائیہ بوجھل معلوم ہوتا ہے ۔ یہی حال ان کے ''میری بھارت یاترا'' کا ہے ۔

پروفیسر حمید احمد خاں بنیادی طور پر نقاد ، محقق اور استاد تھے ۔ بطور استاد پروفیسر حمید احمد خاں بہت کامیاب تھے ۔ ان کی شخصیت سے گویا اخلاق لہریں اٹھتی تھیں جو ان کے پاس آنے والے ہر شخص کو متاثر کرتیں ۔ ایک واقعہ سنیے ۔

جب پروفیسر صاحب پرنسپل مقرر ہوئے تو انھوں نے کالج کیمپس کا حلیہ بدل دیا اور اس کے بعد اساتذہ اور طلبا کا ایک اجلاس کھلے پلاٹ میں بلایا ۔ جہاں کالج کا جھنڈا لہریا گیا اور پروفیسر صاحب نے کالج کے Motto پر روشنی ڈالی ۔ آج تک میرے ذہن میں Duty اور Honour اس طور پر منسلک ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اسے عجیب اتفاق کہیے کہ برسوں بعد جب میں ملازمت کے سلسلہ میں اسلام آباد پہنچا تو مجھے ایسا کمرہ ملا ، جس کی کھڑکی کے پاس قومی پرچم لہراتا رہتا ہے ۔ یقین جانیں پہلی مرتبہ جب میری نظر پرچم پر پڑی تو مجھے پروفیسر حمید احمد خاں کا دمکتا ہوا چہرہ یاد آیا اور وہ الفاظ یاد آئے جو انھوں نے کالج کا جھنڈا لہراتے ہوئے اور Motto کی تشریح کرتے ہوئے کہے تھے ۔ میری طرح ہزاروں ایسے شاگرد ہوں گے جن کے دلوں میں پروفیسر صاحب نے توانا اخلاق جذبہ پیدا کیا ہوگا ۔ شاگردوں کے نقطہ ہائے نظر کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں زندگی بسر کرنے کے عمل میں جس اخلاق جرأت کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ انھیں حمید احمد خاں سے بقدر ظرف ضرور ملی ہوگی ۔ ایسا شخص جسمانی طور پر تو مر سکتا ہے ، مگر اس کے روحانی اثرات حیات کے رگ و پے میں ہمیشہ سرایت کیے رہیں گے ۔

اپنے ہزاروں عزیز طلبہ کے نام
جن کی محبّت و رفاقت نے میرے زمانۂ تدریس کو ایک انعامِ عظیم بنا دیا

ان میں سے بعض مجھ سے پہلے اِس خاکداں سے نکل گئے، اُن پر سلام
مگر اکثر بفضلِ خدا زندہ و سلامت اور خدمتِ ملک و قوم میں مصروف ہیں، اُن کو بھی سلام

پروفیسر حمید احمد خاں کی کتاب
"تعلیم و تہذیب" کا انتساب

راجہ مہدی علی خاں کے تین خط

راجہ مہدی علی خاں (مرحوم) پروفیسر حمید احمد خاں کے بھانجے تھے - وہ پاکستان کی آزادی سے پہلے ہی بمبئی چلے گئے تھے اور وہیں مقیم رہے - وہاں سے وہ وقتاً فوقتاً اپنے محترم ماموں کو خط لکھتے رہتے تھے - ہم ان خطوں میں سے چند خط پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں - نظم و نثر میں راجہ مہدی علی خاں کی مزاح نگاری مشہور ہے ، چنانچہ ان خطوں میں بھی اُن کی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں -

(۱)

۱۴۹ پالی روڈ
باندرہ ، بمبئی
۲۸ جنوری ۱۹۵۵ع

پیارے بھائی جان[۱]

اسلام علیکم - میرے تین چار خطوں کے جواب میں مدت دراز کے بعد آپ کا ایک خط موصول ہوا - لیکن اس خط میں اس مفصل خط کا کوئی ذکر نہ تھا جو میں نے آپ کو انگلستان بھیجا تھا -

فی الحال تصویر نہ بھیجیے - ہاں وہ تصویر کس کے پاس ہے جس میں آپ مجھے گود میں لیے بیٹھے ہیں - مجھے اس تصویر کی ضرورت تھی - اس کی ایک کاپی اگر بھیج سکیں تو بذریعہ رجسٹری بھجوا دیجیے -

آپ کی تمام زندگی مصروفیت اور پریشانیوں میں کٹی ہے - میرا خیال تھا کہ

۱- ماموں کے بجائے راجہ مہدی علی خاں بچپن ہی سے پروفیسر حمید احمد خاں کو بھائی جان کہتے تھے - اس سے اُن کو زیادہ قرب کا احساس ہوتا تھا -

وقت کے ساتھ آپ نے زندگی میں سکون ڈھونڈ لیا ہوگا ، لیکن آپ کا حال تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے بھی برتر ہے -

اگر آپ ہٹلر یا نپولین ، آئن سٹائین یا قائداعظم ہوتے اور زندگی کا کوئی بہت بڑا اہم کام آپ کے ذمے ہوتا تو روح ، جسم اور دماغ کو اتنی زیادہ پریشانیاں مہیا کر لینے پر میں زیادہ معترض نہ ہوتا - ایک پروفیسر کی زندگی تو بہت پُر سکون ہوتی ہے - آپ نے طرح طرح کی بلائیں کیوں گلے لگا رکھی ہیں ؟ آپ کی صحت بہت خراب ہو جائے گی اور عمر کم -

اگر آپ اب تک مطالعہ کرتے ہیں تو خدا کے لیے پڑھنا چھوڑ دیجیے - سب کتابیں اٹھا کر کسی ندی نالے میں پھینک دیجیے - اب آپ کافی پڑھ چکے ہیں - پڑھنے سے تو لکھنا اچھا ہے ، لیکن لکھنا بھی بے کار ہے - آدمی مر جاتا ہے تو کچھ عرصے تک لوگ اس کی تحریروں کی تعریف کرتے رہتے ہیں - اس سے مجھ کو یا آپ کو یا غالب کو کیا فائدہ ؟

تاثیر صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے تو آپ کسی پرچے کا ایک نہایت شان دار نمبر نکالتے ہیں ، اور اپنا خون خشک کرتے ہیں - دوسرے لوگ صرف جنازے میں شامل ہوتے ہیں - اس سے ان لوگوں کی صحت اچھی رہتی ہے اور آپ کی خراب -

اگر آپ کو اپنی صحت کی کچھ پروا ہو سکے تو میں آپ کو غذا کے سلسلے میں چند مشورے دوں گا - یہ غذا آپ ایک ماہ تک استعمال کیجیے ، اور اگر آپ کا کوئی مرض باقی رہ گیا تو جو چور کی سزا سو میری سزا - یہ "نسخہ" ایک بہت بڑے ڈائٹ سپیشلسٹ کا ہے - ہم لوگ بھی آج کل یہی غذا استعمال کر رہے ہیں - ہماری تمام بیماریاں غائب ہو گئی ہیں - رنگ نکھر گیا ہے - آنکھوں میں نور آ گیا ہے -

(یہاں راجہ صاحب نے خوراک کا ایک لمبا چوڑا نسخہ لکھا ہے جسے بخوفِ طوالت حذف کر دیا ہے)

فرمانبردار
راجہ مہدی علی خاں

——مجھے معلوم نہیں اب آپ کے نام کے ساتھ کیا لکھا جاتا ہے - فی الحال میں نے ایم - اے - آکسن لکھ دیا ہے - صرف ایم - اے - لکھتا تو آپ گالیاں دیتے -

(۲)

۵ اپریل ۱۹۶۰ع

پیارے بھائی جان - ہزاروں سلام - لاکھوں دعائیں آپ سب کے لیے - خدا آپ سب کو دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال کرے - آمین -

عزیزم وقار کی ہسپتال سے واپسی کی خبر موجب اطمینان ہوئی - لیکن جب معلوم ہوا کہ آپ نے اسے ڈانٹا بھی تھا تو آپ کو میں نے چپکے چپکے بہت سی باتیں سنا دیں —— چپکے چپکے اس لیے کہ کہیں آپ سن نہ لیں اور میری شامت آ جائے - میری طرف سے اس کو گیارہ پیار (زیادہ اس لیے نہیں کہ آپ کے پاس وقت نہیں ہوگا - گیارہ میں ہی دو تین منٹ لگ جائیں گے -) اور دوسرے بچوں کو بھی بہت بہت پیار ورنہ میرے خلاف ہو جائیں گے -

خدا کے لیے اب محنت اور دیانت داری کے جراثیم کو اپنے خون سے نکال کر باہر پھینکیے ورنہ آپ صحت اور تباہ کر لیں گے -

ایک پرنسپل کا کام صرف کاغذوں پر دستخط کرنا اور پروفیسروں کو ڈانٹنا ہے ، لیکن یقناً آپ نے لاکھوں مصیبتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے سر پر بٹھا لی ہوں گی - از راہ کرم اطلاع دیجیے کہ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ؟

محمود نظامی صاحب کے انتقال کی خبر مل گئی تھی - خدا انھیں غریق رحمت کرے - بہت زندہ دل اور لوگوں کے کام آنے والے انسان تھے -

سیعد بہت بے ایمان ہے - میرے دو خطوں کا جواب اس نے نہیں دیا - خیر اب امتحان کے بعد دے دے تو معاف کر دوں گا - ورنہ پٹ جائے گا کبھی میرے ہاتھوں -

میں نے اپنی بیماری سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے ۔ ادب کی دنیا میں پھر قدم رکھا ہے ۔ کوئی بیالیس نظمیں اس دو ماہ میں لکھی ہیں ۔ کیونکہ بیمار ہوں نئے نئے موضوع اور خیالات ہر روز سوجھتے ہیں ۔ ارادہ ہے کہ ایسی نظمیں لکھوں کہ سب شاعروں کو غش آ جائے ۔

تھوڑی سی رہبری کی بھی ضرورت ہے ۔ لیکن آپ نے میرے مشورے پر عمل کیا اور اپنے فرائض صرف دستخط کرنے اور پروفیسروں کو ڈانٹنے تک محدود رکھے تو آپ کو بھیج دیا کروں گا ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ ان کی اصلاح کرکے اپنا وقت ضائع کریں ۔ ایک مختصر نوٹ کے ذریعے ہر نظم کے بارے میں رائے سے آپ مطلع فرما سکتے ہیں ۔ ٹھیک میں خود کر لوں گا ۔ میں اپنی ہر نظم کا معیار ایسا رکھنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان میں صرف میں ہی میں نظر آؤں اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ خدا میری یہ خواہش پوری کرنے والا ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اس قسم کا دعویٰ کبھی نہیں کیا ۔

آپ کے خط کے لفافے پر ایک کونے میں نہایت شرافت اور انکسار سے چھپا ہوا تھا : حمید احمد خاں پرنسپل اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور ۔ ۱ ـــــ بجائے اس کے کہ دنیا کے عام لوگوں کی طرح آپ لکھتے ''یہ معلوم کرکے تمھیں بہت خوشی ہوگی کہ میں پرنسپل ہو گیا ہوں'' آپ نے صرف اپنا اسلامیہ کالج کا پتہ لکھ دیا ۔ یہ ادا آپ کی مجھے بہت پسند آئی ، اور میں خوب ہنسا ، اور بہت خوش ہوا ، اور پھر یکایک مجھے غصہ آ گیا ـــــ آپ کی قابلیت کے لحاظ سے آپ کو ''مصر'' کا یا کسی اور اچھے سے ملک کا بادشاہ ہونا چاہیے تھا ۔ آپ کے مرتبے کے لحاظ سے آپ کا کھانا پکانے والے کو کسی کالج کا پرنسپل ہونا چاہیے تھا ۔ لیکن تقدیر کنجوس مارواڑی ہے جس نے آپ کو پرنسپل بنا کر حاتم کی قبر پر لات مار دی ہے ۔

بہر حال میری طرف سے بہت بہت مبارک باد ۔

فرمانبردار

مہدی علی خاں

(۳)

از راجہ مہدی علی خاں

۱۱ دسمبر ۱۹۶۱ ع

عزیزم مہدی

السلام علیکم ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اپنے خطوں کا جواب لینے کے لیے تم ۵ بیگم روڈ ، لاہور آئے ، اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اندر بھیج کر باہر ساڑھے سات گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد چلے گئے ۔

بات یہ ہے کہ گھر پر کوئی تھا ہی نہیں اور مجھے پورے اٹھارہ گھنٹے کے بعد وزیٹنگ کارڈ دیکھنے کی فرصت ملی ۔ جب وزیٹنگ کارڈ پر تمھارا نام دیکھا تو بہت افسوس ہوا ۔ اگر مجھے ملنا ہو تو کم از کم ایک سال پہلے Appointment لینی پڑتی ہے ۔

فقط و السلام

فرماں بردار

حمید احمد خاں[1]

ایک عید کارڈ پر :

''میری طرف سے عید مبارک ! عیدی بذریعہ منی آرڈر بھیجنے کے بجائے یہیں آ کر دے دیجیے ۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے ۔ مہدی''

۱۔ یہ خط راجہ مہدی علی خاں نے پروفیسر حمید احمد خاں کی طرف خود اپنے طنزیہ انداز میں لکھا ہے ، کیونکہ ان کو پروفیسر صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیتوں پر بہت کوفت ہوتی تھی ۔ (مدیر)

محمد حنیف رامے

''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' کی افتتاحی تقریب میں تقریر

پروفیسر حمید احمد خاں کی کتاب ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' اُن کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ کتاب کی تعارفی تقریب ۱۱ فروری ۱۹۷۵ء کو سینٹ ہال میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے نے جو صدارتی تقریر کی، ذیل کا اقتباس اُسی سے ہے۔

محترمہ بیگم حمید احمد خاں صاحبہ، جسٹس ایس۔اے۔ رحمٰن صاحب، معزز خواتین و حضرات

حمید احمد خاں صاحب کی آواز میں اُن کی یہ تقریر سُن کر* مجھے وہ دن یاد آتا ہے جو دراصل میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔ جرمن کلچرل سینٹر میں ہفتۂ اقبال کی ایک تقریب میں پروفیسر حمید احمد خاں صدر تھے اور میں مہمانِ خصوصی، اور جناب حمید احمد خاں نے اقبال پر ایک انگریزی مقالہ پڑھا تھا۔** میں نے محسوس کیا کہ اقبال جس کی شاعری پیغمبری کی یاد دلاتی ہے، اُسے پہچاننے کی واقعی ابتدا ہو رہی ہے۔

ایک شاعر جب پیغمبری کے قریب جا پہنچے تو جس طرح پیغمبر کی لائی

---

* جلسہ میں ٹیپ ریکارڈر پر پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی تقریر کا دو منٹ کا ایک ٹیپ سنوایا گیا تھا۔

** How Iqbal composed "The Message of the East" (April 1973)

ہوئی وحی تشریح و تفسیر کی محتاج ہوتی ہے اُسی طرح اُس شاعر کا پیغام بھی تشریح طلب ہوتا ہے - آج پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ہمارے سامنے اقبال کے پیغام کی اسی طرح کی ایک تفسیر لے کر آئے ہیں - ہیں اس لئے کہ جو بھی شاعری اور فن اور لفظ کے میدان میں جا اُترتا ہے، وہ کبھی بھی "تھا" نہیں ہوتا - یہ میدان امر ہے، ایک آبِ حیات ہے - اس میں جوکوئی بھی آ جاتا ہے وہ چاہے بھی تو مر نہیں سکتا - اُس کا جسم اور اُس کی جان بے شک ہم میں موجود نہ رہے لیکن وہ اپنے کام اور کارناموں سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے - اگر اقبال اس لئے زندہ رہے گا کہ اس نے ایک دور میں جب چار سُو اندھیرا تھا اور یاس تھی ، اُمید کا ایک چراغ روشن کیا تو وہ لوگ جنھوں نے اقبال کے چراغ کی روشنی کو دوسروں تک پہنچایا ، وہ بھی اس حوالے سے زندہ رہیں گے - اس اعتبار سے حمید احمد خاں بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اُن کو "ہیں" کے صیغے سے ہی پکارا جائے تو صحیح ہے -

اقبال اپنے دور کا ایک مردِ مومن اور مردِ مسلمان تھا - لیکن یہ اصطلاحات کچھ فرسودہ ہوتی چلی جا رہی ہیں - کچھ اقبال کے مجاوروں نے اور کچھ ریڈیو کے قوالوں نے ان دونوں میں سے معنی نچوڑ لئے ہیں - اس لئے میں کہوں گا اقبال اپنے دور کا مرد تھا - اقبال کو پانے کی ابتدا مرد کو جاننے کی ابتدا ہے - وہ مرد جو اپنے دور کو ایک نئی زندگی دینا چاہتا ہے - وہ مرد فوت ہو چکا تھا جب اقبال پیدا ہوا - اسی مرد کی تلاش اقبال کو محمد علی جناح تک لے گئی - اسی کی تلاش میں اقبال نے فکر و فلسفہ کے تمام اوراق پلٹ ڈالے - اپنے اندر جھانک کر انسان کی باطنی زندگی میں گہری نظر ڈالی - اقبال مرد کو مستقبل میں تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے - وہ مستقبل جو ہم تک آ پہنچا ہے اور جو ہماری آنے والی نسلوں کی زندگیوں تک پھیلا ہوا ہے -

پروفیسر حمید احمد خاں کے اس مجموعہ مقالات میں اقبال کی زندگی اور شاعری اور فکر کے بارے میں جو مضامین شامل ہیں وہ ہمیں اقبال کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں - اور میں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں - لیکن میں سمجھتا

ہوں کہ اگر حمید احمد خاں صاحب نے اور ہمارے بعض دوسرے بزرگوں نے اقبال کو اوروں کی نسبت زیادہ بہتر اور زیادہ وسیع اور زیادہ گہرے طور پر پہچانا ہے تو یہ صرف ابتدا ہے ۔ مرد کو پہچاننے کی ۔ خدا کرے کبھی تو اس مرد کی اگر ہمیں نہیں تو ہماری آنے والی نسلوں کو زیارت ہو جائے ۔ وہ مرد جو آسمان سے آگ اتارتا ہے اور بجھے ہوئے دلوں کو زندگی کی حرارت دیتا ہے ۔

———

ایک خط

حنیف رامے ، مدیر "نصرت" بنام پروفیسر حمید احمد خاں ،

پرنسپل اسلامیہ کالج

مکتبہ جدید ، لاہور

۸ جون ۱۹۶۱ء

محترمی ڈاکٹر صاحب ، السلام علیکم

آپ نے جس محبت سے بھری محفل میں نصرت کا ذکر کیا اور جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا وہ آپ کی عالی ظرفی کا نشان تو ہے ہی ، میں بھی اس کے لیے آپ کا بے حد شکرگزار ہوں ۔ نصرت فی الحال تو آپ جیسے علم دوستوں کی خوشنودی ہی سے جی رہا ہے ، چونکہ اسے ایک اشاعتی ادارہ شائع کرتا ہے اس لیے یہ گاڑی چلی جا رہی ہے ، یوں رفتار حوصلہ افزا ہے —— جیسا کہ بزرگوں کا کہنا ہے ، اگر برخوردار جی جان سے لگا رہا تو انشا اللہ کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا ۔

میں آپ کی محبت اور دلچسپی کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

آپ کا صادق ، حنیف رامے

مدیر : نصرت

———

باتیں آن کی یاد رہیں گی

جناب قاضی سید احمد ، جناب سیف علی اور جناب محمد اکبر خان سے انٹرویو

جنوری کی ایک شام تھی، میں اسلامیہ کالج سول لائنز میں قاضی صاحب اور اکبر صاحب سے ملاقات کے لئے پہنچا - کالج قاضی صاحب اور اکبر صاحب میرا انتظار کر رہے تھے - مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وقت رک گیا ہے ، کالج کے سبزہ زار، درخت اور مانوس در و دیوار اپنے خشک چہروں سے اگلے وقتوں کے قصہ گو معلوم ہو رہے تھے ، مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہر شے زباں نکالے بول رہی ہے ، دوست تم اتنے دنوں کہاں رہے ہو ، ہم برسوں سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں - اور ہم اداس ہیں، بہت اداس- ایک ایک اینٹ پورے عہد کی داستان کہہ رہی تھی - یادوں کے سلسلے تھے جو طویل ہو رہے تھے - میں نے قاضی صاحب کو سلام کیا ، قاضی صاحب جو اسلامیہ کالج کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں - اسلامیہ کالج کے قصہ گو ہیں - آج میں ان سے کالج کے پرانے قصے سننے آیا تھا - وہ قصے جن کا تعلق پروفیسر حمید احمد خاں کی ذات سے ہے - ان کے ساتھ اکبر بھی تھے ، جو ایک لمبے عرصے تک خاں صاحب کے ساتھ بطور چپراسی کام کرتے رہے - دفتر میں سیف صاحب بھی تھے جو ان کے ٹائیپسٹ تھے - میں ان سے خاں صاحب کے بارے میں انٹرویو کرنے آیا تھا - کالج لان سے اٹھ کر ہم پرنسپل کے دفتر میں چلے آئے - اس وقت وہ کرسی خالی تھی جہاں خاں صاحب بیٹھتے تھے - کمرے کا مانوس ماحول پرانی آوازیں دے رہا تھا - در و دیوار چیخ رہے تھے کہ وہ شخص کہاں چلا گیا ، اسے لاؤ - اسے فوراً لاؤ ، ہم بے حد اداس ہیں - ہمارا برگد واپس کر دو ، ہم دھوپ میں جل رہے ہیں ، ہمیں سائے کی ضرورت ہے ، جاؤ اسے ڈھونڈو ، وہ کہاں کھوگیا ہے- آج وہ شخصیت یہاں موجود نہیں تھی جسے مل کر ہم ہمیشہ سکون پاتے

تھے ، جس نے ہمیشہ ہمیں مسکرا کے دیکھا - وقت بہت ظالم ہے وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا اور موت کتنی جابر ہے کہ وہ ہر سایہ دار درخت ہی کو کاٹنے میں فرحت محسوس کرتی ہے - اس کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ٹھنڈے اور پر سکون سایوں سے محروم کرتی جائے - ہمیں دھوپ میں اذیت دے کر ہی اسے دلی مسرت حاصل ہوتی ہے -

سعید احمد خاں بھی ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ موجود تھے - ان کے ساتھ ان کے تین سالہ بیٹے اور خاں صاحب کے پوتے محمد علی بھی تھے - ننھے محمد علی کو ہم نے اُن کے دادا کی کرسی پر بٹھا دیا - وہ وہاں ایک خالی کاغذ پر لکیریں کھینچنے میں مصروف ہوئے اور ہم نے انٹرویو شروع کیے - گفتگو دو ڈھائی گھنٹے جاری رہی - اس دوران میں محمد علی تھک گئے ، تو سعید صاحب نے پہلے اُن کو کالج کی سیر کروائی اور پھر سکوٹر پر گھر پہنچا آئے - اس عرصے میں میں نے جو انٹرویو لئے اُس کی خاص خاص باتیں پیش خدمت ہیں -

تبسم کاشمیری

جناب قاضی سید احمد سے گفتگو

سوال : آپ نے اسلامیہ کالج میں ایک لمبا عرصہ گزارہ ہے ، اوو کالج کے بنانے میں جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے آپ کا بڑا ہاتھ رہا ہے - بہت سے پرنسپل آپ کے سامنے آئے ہیں اور آپ نے ان سب کے ساتھ کام کیا ہے - آپ ہمیں یہ بتائیے کہ کون کون سے پرنسپل تھے جن کے ساتھ آپ کو کام کرنے کا اتفاق ہوا اور پھر یہ کہ خاں صاحب میں اور ان پرنسپلوں میں آپ کو بنیادی طور پر کیا فرق نظر آیا ؟

جواب : میرے زمانے میں جو پرنسپل صاحبان آئے اُن میں سب سے پہلے ایم- اے- غنی تھے - اُن کو گو انجمن نے کبھی مستقل نہیں کیا لیکن جب بھی موقع آیا اُنھوں نے یہ فرض انجام دیا - اُس کے بعد نیا آدمی آ جاتا تھا - اُن کے

بعد علامہ عبداللہ یوسف علی آئے - پھر مسٹر ولسن آئے اور پھر بی- اے- قریشی (جو بعد میں سفیر ہوگئے) اور پھر عمر حیات ملک (جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے) اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر ، پروفیسر ایم- ایم- شریف ، شیخ محمد اسلم اور پھر خان صاحب کا زمانہ بھی دیکھا - حق تو یہ ہے کہ ان تمام حضرات کا میرے ساتھ رویہ اچھا اور خوش کن تھا - لیکن جو صفات خان صاحب میں تھیں، اپنے ملازمین کے ساتھ اور طلبہ کے ساتھ وہ بالکل مختلف تھیں - ان کے زمانے میں کسی غریب لڑکے کو نہ تو کپڑے کی تکلیف تھی نہ کتابوں کی - پہلے ایسا نہیں تھا - یہ دور اب شروع ہوا کہ ہر سردی کے موسم میں طلبہ کے لئے کثیر تعداد میں سویٹر اور بلیزر تیار ہوتے تھے - اور پھر کتابیں بھی ملتی تھیں -

وہ اکثر مجھے بھی مشورہ کے لئے طلب کرتے - سٹاف میٹنگ میں اساتذہ سے تو مختلف مسائل پر مشورہ لیتے ہی تھے لیکن میری رائے بھی پوچھ لیتے تھے - اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پوری قدر کرتے تھے - بعض دفعہ کچھ سٹاف ممبر یہ اعتراض بھی کرتے تھے کہ کالج کے ہیڈ کلرک کی رائے کو اتنا وزن کیوں دیا جاتا ہے - تو خان صاحب جواب دیتے تھے کہ بھائی عقل کی بات تو قبول کرنی چاہیے ، چاہے وہ قاضی صاحب کہیں یا کوئی اور -

کئی دفعہ یہاں کالج میں خان صاحب کے ساتھ رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا - اب میں نے بہت اچھے اچھے پرنسپل دیکھے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا کہ پرنسپل صاحب پہلے تو مجھے ماڈل ٹاؤن میں گھر چھوڑنے جائیں اور پھر واپس اسی طرف کالج کی سمت لوٹیں جہاں بیگم روڈ پر اُن کا اپنا گھر واقع تھا - یا پھر سیف صاحب جو ہمارے ٹائپسٹ ہوا کرتے تھے ، وہ اگر کالج میں شام کو کام میں لگے ہوئے ہیں اور خان صاحب خود اُن کو کام دے کر گھر جا چکے ہیں تو ہر آدھ گھنٹہ بعد گھر سے فون کرتے ہیں کہ

بھائی، سیف کو چائے پلا دی ہے؟ پیسٹری ضرور دیجیے گا ۔ قاضی صاحب میں کل آ کر آن سے پوچھوں گا کہ ان کو یہ سب ملا یا نہیں ۔ اگر وہ کھانا کھانا چاہیں تو ضرور کھلائیں وغیرہ۔ ایسی باتیں تھیں جو آن کے وقت میں ہی ہم نے دیکھیں ۔

وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے تھے ۔ یہی وجہ تھی مجھ سے کوئی ایسی غلطی نہیں ہوتی تھی ۔ اس چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ جب وہ مجھ پر اتنا اعتماد رکھتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ میں کوئی ایسی بات نہ کروں جو قاعدے کے خلاف ہو یا کالج کے مفاد کے خلاف ہو ۔

آس زمانے میں پاکستان بھر میں طلبا کے ہنگامے بھی ہوتے رہے اور جلوس بھی نکلتے رہے لیکن اسلامیہ کالج میں کچھ اور ہی ماحول تھا۔ یہاں کے طلبا ہنگاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے ۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کسی خاص موقع پر لاہور کے تمام کالجوں کے طلبا نے جلوس نکالنا تھا ۔ خاں صاحب نے بھی سوچ بچار کے بعد اسلامیہ کالج کے طلبا کو جلوس میں شامل ہونے کی اجازت دی۔ خاں صاحب نے کالج کے جلوس سے خطاب کیا اور کالج یونین کے صدر کے حوالے کالج کا جھنڈا کیا اور کہا کہ اس جھنڈے کی آن کو قائم رکھنا اور کالج کے نام کو دھبہ نہ لگانا ۔ اگلے روز اخبارات نے لکھا کہ اسلامیہ کالج کا جلوس پڑھے لکھے لوگوں کا جلوس معلوم ہوتا تھا۔ اس کالج کے جلوس کے متعلق لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کون سا کالج ہے جس کے طلبا اتنے منظم ہو کر جا رہے ہیں ۔

کالج میں انھوں نے سوشل سروس سوسائٹی بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہاتھ سے کام کرنا اچھی بات ہے ۔ طلبا سے کہا کہ گھر کا کام آپ کو خود کرنا چاہیے ۔ کالج میں انھوں نے بعض ورک کیمپ منعقد کئے ، ایک دفعہ آپ نے کالج میں ایک دیوار بنائی یا کوئی میدان صاف کیا یا سڑک بنائی ۔ آپ خود بھی شامل ہوئے ۔ گارا آٹھایا ، اینٹیں آٹھائیں اور لڑکوں کو بھی ساتھ

شامل کیا ۔ غرض انھوں نے بے شمار کام کئے اور اس کالج کو بنانے کے لئے بہت محنت سے کام کیا ۔

سوال : پڑھنے لکھنے کا جو ذوق و شوق ایک نوجوان اُستاد کی حیثیت سے آپ نے اُن میں دیکھا اُس کے بارے میں کچھ بتائیں گے ؟

جواب : کالج میں بطور معلم وہ اپنا کام خوب نبھاتے تھے، انھوں نے اپنا پیریڈ کبھی نہیں چھوڑا ۔ ہمیشہ وقت پر آتے ۔ بعض دفعہ جب مجھے کالج اوقات کے بعد اُن کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملا تو ہمیشہ وہ علمی باتیں ہی کیا کرتے تھے ۔ میں نے اُن کی محفل میں بیٹھ کر کبھی دنیاوی باتوں کا چرچا نہیں سنا ۔ محفلوں میں گھریلو معاملات یا دنیاوی معاملات اور ہر قسم کے مذاق ہوتے ہیں لیکن ان کی محفل میں میں جب بھی بیٹھا تو ہر وقت یا تو کسی شاعر کا ذکر ہوتا یا مورخ کا ۔ ہمیشہ علمی باتیں ہوتی تھیں ۔ سیاست کی باتوں میں بھی کبھی نہیں اُلجھتے تھے ۔ اُن کے زمانے میں کئی حکومتیں آئیں اور گئیں ۔ انھوں نے کبھی کسی حکومت پر بحث نہیں کی بلکہ اپنے ہی کام سے غرض رکھی ۔

سوال : خاں صاحب ایک بیدار مغز اور باشعور انسان تھے ۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اُن کی طرح کا آدمی سیاست میں بھی دلچسپی نہ لے ۔ آپ نے کبھی اس قسم کی گفتگو سنی کہ ملک یا قوم کے بارے میں اُنھوں نے باتیں کی ہوں ؟

جواب : ہاں میں یہ کہوں گا کہ ملک و قوم کی بہبود کے بارے میں تو وہ عام طور پر باتیں کیا کرتے تھے لیکن یہ اُنھوں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ گورنمنٹ جو ہے وہ یہ غلطی کر رہی ہے وغیرہ ۔ کم از کم میں نے اُن کو اس قسم کی عام سیاسی بحثوں میں اُلجھتے نہیں دیکھا ۔

سوال : پہلے اسلامیہ کالج ایک تھا ۔ پھر یہ کالج دو حصوں میں تقسیم ہوا ۔ ایک

ریلوے روڈ اور ایک سول لائنز ۔ تو کیا خاں صاحب آپ کو خود اس کالج میں لائے یا انجمن نے آپ کو یہاں بھیجا ؟

جواب : پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے پرنسپل ہونے پر مجھے اس کالج میں بطور ہیڈ کلرک بلایا ۔ انجمن کو انھوں نے ہی لکھا کہ مجھے قاضی صاحب کی ضرورت ہے اور انجمن نے مجھے یہاں بھیج دیا ۔

سوال : میں اس کالج میں اس وقت آیا تھا جب شاید اسلامیہ کالج سول لائنز کو اس بلڈنگ میں منتقل ہوئے دو یا تین سال ہوئے ہوں گے ۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے ، یہاں بہت بُری حالت تھی ۔ چھتیں بھی خراب تھیں اور یہ جو ہم اس وقت سبزہ زار دیکھ رہے ہیں وہ بے آب و گیاہ پلاٹ تھے ۔ جہاں سائیکل سٹینڈ ہے وہاں آوارہ کتے پھرا کرتے تھے، خود رو پودے اگے ہوئے تھے ۔ جہاں کینٹین ہے یہاں ملبے کے ڈھیر پڑے ہوتے تھے ۔ بہت بری حالت تھی ۔ شاید ۱۹۵۵ء کے سیلاب کی وجہ سے ؟ تو قاضی صاحب آپ یہ بتائیے کہ خاں صاحب جب اس عمارت میں آئے تو انھوں نے کیا اقدامات کئے ، کس طرح سے اس کالج کو بنانے کی کوشش کی ، نہ صرف اس کی عمارات کو بلکہ اس کی بلند روایت کو بھی ؟

جواب : جی ہاں خاں صاحب نے اس کالج کی بلند روایات بنانے میں بہت محنت سے کام کیا ۔ ان کے زمانے میں کالج کے امتحانوں کے نتائج دیکھیے یا کھیلوں کی طرف دیکھیے یا طلبا کی تنظیم و اخلاق دیکھیے ۔ انھوں نے کالج میں مختلف ادبی مجالس کا آغاز کیا ۔ شمع تاثیر کے فرشی مشاعرے ان کے زمانے میں بڑی شان سے ہوا کرتے تھے ۔ لاہور کے کالجوں میں فرشی مشاعرے نہ اس سے پہلے کبھی ہوئے اور نہ اب کبھی دیکھے ہیں ۔ اب اگر آپ ایسا کریں بھی تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بات نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح کی ہر چیز میں خود خاں صاحب کی ذاتی دلچسپی اور شوق اور انتظام شامل ہوتا تھا ۔ اسی طرح خاں صاحب کھیلوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے ۔

کھلاڑیوں کی قدر کرتے تھے - اور اکثر خود میچ دیکھنے جاتے تھے -

سوال : انجمن حمایت اسلام کے ساتھ ان کا تعلق کس قسم کا تھا ؟ کیا کبھی ایسا ہوا کہ انجمن نے چاہا کہ ہم کوئی فیصلہ لا گو کر دیں ، اور خاں صاحب سمجھیں کہ غلط ہے اور انھوں نے انجمن کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا ہو ؟

جواب : جی ہاں ، بعض دفعہ انجمن کے ساتھ خاں صاحب کے تعلقات میں کھچاؤ آ جاتا تھا - بعض دفعہ استعفیٰ تک کی نوبت آ گئی - لیکن خاں صاحب کی بات ہمیشہ کالج کے مفاد میں ہی ہوتی تھی اس لئے انجمن کو ان کے فیصلے کا احترام کرنا پڑتا تھا -

جب اسلامیہ کالج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تو انجمن نے پہلے فیصلہ کیا کہ انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں سول لائنز میں ہوں گی اور ڈگری کی ریلوے روڈ کالج میں - خاں صاحب کو کئی وجوہات کی بنا پر یہ فیصلہ صحیح معلوم نہ ہوا اور انھوں نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ سول لائنز میں (جو یونیورسٹی کے قریب ہے) ڈگری کلاسیں ہوں - اس پر ایک طویل جنگ ہوئی - جس میں انٹرمیڈیٹ اسلامیہ کالج کے پرنسپل شیخ محمد اسلم نے خاں صاحب کی شدیدمخالفت کی - خاں صاحب کی بات آخر مان لی گئی - مگر شیخ محمد اسلم سے پھر ان کی پہلی سی دوستی نہ رہ سکی - یہ صرف خاں صاحب ہی تھے کہ شیخ محمد اسلم کے اچانک انتقال کے بعد انجمن کو انھوں نے مجبور کر کے شیخ صاحب کے بچوں کو چالیس پچاس ہزار روپیہ دلوایا - اور یہ انجمن کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کو اتنی رقم دی گئی ہو - یہ سب صرف خاں صاحب کی کوشش سے ہوا - یہ بھی خاں صاحب کی صفت تھی کہ چند دن پہلے وہ شیخ صاحب سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے لیکن اُن کے مرنے کے بعد سب بھول گئے اور اُن کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھ کر انھوں نے یہ

کام کیا -

سوال : قاضی صاحب ، شاید آپ کے زمانے میں یا آپ کے بعد کالج سے تین اساتذہ کو الگ کیا گیا --- سپرین صاحب کو ، منظور صاحب کو اور امین مغل صاحب کو - اگر خاں صاحب یہاں ہوتے تو کیا آپ کے خیال میں ایسی صورتِ حال یہاں ہوتی ؟

جواب : میرے خیال میں یہ چیز پیدا نہ ہوتی - وہ اس لئے کہ خاں صاحب ہر بات پر کڑی نظر رکھتے تھے - کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آنے دیتے تھے جس سے کہ کسی کو کسی قسم کی شکایت ہو - یہ اتفاق ہے کہ آن کے جانے کے بعد یہ واقعات رونما ہوئے اور انجمن کو دخل دینا پڑا - میرے خیال میں اگر خاں صاحب ہوتے تو شاید یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی کیونکہ آن کے زمانے میں کافی عرصہ یہ سب حضرات رہے ہیں کبھی کسی کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی - انھوں نے کبھی یہ موقع ہی پیدا نہیں ہونے دیا تھا -

سوال : جب خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو کیا آپ کو اس کا علم پہلے سے تھا ؟

جواب : ۱۹۶۳ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں صدر پاکستان محمد ایوب خان تشریف لائے اور اُس وقت ایک واقعہ پیش آیا جس سے پتا چلتا ہے کہ کام کرنے والے آدمیوں پر گورنمنٹ بھی نظر رکھتی ہے - انجمن کے اراکین جو صدر پاکستان کے استقبال کے لئے کھڑے تھے اُن میں خاں صاحب بھی تھے - مصافحے ہوتے رہے - جب صدر پاکستان قطار میں خاں صاحب کے پاس پہنچے تو فرمانے لگے کہ میں نے آپ کے متعلق بہت اچھی باتیں سنی ہیں - اُس کے بعد اپنی تقریر میں ایوب خان نے دوبارہ کہا کہ آپ کے کالجوں میں سے ایک کالج کے پرنسپل جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا (یہ شاید

مصلحتاً کہہ دیا) ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنی ذاتی مثال اور محنت سے اپنے کالج پر اور طلبا پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے -

اس لئے میرے ذہن میں کچھ تھا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ خاں صاحب یونیورسٹی میں چلے جائیں -

سوال : جب خاں صاحب وائس چانسلر مقرر ہوئے تو آپ کو اس کی اطلاع کس طرح ملی ؟

جواب : مجھے یاد ہے جس دن آن کا تقرر بطور وائس چانسلر ہوا آس دن خاں صاحب کسی کام سے گھر پر تھے- دوپہر بارہ بجے کے قریب گورنر صاحب کا ایک آفیسر خاص طور سے ایک حکم نامہ لایا اور سیدھا میرے پاس آیا کہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کہاں ہیں - میں نے فوراً آن کے چہرے سے بھانپ کر یہ کہا کہ میاں وائس چانسلر آج سے ہی ہوں گے یا کل سے ؟ تو اس نے کہا کہ آج سے - میں نے خاں صاحب کے گھر میں ٹیلی فون کیا کہ گورنر ہاؤس سے اس طرح کا آدمی آیا ہے جس کو میں گھر بھیج رہا ہوں اور مجھے یہ بات معلوم ہوتی ہے - خاں صاحب نے کہا کہ قاضی صاحب آپ کو شاید مذاق سوجھ رہا ہے - بہرحال تھوڑی دیر بعد خاں صاحب نے مجھے خود فون کیا اور وہی بات نکلی جو میں سمجھا تھا !

آن کے وائس چانسلر ہونے کے چند ہی دن بعد یونیورسٹی میں طلبا کے زبردست ہنگامے ہوئے- ایک روز طلبا مال روڈ پر لاٹھی چارج کے بعد وائس چانسلر کے دفتر پر حملہ آور ہوئے - سنا ہے کہ خاں صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے دروازے کے رستے دفتر سے چلے جائیں لیکن یہ مشورہ آنھوں نے قبول نہ کیا اور میں آج بھی حیران ہوں کہ وہ شخص کتنا جرات والا تھا - مشتعل طلبا نے آن کے دفتر کا تمام فرنیچر توڑ دیا اور خون کا بدلہ خون کے نعرے لگائے - خاں صاحب بدستور اپنی

جگہ پر رہے اور یہ آن کی شخصیت کا رعب تھا کہ آن پر کسی کو ہاتھ آٹھانے کی جرأت نہ ہوئی - جب مجھے اس ساری بات کا علم ہوا تو میں بھاگا وہاں پہنچا اور خاں صاحب سے گلے ملا اور رات تک آن کے دفتر میں بیٹھا رہا جہاں وہ زور و شور سے کام میں مصروف تھے - میں نے تو آن سے کہا کہ وہ زیادہ گہرائیوں میں نہ جائیں ، بس اپنا کام چلائیں مگر خاں صاحب کے کام کرنے کا انداز کچھ اور تھا -

سوال : وائس چانسلر ہونے کے بعد جب خاں صاحب یونیورسٹی میں چلے گئے تو آپ سے آن کی ملاقات تو ہوتی ہوگی ، آس وقت جب آپ آن سے ملتے تھے تو آن کے کیا احساسات ہوتے تھے؟ اور آپ کے کیا احساسات ہوتے تھے؟

جواب : اس کالج سے چلے جانے کے بعد ہمارے دلوں میں اور آن کے دل میں کالج کی قدر و عزت وہی تھی جو آن کی پرنسپلی کے زمانے میں تھی - میں جب بھی آن سے ملا ، نہایت تپاک سے ملے - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کوئی پرانا طالب علم جو کینیا کا تھا ، اور ایک بڑا افسر بنا ہوا تھا آس نے خاں صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو خاں صاحب نے مجھے اور سیف کو بھی مدعو کیا کیونکہ وہ اسلامیہ کالج کا طالب علم رہ چکا تھا اور ہم نے اکٹھے چائے پی - اس ایک واقعہ سے آپ کو کالج کے لئے آن کی محبت اور اخلاص کا کچھ اندازہ ہوگا - سڑک پر کبھی وہ کار میں گزر رہے ہوتے تو مجھے دیکھ کر ہمیشہ کار روکتے اور پوچھتے کہ کدھر جانا ہے اور اگر آن کا بھی وہی راستہ ہوتا تو بٹھا لیتے یا کہتے کہ وہاں تک تو میں آپ کو لے جا سکتا ہوں اور بٹھا لیتے -

۱۹۷۲ء میں جب مجھے ریٹائر کر دیا گیا —— ریٹائر کیا نکالا گیا، تو اس دن میں بہت پریشان تھا - گیارہ بجے کے قریب ان کا کالج میں ٹیلیفون آیا کہ قاضی صاحب کہاں ہیں ؟ میں اس وقت موجود نہیں تھا ، جب واپس آیا تو اطلاع دی گئی کہ خاں صاحب کا فون آیا تھا اور انھوں نے کہا

تھا کہ قاضی صاحب جب بھی آئیں مجھے ٹیلیفون کریں - میں نے ان کو ٹیلیفون کیا تو مجھے کہا کہ قاضی صاحب آپ فکر نہ کریں کہ آپ ملازمت سے علیحدہ ہوگئے ہیں - اللہ مالک ہے - جب تک ہم زندہ ہیں آپ فکر نہ کریں- ہمیں آپ کی فکر ہے- چنانچہ دوسرے دن ہی انہوں نے کوشش شروع کر دی کہ مجھے یہاں دوبارہ رکھ لیا جائے لیکن افسوس کہ یہ نہ ہو سکا- اس کے بعد خاں صاحب نے میرے لئے یہاں لاء کالج میں کوشش کی اور مجھے یہاں ملازمت مل گئی اور میں اب یہاں ہوں - رازق تو اللہ تعالیٰ ہے مگر سبب بھی وہی بناتا ہے - جتنی کوشش اس مرد خدا نے میرے لئے کی وہ شاید ہی کوئی اور کرتا - آج خاں صاحب اس دنیا میں موجود نہیں لیکن اب بھی جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ یاد آتے ہیں کہ وہ ہوتے تو یہ بات نہ ہوتی -

سوال : خاں صاحب سے آپ کی جو آخری ملاقات ہوئی ، اس کے بارے میں آپ کو کچھ یاد ہے ؟

جواب : آخری ملاقات میری ان سے اُن کے انتقال سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے جنوری یا فروری میں ہوئی - مجھے اُن سے کوئی کام تھا جس کے لئے میں نے اُن سے ٹیلی فون پر وقت لیا - فرمایا کہ صبح دفتر میں آ کر ملو - چنانچہ میں ان کے دفتر مجلس ترقی ادب ، واقع کلب روڈ پہنچا - اتفاق سے آپ میرے پہنچنے کے بعد دفتر پہنچے - کہنے لگے کہ قاضی صاحب آپ اب بھی اتنی صبح ماڈل ٹاؤن سے نکل پڑتے ہیں - آپ کی چستی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا - وغیرہ - پھر چائے پلائی- اور باتوں کے علاوہ انھوں نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کا ذکر کیا - اس زمانے میں اس کا جھگڑا چل رہا تھا اور اس سلسلے میں تحقیق ہو رہی تھی جس سے خاں صاحب کچھ مطمئن نہیں تھے - ہوا یوں کہ خاں صاحب نے صحیح تاریخ پر اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کا دن منایا - اُس کے بعد بھارت نے بھی اسی تاریخ کے مطابق

جشن منانے کا اعلان کر دیا - اور بعد میں تاریخ پیدائش پر تحقیق کا یہ دور شروع ہوگیا -

اس کے بعد بھی میں نے ایک دو دفعہ اُن سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر دفتر والوں نے بتایا کہ وہ کسی تحقیقی کام* کے باعث دفتر نہیں آ رہے ، بلکہ دفتر کے ضروری کام گھر پر ہی کر رہے ہیں -

---

جناب سیف علی سے گفتگو

سیف صاحب سے جو گفتگو ہوئی اُس کا خلاصہ انہیں کی زبان سے سنیے

۱۹۶۱ء میں اسلامیہ کالج سول لائنز میں ٹائپسٹ کی ایک آسامی کا اعلان ہوا تو میں بھی قسمت آزمائی کے لئے پہنچا - تین اُمیدوار اور بھی آئے بیٹھے تھے جو خاصے پُر اُمید دکھائی دیتے تھے - میں بھی ایک طرف دبک کے بیٹھ گیا - تھوڑی ہی دیر میں پروفیسر خواجہ محمد صدیق مرحوم جو اُن دنوں دفتر کے نگران تھے تشریف لائے اور ہمیں ایک ورق ٹائپ کرنے کے لئے دیا - بعد میں انٹرویو کے لئے پرنسپل صاحب کی خدمت میں پیش ہونا تھا - میرا نام سب سے آخر میں تھا - چق اُٹھا کر دفتر میں داخل ہوا تو ایک با وقار اور با رعب شخصیت سے آنکھیں چار ہوئیں - میں نے نہایت ادب سے سلام کیا - انھوں نے شفقت و محبت سے جواب دیا اور بیٹھنے کے لئے کہا - " آپ نے میٹرک کا امتحان کب پاس کیا ہے ؟" میں نے عرض کیا " جناب اسی سال " " کتنے نمبر حاصل کئے ؟" " جی ۵۶۶ -" " آپ نے ٹائپ نہایت عمدہ رفتار سے کیا ہے اور نمبر بھی اچھے ہیں - I appoint you -" آپ کل

*ان دنوں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب " اقبال کا نظام فکر" پر اپنا مقالہ لکھ رہے تھے-

آ جائیں ۔ قاضی صاحب سے وقت پوچھ لیں ۔ میں اپنی قسمت پر بہت نازاں تھا کہ خدا نے کیسے منصف مزاج آفیسر کے ہمراہ کام کرنے کا موقع دیا ہے ورنہ اس معاشرے میں ایسے لوگ کہاں ہیں ۔

اس پہلی ملاقات میں ان کا جو تاثر قائم ہوا اسے آج تک ٹھیس نہیں پہنچی ۔ میں سمجھتا ہوں اس آزاد مرد کی یہی وہ صفت تھی جس نے کالج کو وقار اور شہرت عطا کی اور یہ کالج ایک مثالی دبستان بن گیا جس کی روش روش میں انصاف کے پھول کھلتے تھے اور اس کی فضاؤں میں علم و فضیلت کی مہک تھی ۔ آپ کی سیرت و شخصیت کا یہ کمال تھا کہ کسی حالت میں بھی اپنی حدود سے نہ خود متجاوز ہوتے اور نہ دوسرا متجاوز ہو سکتا ۔ لیکن حفظِ مراتب کا انہیں ہمیشہ خیال رہتا ۔

یہ میری پہلی ملازمت تھی اور خاں صاحب ایک بہت ہی ذمہ داری اور پرواہ سے کام کرنے والے آدمی تھے ۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی ایسی ٹائپ شدہ چیز پر دستخط فرمائیں جس میں کسی قسم کی کوئی کمی ہو ۔ مثلاً کاغذ پر کوئی دھبہ یا کوئی کاما چھٹا ہوا نہیں رہ سکتا تھا ۔ یا بعض دفعہ وہ ٹائپ ہونے کے بعد بھی اپنی لکھی ہوئی تحریر میں ہی کوئی رد و بدل کرنا چاہتے تھے ۔ وہ ان سب چیزوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور مجھے بڑے پیار سے سمجھا دیتے تھے کہ بھائی اس کو دوبارہ ٹائپ کر لائیں ۔ بعض اوقات ایک خط کو مجھے چار چار دفعہ بھی ٹائپ کرنا پڑا ، لیکن وہ ناراض نہیں ہوتے تھے ۔

آپ پوچھتے ہیں کہ دفتر والوں کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ خاں صاحب کا رویہ کیسا تھا ؟ کیا میں نے اُن کو کبھی کسی پر ناراض ہوتے بھی دیکھا ؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ خاں صاحب صحیح بات اور صحیح آدمی پر ہمیشہ خوش ہوتے تھے ۔ اور جب کوئی شخص غلط بات یا بے اصولی کی بات کرتا تھا تو اُن کی طبیعت کو ناگوار گذرتا تھا اور آپ یقیناً ناراض ہوتے تھے لیکن آپ نے کبھی غصے میں بھی استقال کو نہیں چھوڑا ۔

ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ خاں صاحب نے مجھ سے معمولی سی ناراضگی کا

اظہار فرمایا ۔ کسی صاحب نے ٹیلیفون پر خاں صاحب کے لئے پیغام دیا ۔ میں شاید پیغام ٹھیک نہ سن سکا (اُس زمانے میں ٹیلیفون کی ایکسٹنشن ہیڈ کلرک کے کمرے میں نہیں ہوتی تھی ۔ صرف پرنسپل کے کمرے میں ٹیلیفون ہوتا تھا جو خاں صاحب نے اپنی میز پر رکھنے کی بجائے کمرے کے ایک کونے میں ایک کھڑکی میں رکھوایا ہوا تھا ۔ اس طرح فالتو ٹیلیفون ان کے کام میں حرج نہیں کرتے تھے۔) خاں صاحب جب اپنی میز سے اُٹھ کر ٹیلیفون سننے کے لئے گئے تو وہ کوئی اور ہی صاحب اور کچھ اور ہی پیغام تھا ۔ اس پر وہ مجھ سے کچھ برہم ہوئے لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے بلایا اور فرمایا "سیف اس میں آپ کا قصور نہیں تھا ۔ دراصل ان کی آواز ہی کچھ ایسی سریلی تھی کہ مجھے بھی سمجھنے میں مشکل ہو رہی تھی ۔" تو میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خاں صاحب اگر کبھی کسی سے یوں ناراض بھی ہوتے تھے تو تھوڑی دیر بعد دلجوئی بھی خوبصورت پیرائے میں فرمایا کرتے تھے۔ اس واقعے میں بھی اُن کے اعلیٰ اخلاق کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے ۔

انسانیت کا اصل جوہر آپ کی سیرت سے نمایاں تھا ۔ عید کی نماز سے فارغ ہوتے تو مسجد سے سیدھا کالج کا رُخ کرتے ۔ کالج کے چھوٹے ملازمین کو عید مبارک کہتے اور اُن کے بچوں کو پیار کرتے اور عیدی دے کر رخصت ہوتے ۔ کوئی بیمار ہوتا تو اُس کی عیادت کے لئے پہنچتے اور اپنی جیب سے دوا کی رقم ادا کرتے ۔ اور یہ معمول مرتے دم تک قائم رہا ۔ ابھی میں نیا نیا ملازم ہوا تھا ۔ سردی کے دن تھے۔ میں بغیر کوٹ کے کالج چلا آیا ۔ مجھے اس حالت میں دیکھا تو دوسرے روز ایک عمدہ کوٹ مرحمت فرمایا ۔ طلبا کے لئے ان کے دل میں بہت زیادہ شفقت تھی۔ اکثر کالج کا چکر لگاتے اور جہاں کسی طالب علم کو اس حال میں دیکھتے فوراً اس کی مدد فرماتے ۔ ۱۹۶۱ء میں پہلی دفعہ طلبہ کے لئے باقاعدہ یونیفارم کا قانون نافذ ہوا ۔ لیکن غریب طلبا کے لئے اس پر عمل ممکن نہ تھا ۔ چنانچہ اساتذہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنے گروپوں میں دیکھیں اور جس طالب علم کو مستحق جانیں اس کی سفارش کریں ۔ اور ایسے طلباء کو گرم جرسیاں مہیا کی گئیں ۔

کبھی کبھار کام زیادہ ہوتا تو چھٹی کے موقع پر بھی مجھے بلوا لیتے ۔ لیکن دوسرے دن اُس کے بجائے چھٹی دے دیتے ۔ آپ کے وہ مشفقانہ خطوط آج بھی میرا سرمایۂ حیات ہیں جن میں آپ نے دوسرے روز چھٹی کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی ۔ لیکن میں تو ایسے مواقع کی ہمیشہ تمنا کیا کرتا تھا کہ آپ سے قریب ہونے کا ایک بہانہ ملتا تھا ۔ کام سے فارغ ہوتے تو دیر تک گفتگو ہوتی رہتی ۔ بڑے لطف کی باتیں، بڑی محبت کی باتیں، بڑی دلجوئی کی باتیں کرتے تھے ۔

خاں صاحب اکثر شام دیر تک دفتر میں بیٹھے کام. کرتے تھے ۔ اور ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے ۔ لیکن اسے ہم کوئی مصیبت یا مجبوری نہیں سمجھتے تھے آن کا رویہ اور آن کا اخلاق ہی ایسا ہوتا تھا کہ ہم خود چاہتے تھے کہ جب تک خاں صاحب کام کے لئے دفتر میں رہیں ہم بھی آن کے ساتھ رہیں ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ رات کے آٹھ نو بج جاتے تھے ۔ ایک دفعہ کالج میں کام کرتے کرتے تقریباً نو بج گئے ۔ وہ غالب پر کوئی انگریزی مضمون لکھ رہے تھے ۔ شاید The Young Ghalib ۔ فرمانے لگے کہ سیف آج میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا ۔ میں نے کہا کہ خاں صاحب آپ خود بھی تو بہت تھک گئے ہیں ، آپ گھر تشریف لے جائیں ، میں کسی بس وغیرہ پر چلا جاؤں گا ۔ لیکن آنھوں نے اسرار کیا ۔ وہ مجھے ملتان روڈ پر نواں کوٹ تک چھوڑنے آئے ۔ گلی کے سامنے پہنچا تو میں نے کہا کہ مجھے یہاں آتار دیں یہیں میرا گھر ہے ۔ فرمانے لگے کہیں تکلف سے تو نہیں کہہ رہے کہ یہ تمہارا گھر ہے ؟ میں نے کہا ”نہیں جناب ۔ میرا گھر یہی ہے ۔“ اس پر انہوں نے مجھے آتارا اور کہا کہ مجھے دکھاؤ کہ تمہارا گھر کہاں ہے ۔ اور میں نے آن کو گلی بتائی ، تب وہ وہاں سے واپس ہوئے ۔ آن کو اپنے ملازموں کا اتنا خیال ہوتا تھا ۔

ادبی سرگرمیوں سے خاں صاحب کو بڑا لگاؤ تھا ۔ آپ کے دور میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ کوئی ادبی و علمی ہستی کالج میں تشریف نہ لاتی ہو ۔ لوگ تھے کہ کھنچے چلے آتے ۔ طلبا کی حاضری بھی بہت ہوتی ۔ لیکن مجال ہے کہ

کہیں ہلڑ بازی ہو جائے ۔ ایسی تقریبات میں ہمیشہ نظم و ضبط رہتا ۔ طلبا مسرور بھی رہتے اور مرعوب بھی ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شمعٔ تاثیر مشاعرہ ، جو کالج کی ایک امتیازی تقریب تھی کے دوران ایک طالبہ اپنا کلام سنا رہی تھیں ۔ طلبہ نے اپنے انداز میں داد دینی شروع کی تو آپ فوراً کھڑے ہوئے اور ہاتھ سے صرف اشارہ کیا ۔ محفل میں سکوت طاری ہو گیا اور سب نے مشاعرہ بہت لطف و سکون سے سنا ۔

۱۹۶۳ء میں بحیثیت وائس چانسلر یونیورسٹی میں تشریف لے گئے تو میں آن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ، آسی شفقت سے ملتے اور بہت محبت سے پیش آتے ۔ ۱۹۷۱ء میں قاضی صاحب (سابق ہیڈ کلرک اسلامیہ کالج) نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا ۔ ہم سب لوگ انہیں الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے ۔ گاڑی چلنے میں دس منٹ باقی تھے کہ خاں صاحب بھی تشریف لے آئے ۔ سب سے باری باری ہاتھ ملایا اور مجھے گلے لگا لیا ۔ محبت و شفقت کی یہ گرم جوشی اب کہاں میسر ہے ۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

آپ اپنے ساتھیوں کے مستقبل کا ہمیشہ خیال رکھتے جب بھی موقع ہوتا آن کی ترقی کے لئے راستہ ہموار کرتے ۔ میں اس کالج میں آیا تو صرف میٹرک پاس تھا ۔ آپ ہمیشہ فہمائش کرتے کہ اس علمی ماحول سے فائدہ اٹھا لو ۔ وائس چانسلر بننے کے بعد آپ نے طلبا پر علم کے دروازے کھول دئیے اور پرائیویٹ طور پر امتحان میں شرکت کے لئے باقاعدہ قانون بنا دیا اور میں نے بھی اس موقع سے فائدہ آٹھاتے ہوئے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کر لیا ۔

موت ایک سفاک حقیقت ہے ۔ یہ سچ ہے کہ آج خاں صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر میں آن کی یادوں کے آجالوں سے نہاں خانۂ دل کو منور کرتا رہتا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا آن کی یاد کو اپنے سینے سے لگائے رکھوں گا ۔ یہی تو میری زندگی کا وہ وظیفہ ہے جس کو کبھی بھول نہیں سکتا ۔

———

جناب محمد اکبر خان سے گفتگو

سوال : اکبر صاحب ، آپ یہ بتائیں کہ آپ کس سال اسلامیہ کالج میں ملازم ہوئے ؟

جواب : میں ۱۹۴۶ء میں ملازم ہوا تھا ۔

سوال : جب آپ ملازم ہوئے تو اس وقت خاں صاحب کالج میں تھے یا نہیں ؟

جواب : خاں صاحب کے ساتھ اس وقت میری کوئی واقفیت نہیں تھی ۔ نہ مجھے پہچان تھی ۔ میں اس وقت کالج میں کھیل کے میدان کا چوکیدار تھا ۔ میری ڈیوٹی کی نوعیت ایسی تھی کہ میں خاں صاحب سے واقف نہ ہو سکا البتہ جب خاں صاحب لندن گئے تو اس وقت پتہ چلا کہ یہ خاں صاحب ہیں اور لندن جا رہے ہیں ۔

سوال : تو پہلی دفعہ آپ کو ان کے متعلق ۱۹۵۲ء میں پتہ چلا ؟

جواب : جی ہاں ۱۹۵۲ء میں ۔ اس وقت کالج میں سب چھوٹے بڑوں سے ان کی ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے بتایا تھا کہ میں دو سال کے لئے باہر تعلیم کے لئے جا رہا ہوں ۔

سوال : یہ بتائیں کہ پہلی بار آپ کو ان سے کب سابقہ پڑا ؟ یعنی آپ کی ان سے بات چیت ہوئی ، ان کے ساتھ آپ کو کام کرنے کا موقع ملا ؟

جواب : جب وہ باہر سے ۱۹۵۴ء میں واپس آئے ۔ تو اس کے بعد خاں صاحب کے ساتھ ہماری واقفیت ہوئی اور بعد میں انھوں نے میرے ساتھ ہمیشہ گہری ہمدردی کا اظہار کیا ۔

سوال : جب وہ اسلامیہ کالج میں پرنسپل ہوئے تو کیا آپ اس وقت پرنسپل کے چپراسی تھے ؟

جواب : جی ہاں ۔

سوال : جب وہ یہاں پرنسپل ہو کر آئے تو آپ نے ضرور سوچا ہوگا کہ وہ نئے پرنسپل ہیں اور نہ جانے کیا سلوک کریں اور پھر بعد میں ان کا سلوک کیسا رہا ؟

جواب : خاں صاحب سے پہلے پرنسپل شیخ محمد اسلم صاحب کے ساتھ میری ڈیوٹی تھی ۔ وہ کچھ سخت مزاج تھے ، انھوں نے میرے ساتھ کچھ سختی کی تو میں نے استعفیٰ دینے کا ارادہ کیا ۔ خاں صاحب اس وقت لائبریری سپرنٹنڈنٹ تھے انھوں نے مجھے بلا کر سمجھایا کہ میرے ساتھ لائبریری میں کام کرو استعفیٰ نہ دو ۔ میں نے جواب دیا کہ لائبریری بھی شیخ صاحب ہی کے ماتحت ہے ۔

سوال : خاں صاحب تک آپ کیسے پہنچ گئے؟ یعنی ان کا تو پرنسپل کے چپراسی سے کوئی تعلق نہ تھا ؟

جواب : جی ہاں ۔ اس وقت ان کا چپڑاسی تھا خوشی محمد ۔ میں نے اس سے یہ بات کی کہ بھئی میں تو اس کالج سے جا رہا ہوں کیونکہ مجھے بہت تکلیف ہے ۔ شیخ صاحب صبح اذان ہوتی ہے تو کالج میں آ جاتے ہیں اور گیارہ بجے وہ چھٹی کر کے چلے جاتے ہیں اور بعد میں جب چھٹی کا وقت ہوتا ہے تو وہ ساڑھے بارہ یا ایک بجے دوبارہ آ جاتے ہیں ۔ دو بجے میری چھٹی کا وقت ہوتا ہے مگر وہ شام تک ادھر ہی رہتے تھے اور مجھے چھٹی نہیں ہوتی تھی جب خاں صاحب کو یہ پتہ چلا تو مجھے بلا لیا اور کہنے لگے کہ بھئی تم استعفیٰ نہ دو ۔ میرے پاس آ جاؤ ۔ میں نے کہا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ! وہ کیسے مجھے چھوڑیں گے؟ خاں صاحب نے کہا تم عرضی دے دو خیر میں نے درخواست لکھ کر دے دی کہ میری تبدیلی کی جائے ۔ اس بات پر شیخ اسلم صاحب بہت ناراض ہوئے ۔ اس کے بعد خاں صاحب نے تیسرے دن پوچھا کہ کیوں بھئی تمہیں اجازت ملی یا نہیں ۔ میں نے کہا نہیں جناب ۔ کہنے لگے کیا بات ہے ۔ میں نے کہا وہ مانتے نہیں ہیں

خاں صاحب شیخ صاحب کے پاس خود تشریف لے گئے ۔ انھوں نے شیخ صاحب کو سمجھایا کہ اکبر کالج کے ہر شعبے میں کام کرنے کا حق رکھتا ہے ۔ اس کی تبدیلی میرے پاس کر دیں، کچھ فرق نہیں پڑے گا ۔ آخر وہ مان گئے اور میں لائبریری میں چلا گیا ۔ جب خاں صاحب خود پرنسپل ہوئے تو مجھے کہا کہ بھئی ہمارے ساتھ آ جاؤ ۔ خاں صاحب اُس کے بعد میرا خیال ہے چھ سال پرنسپل رہے ۔ اُن کے ساتھ میری ڈیوٹی رہی ۔

سوال : اچھا یہ بتائیے پہلے آپ شیخ صاحب سے تنگ تھے ۔ خاں صاحب نے آپ کولائبریری میں بلا لیا اور پھر جب وہ پرنسپل ہوئے تو بجائے اس کے کہ آپ لائبریری میں ہی رہتے آپ یہاں آ گئے ، اس کی کوئی خاص وجہ تھی ؟

جواب : جی خاص وجہ یہ تھی کہ خاں صاحب کے ساتھ ہماری بہت زیادہ محبت تھی ۔ تو خاں صاحب جب پرنسپل بن گئے تو میں اُن کے ساتھ ہی واپس پرنسپل کے دفتر آ گیا ۔ اُس کے بعد خاں صاحب جب بھی کبھی کسی میٹنگ میں یونیورسٹی میں یا کسی کالج میں یا کسی جلسے میں جاتے تو کار میں مجھے ساتھ لے جاتے تھے ۔ ایک دفعہ موچی دروازے خواجہ غلام دستگیر صاحب (انجمن کے فنانس سیکریٹری) کے لڑکے کی شادی تھی تو مجھے ساتھ لے گئے۔ تو اُدھر کار سے اُترتے ہی کہنے لگے ، یہ سامنے جو دودھ کی دوکان ہے میں جب شیرانوالے دروازے میٹرک میں پڑھتا تھا تو اس دوکان سے دودھ پیتا تھا ۔ میں نے کہا خاں صاحب یہ تو بہت دور جگہ ہے ۔ آپ یہاں کیوں تشریف لاتے تھے ؟ کہنے لگے ایک تو دودھ صاف ہوتا تھا دوسرا دو پیسے رعایت تھی ۔ یہ بات مجھے یاد ہے ۔ باقی اور جہاں کہیں بھی جانا ہوتا تو مجھے ساتھ لے کر جاتے تھے ۔

سوال : پرنسپل کے طور پر آپ نے اُن کو کیسا انسان پایا ؟

جواب : خاں صاحب مجھ پر بے حد مہربان تھے اور ہر حالت میں خیال رکھتے ۔ ایک بار مجھے میعادی بخار ہوگیا تو میں تقریباً تین ہفتے بیمار رہا ، بخار

کے دوران میں خاں صاحب کو اطلاع ہوئی تو میرے کوارٹر میں تشریف لائے ۔ قاضی صاحب نے مشورہ دیا کہ مجھے گاؤں بھجوا دیا جائے ، خاں صاحب نے اسی وقت حکم دیا کہ اکبر کا تمام علاج میرے ذاتی خرچ سے ہوگا ۔ میں خدا کے فضل سے لاہور ہی میں ٹھیک ہوگیا ۔ اُس کے بعد ایک دفعہ سردیوں کا موسم تھا اور کالج میں چھٹیاں تھیں ۔ مجھے ایک ایسی تکلیف ہوگئی کہ رات کو میں ٹھیک ٹھاک سویا لیکن صبح میرے بازو کو کچھ ہوگیا ۔ جب خاں صاحب کالج تشریف لائے تو قاضی صاحب سے پوچھا کہ اکبر کہاں ہے ؟ قاضی صاحب نے کہا وہ تو بیمار ہے۔ تو پھر آپ نے پوچھا کہ کیا بیماری ہے ؟ قاضی صاحب نے کہا کہ اُس کو بخار بھی ہے اور کچھ تکلیف بھی ہے ۔ توکیا آپ نے دیکھا نہیں ہے؟ جی نہیں۔ پھر خاں صاحب نے کالج کے ڈاکٹر کو فون کر کے بلا لیا ۔ ڈاکٹر اسلم آ گئے ۔ اُن کو ساتھ لے کر اور قاضی صاحب کے ساتھ خاں صاحب میرے کوارٹر میں آئے ۔ اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیوں بھائی کیا بیماری ہے اس کو؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا "ٹھیک ہو جائے گا" "کب تک ؟" "ہو سکتا ہے کہ کل تک ٹھیک ہو جائے" خاں صاحب فرمانے لگے "نہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہی ٹھیک ہو جائے جتنا خرچ ہوگا کیجیے۔"

سوال : آپ کہتے ہیں کہ اُن کو آپ سے اور آپ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ کیا وجہ تھی اس کی ؟ وہ آپ کو کیوں پسند کرتے تھے ؟ کبھی اُنھوں نے آپ کو بتایا یا آپ کو پتہ چلا ؟

جواب : میرا خیال ہے خاں صاحب نے ایک تو مجھے آزما لیا تھا ۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ۔ خاں صاحب خود سچے آدمی تھے ۔ میں وقت کی پابندی کرتا تھا ۔ خاں صاحب کبھی کبھی چھٹی کے بعد یہ کہہ جاتے کہ بھئی تم چابی کسی چوکیدار کو دے جانا ۔ میں چار بجے کالج آ کر کچھ کام کرنا چاہتا ہوں ، تمہاری ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن میں خود آ جاتا تھا ۔

کہتے تھے کہ کیوں بھئی تم کیوں آ گئے ہو؟ میں کہتا تھا کہ جی میرا یہاں دل لگتا ہے ۔ میں خوش ہوتا ہوں ۔

سوال : اکبر صاحب یہ بتائیے کہ خاں صاحب آپ سے کبھی کسی بات پر ناراض بھی ہوئے تھے ؟

جواب : جی مجھے یاد نہیں رہا، شاید ہی کسی وقت ناراض ہوئے ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ بہت کم ـــــ شاید میں نے کبھی اُن کو موقع ہی نہیں دیا ۔ مجھے پروفیسر صاحبان کہتے تھے کہ بھئی کیا بات ہے کہ خاں صاحب کبھی تمہارے ساتھ ناراض نہیں ہوئے ۔ تو میرا جواب یہی تھا کہ میں نے کبھی موقع ہی نہیں دیا ۔

سوال : خاں صاحب کے دفتر کے اوقات کیا ہوتے تھے ؟

جواب : خاں صاحب کالج کے وقت کے بہت پابند تھے ۔ گھنٹی بجتی تو کالج میں ہوتے تھے ۔ جب چھٹی کا وقت ہوتا تو تشریف لے جاتے تھے اور شام کو بھی اکثر دوسری دفعہ کالج آتے تھے ۔

سوال : اچھا یہ بتائیں کہ جب وائس چانسلر ہو گئے تو آپ اُن سے کبھی کبھی ملنے جاتے تھے ؟

جواب : جی ہاں ۔ خاں صاحب جس دن وائس چانسلر ہوئے تو اُس دن اخبار میں میں نے صبح صبح دیکھ لیا کہ خاں صاحب وائس چانسلر ہو گئے ہیں ۔ یکم تاریخ تھی[1] ۔ میں خاں صاحب کی کوٹھی پر چلا گیا ۔ وہ کار میں آ رہے تھے ، مجھے دیکھ کر کار سے اُتر گئے اور سینے سے لگا لیا ۔ اس کے بعد وہاں ہمارے کئی پروفیسر صاحبان تشریف لے گئے ۔ خاں صاحب نے میری ڈیوٹی ٹیلیفون پر لگا دی تھی کہ میرے جو ٹیلیفون آئیں تو تم سننا ۔ جب چائے کا وقت آیا تو خاں صاحب نے بلا لیا کہ آ جاؤ بھئی ۔ میں

۱- یکم ستمبر ۱۹۶۳ء

نے کہا خاں صاحب، ٹیلیفون؟ "ٹیلیفون کو رہنے دو، اب یہ وقت ہے چائے پینے کا "۔ تو میں وہاں جا کر کھڑا ہو گیا ۔ خاں صاحب نے کہا کہ بھئی یہ ہمارا گھر ہے ۔ یہ دفتر نہیں ہے ۔ تمہیں دوسرے تو اسلامیہ کالج کے ایک چپراسی کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر میں تم کو چپراسی نہیں سمجھتا میں تو تمہیں دوست سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ اُن کی بات آج بھی یاد ہے۔ پہلے مجھے کرسی پر بٹھایا اور پھر خود بیٹھے ۔ میں نے کہا کہ خاں صاحب آپ تو کہتے تھے کہ میں وائس چانسلری کبھی قبول نہیں کروں گا اور اب ۔ ۔ ۔ تو کہنے لگے کہ بھئی کیا کروں یہ اب گورنمنٹ کا معاملہ ہے لیکن مجھے وائس چانسلری سے زیادہ پڑھانے کا شوق ہے ۔

سوال : اچھا اکبر صاحب یہ بتائیں کہ جو لڑکے اُن سے ملنے آتے تھے اُن کے ساتھ وہ کیسے ملتے تھے ؟

جواب : طالب علم کو کرسی پر بٹھاتے اور اس کے مسائل دریافت کرتے ۔ اگر کوئی طالب علم اوروں کے سامنے اپنی ذاتی غرض بیان کرنے میں شرم محسوس کرتا تو اس کی بات الگ کمرے میں سنتے ۔ پروفیسر محمد طفیل صاحب کی ڈیوٹی تھی کہ وہ غریب طلبا میں رضائیاں تقسیم کرتے تھے ۔ خاں صاحب غریب لڑکوں، کو گرم کپڑے حتیٰ کہ سلیپنگ سوٹ تک فراہم کر دیتے تھے اور اس مدد کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ جب کالج فنڈ ختم ہو جاتا تو وہ اپنی جیب سے پیسے مہیا کرتے تھے ۔

سوال : اکبر صاحب آپ ایبٹ آباد کے رہنے والے ہیں ؟

جواب : جی ہاں ۔ ایک بار خاں صاحب ہمارے گاؤں بھی تشریف لائے تھے ۔ اُس زمانے میں خاں صاحب یونیورسٹی میں تھے۔ اُن کا ایک ڈرائیور تھا، وہ بھی اُسی گاؤں کا تھا ۔ گرمیوں میں خاں صاحب ایبٹ آباد تشریف لے گئے جہاں سے میرا گاؤں تقریباً تیس میل ہے ۔ ایک دن صبح صبح رمضان ڈرائیور گاؤں آیا اور کہنے لگا کہ بھائی تمہیں معلوم ہے کہ خاں صاحب یہاں آ رہے ہیں؟

ہم نے کہا نہیں ۔ اور خاں صاحب کیسے آ سکتے ہیں اتنی دور ۔ کہنے لگا نہیں وہ آ رہے ہیں ۔ تم کہیں نہ جانا ۔ میں یہ پیغام سن کر بہت خوش ہوا ، خاں صاحب گیارہ بجے کے قریب گاؤں میں تشریف لے آئے ۔ گاؤں والوں نے جب یہ سنا کہ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی تشریف لائے ہیں تو وہ بڑے حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ۔ کیونکہ ایک دور دراز گاؤں میں وہ بھلا کیا کرنے آ سکتے تھے ۔ سب لوگ ان کے منتظر تھے ۔ یہ میرے لئے بڑی عزت کی بات تھی ۔ وہ چار گھنٹے گاؤں میں رہے ۔ سب لوگوں سے پیار و محبت اور خلوص سے پیش آئے کہ آج تک وہ لوگ اُس ملاقات کو یاد کر رہے ہیں ۔ ان کی وفات کی خبر جب ان لوگوں تک پہنچی تو انہیں بہت صدمہ ہوا ۔

سوال : خاں صاحب لائبریری سے آپ کو پرنسپل آفس لائے۔ جب وہ وائس چانسلر ہوئے تو اُنھوں نے یہ نہ چاہا کہ آپ کو یونیورسٹی بھی لے جائیں ؟

جواب : جی ہاں ۔ یونیورسٹی میں تقرر کے دوسرے دن جب کالج کھلا تو خاں صاحب چارج دینے یہاں تشریف لائے ، کہنے لگے کیوں بھئی کیا خیال ہے یہاں رہیں گے یا ہمارے ساتھ چلیں گے ۔ تو میں نے کہا جناب اسلامیہ کالج میں بہت عرصہ ہو گیا ہے ، میں یہیں رہوں گا ۔ ہنس کر کہنے لگے کہ ہاں بھئی ٹھیک ہے ۔ میں بھی خوش ہوں کہ تم یہیں رہو ۔ خاں صاحب نے یہ بھی کہا کہ یونیورسٹی میں ڈیوٹی عارضی ہے ۔ کیا معلوم کب تک رہے ؟ اُس کے بعد خاں صاحب نے مجھے دو دفعہ بلایا کہ بھئی حبیب بنک یا یونائیٹڈ بنک میں اگر آپ چاہیں تو میں تمہیں نوکر کروا دوں ۔ میں نے کہا نہیں جناب میں اسلامیہ کالج میں ہی خوش ہوں ۔

سوال : کوئی یادگار واقعہ سنائیے ۔

جواب : ایک اور واقعہ ہے کہ انجمن والوں سے طلبہ نے فیس کم کرنے کا مطالبہ کیا تھا ۔ خاں صاحب متفکر تھے ۔ اُنھوں نے قاضی صاحب سے بھی

کئی بار کہا تھا کہ انجمن والے مانتے نہیں ۔ آخر لڑکے ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ کریں گے ۔ چنانچہ یہی ہوا ۔ لڑکوں نے جلوس نکالا ۔ خاں صاحب کو علم ہوا تو کالج تشریف لائے۔ آتے ہی قاضی صاحب کو بلایا اور کہا کہ میں استعفیٰ دے رہا ہوں ۔ جس پرنسپل کے خلاف جلوس نکل جائے اُس کا اُس کالج میں رہنا مناسب نہیں ۔ قاضی صاحب کہنے لگے کہ خاں صاحب یہ تو ہوتا ہی ہے ۔ کوئی ایسی بات نہیں ٹھیک ہو جائے گا ۔ خاں صاحب فرمانے لگے کہ نہیں مجھے یہاں رہنا پسند نہیں ہے ۔ اُنھوں نے استعفیٰ دے دیا مگر انجمن والوں نے منظور نہیں کیا ۔ مگر وہ استعفیٰ واپس نہیں لے رہے تھے ۔ تو مجھے اس چیز کا بہت دکھ تھا ، جب خاں صاحب اپنے کمرے سے باہر تشریف لائے تو میں ان کے ساتھ لپٹ گیا ۔ اُس وقت میں بہت زیادہ رویا ۔ خاں صاحب کے بھی آنسو آ گئے کہ بھئی تم کیوں گھبراتے ہو ۔ کوئی ایسی بات نہیں فکر مت کرو ۔ اس کے بعد انجمن کے اراکین اکٹھے ہوئے اور اُنھوں نے خاں صاحب کو بمشکل رضامند کیا ۔ رات کے سات ساڑھے سات بجے اُنھوں نے استعفیٰ واپس لیا ۔

سوال : آپ خاں صاحب سے آخری دفعہ کب ملے ؟

جواب : آخری دفعہ اُن سے وفات سے دو تین مہینے پہلے ملا ۔ اُس دن ہمارے کالج میں چھٹی کا دن تھا ۔ میں صبح خاں صاحب کے گھر پہنچا تو وہ دفتر جا رہے تھے ۔ کہنے لگے کیوں بھئی کیسے آئے تم ؟ میں نے کہا جناب میں صرف آپ سے ملاقات کے لیے آیا تھا ۔ تو تین چار منٹ میرے ساتھ بات وات کی ۔ اُس کے بعد کہنے لگے کہ اچھا کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔ میں نے کہا نہیں صاحب میں تو صرف سلام کرنے آیا تھا ۔ فرمانے لگے کہ اچھا پھر کسی چھٹی کے دن آنا ۔ میں اُس کے بعد نہیں جا سکا ۔

سوال : اکبر صاحب ہم اب گفتگو ختم کرتے ہیں ۔ آخر میں میں ایک سوال کروں گا کہ خاں صاحب کی شخصیت کے بارے میں آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے ؟

جواب : وہ پر وقار شخصیت کے مالک تھے اور نہایت غریب پرور انسان تھے۔ انھوں نے اپنے ہر طالب علم اور ملازم کا ہمیشہ خیال رکھا ۔ اپنے سینکڑوں طالب علموں کو ذاتی کوششوں سے ملازم کروایا ۔ بعض طلبہ کی شخصی ضمانت بھی دی ۔ کالج کا ایک چپراسی عزیز الرحمن فوت ہوا تو اس کے کوارٹر میں دعائے مغفرت کے لئے گئے ۔ بعد میں اس کے بچوں کی ہر ممکن مدد کی ۔ میں جب ان سے ملنے گھر جاتا تو اپنے پاس بٹھاتے، میں اسے اچھا نہ سمجھتا تو مجبور کرتے اور کہتے کہ اس وقت آپ میرے مہمان ہیں ۔ میں جتنا عرصہ بھی اُن کے ساتھ رہا، اُنھوں نے کبھی بھی مجھے سخت الفاظ میں نہیں بلایا ۔ ان کی ذات صفات کا مجموعہ تھی ۔ ان کے ہزاروں احسانات ہیں ۔ عید کے روز صبح کو وہ کالج کے ہر چپراسی سے ملنے کے لئے اُس کے کوارٹر میں جاتے تھے، وائس چانسلر ہونے کے بعد بھی آتے رہے۔ ایک بار عید کو پروفیسر افتخار احمد صدیقی انھیں ملنے کے لئے گھر گئے ۔ خاں صاحب نے کہا آپ ٹھہریں میں ذرا کالج جا رہا ہوں ۔ صدیقی صاحب نے کہا کہ آج تو کالج بند ہے ۔ خاں صاحب نے بتایا، مجھے جن لوگوں سے ملنا ہے وہ وہیں کوارٹروں میں رہتے ہیں ۔

ان کے انتقال سے مجھے بے حد دکھ ہوا ہے، وہ میرے افسر ہی نہیں بزرگ بھی تھے ۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے ۔ آمین

پروفیسر حمید احمد خاں کے تین خط

۱۔ والدۂ ماجدہ کے نام[1]

امپرس ہوٹل، فتح پوری

دہلی

۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء ۱۱ بجے صبح

مکرمہ و معظمہ جناب والدہ صاحبہ دام ظلکم

اسلام علیکم ۔ میں نے پرسوں صبح یہاں پہنچنے کے بعد جو کارڈ آپ کو لکھا تھا، اس میں یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ہو سکا تو اسی شام بیٹھ کر مفصل خط لکھوں گا ۔ پرسوں شام میں نو بجے کے قریب گھر (یعنی ہوٹل) آ گیا تھا اور اگرچہ میں گیارہ بجے کے بعد سویا مگر آپ کو خط لکھنے کا موقع نہ مل سکا ۔ مجھے ممتاز حسن اور عبدالواحد کو ایک ایک مختصر خط لکھنا تھا، ممتاز حسن کو تو اپنے قیامِ کلکتہ کے انتظام کے سلسلے میں عبدالواحد کو ملفوظاتِ اقبال کے متعلق (سید

۱۔ یہ خط اُس زمانے کا ہے جب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اسلامیہ کالج لاہور کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرار تھے ۔ ۱۹۳۸ء کے موسم گرما کی چھٹیوں میں پروفیسر صاحب نے غالب کے متعلق تحقیق کی غرض سے دہلی، آگرے، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، پٹنے، کلکتے، حیدرآباد اور بھوپال وغیرہ کا دورہ کیا تھا ۔ اس دورے میں پروفیسر صاحب نے مختلف شہروں سے اپنی والدۂ ماجدہ کے نام جو خط لکھے، یہ خط انھیں میں سے لیا گیا ہے ۔ ان کی والدہ محترمہ کو بھی غالب سے بہت دل چسپی تھی، اور غالب پر پروفیسر صاحب کی مجوزہ کتاب کا نام انھوں نے ہی "مرقع غالب" تجویز کیا تھا ۔ افسوس کہ یہ کتاب پروفیسر صاحب کی زندگی میں مرتّب نہ ہو سکی، لیکن اس کے لیے جو مواد انھوں نے جمع کیا تھا وہ گزشتہ ربع صدی سے زائد مدت میں مختلف مضامین کے طور پر رسالوں میں چھپتا رہا ہے ۔ اب اسے مرتّب کر کے یک جا چھاپنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔

سلیمان ندوی کا خط مجھے اپنے خط کے جواب میں اترسوں لاہور میں ملا تھا، چونکہ ملفوظات اقبال کا اہتمام اب عبدالواحد کے ذمّے ہے اس لیے یہ خط جو میرے ساتھ ہی دہلی آ گیا تھا، ان کو واپس لاہور بھیجنا تھا) ۔ ساڑھے نو یا دس بجے کے قریب جب میں عبدالواحد کو خط رہا تھا، ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا جاتا تھا کہ آپ کو کیا کیا باتیں لکھنی چاہییں ۔ خیال آیا پِتی (چھپاکی) کا حال بھی لکھنا چاہیے اور چونکہ دن بھر اس کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی، اس لیے آپ کو لکھنے کے لیے ذہن میں یہ فقرہ آیا کہ "اب پِتی کے صرف آثار باقی ہیں، اور وہ بھی آثار قدیمہ" ۔ شاید میرے اس خیال سے پِتی کی غیرت کو حرکت ہوئی، بہرحال ساڑھے دس بجے جب میں ممتاز حسن کے نام کا خط لکھ رہا تھا، دونوں ٹانگوں کی پتی چمک اٹھی ۔ اس میں جان تو نہیں تھی مگر چبھن اور کھجلی خاصی تھی ۔ ناچار ممتاز حسن والا خط ناتمام چھوڑ کر میں سونے کے لیے ہوٹل کی چھت پر چلا گیا ۔ اسی وجہ سے آپ کو بھی خط نہ لکھ سکا ۔ کل صبح نواب خضر میرزا سے ملنے کے لیے (جو عارف[1] کے بھتیجے ہیں) مہر ولی جانا تھا ۔ مہر ولی دہلی سے بارہ میل کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ ہے ۔ نواب صاحب سے ساڑھے آٹھ بجے شام رخصت ہو کر کہیں رات کے ساڑھے دس بجے ہوٹل میں واپس پہنچ سکا، چنانچہ کل بھی خط لکھنے کا موقع نہ مل سکا ۔ آج کچھ فراغت ہوئی ہے تو خط لکھنے بیٹھا ہوں ۔

اب میں آپ کو اپنے اس وقت تک کے حالات ذرا تفصیل سے سناتا ہوں ۔

۱۱ جولائی (پیر) کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے میں دفتر زمیندار سے سٹیشن کو روانہ ہوا ۔ بھائی عنایت اللہ خاں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لیے فاروق گنج سے میرے ساتھ آئے تھے ۔ سٹیشن پر اُن کی موجودگی سے سامان رکھنے میں بہت مدد لی ۔ صراحی اور لوٹے میں انھوں نے پانی بھی بھر دیا ۔ ٹھیک نو بجے گاڑی روانہ ہوئی ۔ میں نے بڑے اطمینان سے کپڑے بدلے، چیزوں کو قرینے سے رکھا، سامان کو زنجیر میں باندھ کر قفل لگایا، پنکھا جھلنے کے لیے نکالا ۔ یہ پنکھا دراصل چھوٹی سی پنکھیا

۱۔ زین العابدین خاں عارف، غالب کی بیوی کے بھانجے تھے اور غالب کے منہ بولے بیٹے ۔

ہے اور میں سمجھتا تھا کہ مجھ جیسے چھاج سے ہوا لینے والے کو اس "نازک بدن" میں سے کیا ہوا ملے گی مگر جھلنے پر معلوم ہوا کہ ہوا کی گنجائش بھی اس میں رکھی گئی ہے ۔ اٹاچی کیس کے طفیل گویا میری میز متحرک ہو کر میرے ساتھ آ گئی ۔ سونے سے پہلے میں نے اس میں سے چاقو نکال کر پنسل بنائی ۔ حساب کی کاپی نکال کر حساب لکھا، کچھ اور یادداشتیں لکھیں اور ٹوتھ برش سے دانت صاف کیے ۔ اس کے بعد رات بھر بڑی بھلی طرح سوتا رہا ۔ صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا ۔ دلی کے قریب آسمان پر ہلکا سا ابر تھا اور ہوا میں خنکی تھی ۔ دلی پہنچ کر اگرچہ دھوپ نکل آئی مگر موسم ناگوار نہ تھا ۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ دلی کی گرمیاں لاہور کے مقابلے میں بسا غنیمت ہیں ۔ شام کو تو ہر روز ٹھنڈی ہوا چلتی ہے جو رات بھر رہتی ہے اور دوپہر کو بھی دھوپ میں چلنا پھرنا لاہور کے ستائے ہوؤں کو زیادہ ناگوار نہیں ہوتا ۔

سٹیشن پر بہت سے ہوٹل والوں کی کشمکش سے جان چھڑا کر میں آخر ایک شخص کے ساتھ ہو لیا جو مجھے اس ہوٹل میں لے آیا ۔ یہ ہوٹل بہت اچھا نہیں ہے اور اِسی عـہ/ یومیہ میں اس سے بہتر اور بڑا کمرہ دوسرے ہوٹلوں میں ملنا ممکن ہے، لیکن اب جب یہاں آ پڑا ہوں تو سستی کے مارے یہاں سے جنبش کرنا مشکل ہو رہا ہے ۔ اس کے علاوہ چھوٹے کمرے کی تلافی بجلی کے پنکھے نے کر دی ہے جو اسی عـہ/ یومیہ میں مجھے دے دیا گیا ہے ۔ دوسرے ہوٹلوں میں بجلی کا خرچ الگ دینا پڑتا ہے ۔ سچ پوچھیے تو دلی میں پنکھے کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں ہے ۔ گزشتہ رات میں بند کمرے میں بغیر پنکھے کے تھوڑی دیر بیٹھا رہا لیکن اس کے باوجود کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی ۔ یوں بھی ہوا چلتی رہتی ہے اور اگر کمرہ ذرا ہوا دار ہو تو پنکھے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ بعض لوگوں کو تو میں نے رات بھر کمروں کے اندر سوتے ہوئے دیکھا ہے ۔

ہوٹل میں پہنچ کر سامان ٹھکانے لگایا، ناشتہ کیا، شیو بنا کر غسل کیا اور کپڑے بدلے ۔ یہ ہوٹل بالکل سڑک کے کنارے پر ہے، بازار کا شور، گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں ہر وقت سنائی دیتی رہتی ہیں ۔ میرے کمرے

کا جنوبی دروازہ فتح پوری کے چوک کے بالکل سامنے ہے ۔ مشرق کی طرف کے دونوں دروازے اس سڑک کی طرف کھلتے ہیں جو سٹیشن سے فتح پوری کو آتی ہے (کمرے میں داخل ہونے کا دروازہ شمال کی طرف ہے ، جدھر ہوٹل کی سیڑھیاں ہیں) ۔ یہاں پہنچ کر جب میں اپنا سامان کھول رہا تھا تو تھوڑی دیر پلنگ پر بیٹھ کر بازار کو دیکھتا رہا ۔ ''بازار کی سیر'' کا مفہوم کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ آخر اس میں لوگوں کو کیا دل چسپی نظر آتی ہے لیکن یہاں بیٹھ کر چاندنی چوک اور فتح پوری کی سڑکوں کی گہما گہمی پر جب نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ بازار کی سیر میں بھی کوئی بات ہے اور تھوڑا سا اندازہ اس بات کا بھی ہوا کہ غالب کے زمانے میں دلی کے لوگ شام کے وقت کیوں سڑک کے کنارے کے کوٹھوں پر بیٹھ کر بازار کی چہل پہل دیکھا کرتے تھے ۔ اُس وقت آج کل کی طرح اخبار بھی نہیں تھے ، اس لیے ایک حد تک یہی ''بازار کی سیر'' اُن لوگوں کو اخبار بینی کا کام دے جاتی ہوگی ۔ آج کل کے اخبار میں بھی تو آخر انھیں باتوں میں وقت کھوتے ہیں کہ فلاں جگہ مار دھاڑ ہوئی ، فلاں شخص فلاں جگہ سے گزرا ۔ یہی بات ایک محدود پیمانے پر بازار کی دنیا میں نظر آ جاتی ہے (اگر بہت دور کی کوڑی لانی منظور ہو تو ''اخباری پن'' اور ''بازاری پن'' کا باہمی تعلق بھی یہیں سے واضح ہو جائے گا) ۔

خیر مطلب یہ ہے کہ ہوٹل میں پہنچنے کے بعد نہاتے اور کپڑے پہنتے اور تیار ہوتے مجھے خاصی دیر ہو گئی ۔ ٹھیک پونے بارہ بجے میں نیچے بازار میں آترا ۔ سب سے پہلے شیخ سردار علی کے پاس جانے کا ارادہ کیا کیونکہ انھیں کی وجہ سے میں نے لاہور سے آنے میں جلدی کی تھی ۔ شیخ سردار علی لاہور کے رہنے والے ہیں اور اسلامیہ کالج کے لائبریرین صاحب نے ان کے نام مجھے تعارف کا خط دیا تھا ۔ یہ دلی کے سینٹ سٹیفن سکول میں مدرس ہیں لیکن چونکہ مدرسے کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا اس لیے میں نے ان کے گھر جانے کا ارادہ کیا ۔ ٹریم میں بیٹھ کر جامع مسجد پہنچا (ٹریم والے نے دو پیسے لیے) جامع مسجد سے پیدل دریا گنج گیا اور مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ دھوپ میں پیدل چل کر بھی کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی تھی ۔ دریا گنج میں ''کلاں محل'' اور ''کلاں محل'' میں ''عبداللہ

ٹال والے'' کو تلاش کیا ۔ معلوم ہوا کہ سردار علی صاحب مکان بدل کر دوسری جگہ چلے گئے ہیں ، تھوڑی سی پریشانی ہوئی کیوں کہ وہاں اکثر لوگوں کو شیخ سردار علی کا پتا چھوڑ نام تک معلوم نہ تھا ۔ آخر ایک نیک دل لڑکا جو مسعود کا ہم عمر تھا کہنے لگا کہ چلیے میں ایک جگہ چل کر دریافت کرتا ہوں ، شاید پتا چل جائے ۔ وہاں بہت ماسٹر رہتے ہیں ۔ چنانچہ بہت سی گلیوں کا چکر کاٹ کر وہ لڑکا مجھے ایک مکان پر لایا اور معلوم ہوا کہ شیخ سردار علی یہیں رہتے ہیں ۔ میں نے لڑکے کو شاباش دی اور خود اندر جا کر بیٹھ گیا کیوں کہ شیخ صاحب ابھی مدرسے سے نہیں آئے تھے ۔ ایک بجے کے قریب وہ آئے اور ملاقات ہوئی ۔ کھانا انھوں نے زبردستی اپنے ساتھ کھلایا ۔ میں نے مہر ولی چلنے کے لیے کہا ۔ انھوں نے کہا شام کو اکرم صاحب سے مل لیں گے ۔ وہ دلی کے رہنے والے ہیں اور ان کے والد ''حاجی صاحب'' پر نواب صاحب (خضر مرزا ، مہر ولی والے) بہت مہربان ہیں ۔ ان کے ساتھ مہر ولی جانے کے لیے کل کا کوئی وقت مقرر کر لیں گے ۔

الغرض طے یہ ہوا کہ میں چھ بجے شام پھر شیخ صاحب کے پاس پہنچوں اور ہم دونوں مل کر اکرم صاحب کے ہاں چلیں ۔ شیخ صاحب نے چلتے ہوئے اپنی بائسیکل بھی مجھے دے دی ۔ میں بائسیکل لے کر ان کے گھر سے نکلا تو پونے دو بجنے کو تھے ۔ لاہور کے مقابلے میں یہاں دھوپ کچھ ایسی گرم بھی نہ تھی ۔ میں نے دل میں کہا بائسیکل پاس ہے اور دریا گنج کا علاقہ ہے ، کیوں نہ ''زینت المساجد'' اور نواب شمس الدین کا مکان دیکھتا چلوں ۔ ''زینت المساجد'' اورنگ زیب کی ایک بیٹی زینت النساء بیگم نے ۱۷۱۰ء میں بنوائی تھی اور میں نے پڑھ رکھا تھا کہ یہ مسجد دریا گنج میں ہے ۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نواب شمس الدین (والئی فیروز پور جھرکا و لوہارو) جن کو فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی ہوئی تھی ، ان کا مکان (یا حویلی) بھی اسی مسجد کے قریب دریا گنج میں واقع ہے ۔ کشن گڑھ کے راجہ کا مکان بھی جہاں فریزر نے اپنی زندگی کی آخری شام کو کھانا کھایا تھا ، دریا گنج میں واقع تھا ۔ میں نے چاہا کہ ان تینوں کو اسی وقت دیکھتا جاؤں ۔ ''زینت المساجد'' تو بلا زحمت دور سے نظر آ گئی ۔ میں نے اندر جا کر بھی

اسے دیکھا ۔ اب یہ ویران پڑی ہے ۔ نہ کوئی امام ہے نہ مقتدی ، البتہ عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ۔ یہیں آ کر پچھلی صدی میں پیر غوث علی قلندر ٹھہرے تھے جن کی سوانح عمری '' تذکرۂ غوثیہ'' کے نام سے چھپ چکی ہے ۔ مرزا غالب ان پیر غوث علی کے لیے اپنے گھر سے کھانا پکوا کر اسی مسجد میں خود لایا کرتے تھے ۔ مسجد سے نکل کر میں نے دو تین آدمیوں سے نواب شمس الدین کے مکان کا پتا پوچھنا چاہا مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا ۔ تاہم جو کچھ مجھے معلوم ہوا اسی سے میں نے اندازہ کیا کہ نواب صاحب کا مکان کہاں ہوگا ۔ ابھی میں اس طرف چل ہی رہا تھا کہ بائیں ٹانگ پر گھٹنے کے قریب زور سے چبھن ہوئی ۔ مجھے خیال ہوا کہ پھر وہی ''پتی'' نکل رہی ہے مگر تھوڑی دیر بعد جب اسی جگہ جلن سی معلوم ہوئی تو اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی بھڑ نہ ہو ۔ بائسیکل سے اتر کر میں نے بائیں ہاتھ سے پتلون اٹھانی چاہی تو انگوٹھے پر ہتھیلی کی طرف زور سے کسی چیز نے ڈنک مارا اور اس کا نشان بھی صاف نظر آنے لگا ۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ جب میں زینت المساجد کو دیکھ رہا تھا اس وقت کوئی بھڑ پتلون میں گھس گئی ہوگی ۔ میں نے جلدی سے پتلون اٹھائی تو اندر سے ایک ''کابلی بھونڈ'' (جسے اردو میں تتیّا کہتے ہیں) برآمد ہوا ۔ اس کو تو میں نے پکڑ کر وہیں مارا اور پھر اپنا ہاتھ اور ٹانگ لے کر آگے چلا ۔ دل میں خیال آیا کہ یہ بھی خوب ہوا کہ ''ریسرچ'' کے پہلے ہی قدم میں اس نیک بخت سے سابقہ پڑا ۔ خیر نواب شمس‌الدین کا مکان جا کر دیکھا اب یہ بڑی حد تک منہدم ہو چکا ہے ۔ صرف ایک حصہ باقی ہے اور باقی جگہ پر ہندوؤں کی کوٹھیاں بن رہی ہیں یا بن چکی ہیں ۔ راجا کشن گڑھ کی حویلی مجھے نہ ملی اس لیے تین بجے کے قریب میں اپنے ہوٹل میں واپس چلا آیا ۔ یہاں آ کر میں نے تھرماس بوتل میں سے برف نکالی اور پانی پیا ، ہاتھ اور ٹانگ پر امرت دھارا لگایا ۔ (بعد میں اسی شام یعنی پرسوں شام ایک ڈاکٹر سے بھی دوا لگوائی تھی) ۔ کل تک ہاتھ میں درد رہا ، آج بالکل ٹھیک ہو گیا ہے ۔ تھرماس فلاسک کی برف بھی بہت دیر تک باقی رہی ۔ پرسوں رات کو میں اکرم صاحب سے مل کر آیا تو پھر اسی میں سے پانی پیا اور کل صبح مہرولی جاتے ہوئے پھر پانی پیا تو برف کے دو ایک ٹکڑے ابھی بوتل میں تیر رہے تھے ۔ آج دوپہر کو جب بوتل کھولی تو برف گھل چکی تھی اور

صرف پانی ہی پانی تھا جو خاص طور پر ٹھنڈا بھی نہ تھا ۔

پرسوں رات اکرم صاحب سے مہرولی جانے کا وقت مقرر کر کے آئے تو شیخ سردار علی صاحب نے پھر اپنے ساتھ بہ اصرار ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا ۔ اس کے بعد نو یا ساڑھے نو بجے شب ہوٹل میں پہنچا اور جیسا اس خط کے شروع میں کہہ چکا ہوں ، عبدالواحد اور ممتاز حسن کو خط لکھے اور پھر بتی کے ہنگامے کی وجہ سے کوٹھے پر جا کر سو گیا ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا رات بھر چلتی رہی ۔ صبح اٹھا تو پاس ہی فتحپوری کی مسجد پر نظر پڑی اور اس کے پیچھے ایک عالیشان عمارت مسجد سے پشت بہ پشت نظر آئی ۔ یہ سیٹھ ''گڈ وڈ ڈو ڈویا'' یا ''گنڈویا'' (جو نام بھی ہو) ان کی عمارت ہے ۔ اتنی بڑی عمارت کا اپنی جگہ سے سرکنا ناممکن ہے اور چونکہ مسجد کمیٹی کی اجازت سے انھوں نے یہ عمارت تعمیر کی ہے اس لیے اُمید نہیں کہ مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کو کامیابی نصیب ہو[1] ۔

ساڑھے دس بجے کے قریب شیخ سردار علی آئے اور ہم دونوں حسب قرار داد فوراً جامع مسجد اور مٹیا محل سے ہوتے ہوئے اکرم صاحب کے مکان پر پہنچے ۔ بارہ بجے کے قریب ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا اور پھر ہم تینوں شہر کی فصیل دیکھتے ہوئے اجمیری دروازے پہنچے جہاں قطب اور مہر ولی جانے والی لاریوں کا اڈا ہے ۔ اجمیری دروازے کے سامنے غازی الدین خاں کا مقبرہ ہے ۔ اس عمارت میں اب اینگلو عربک کالج ہے ۔ تھوڑی دیر اس کو پھر کر دیکھا اور پھر مہر ولی روانہ ہوئے ۔ برسات کے دنوں میں دلی کے بہت سے لوگ مہر ولی چلے جاتے ہیں اور خود بادشاہ بھی دو مہینے کے لیے مہر ولی جایا کرتے تھے ۔ ڈیڑھ بجے ہم وہاں پہنچے اور مینا بازار میں سے گزرتے ہوئے (جو وزیر آباد کے بازار کی طرح مہرولی کا ایک ہی بازار ہے) ایک بڑے سے مکان میں داخل ہوئے اس مکان کے ایک حصے میں نواب خضر خاں جن سے ہم ملنے آئے تھے بطور کرایہ دار کے رہتے ہیں ۔ ان کے حصے کا ایک دروازہ مکان کی مشترک ڈیوڑھی کی طرف کھلا تھا ۔ دروازے کے سامنے ایک

۱۔ ان دنوں دہلی کے مسلمانوں نے سیٹھ گڈوڈیا کی اس عمارت کی تعمیر پر سخت احتجاج کیا تھا کیوں کہ یہ مسجد فتح پوری پر بری طرح چھا گئی تھی ۔

پیر مرد چار پائی پر لیٹے نظر آئے ۔ گلے میں کرتا نہیں تھا ۔ صرف ایک تہمد بندھا ہوا تھا ۔ ہم مکان میں داخل ہوئے اور بڑی خاموشی سے جا کر دالان میں بیٹھ گئے تاکہ وہ ہمارے شور سے بیزار نہ ہوں ۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکیے نے آ کر ''نواب صاحب نواب صاحب'' کہہ کر انھیں آوازیں دینی شروع کیں اور ایک خط انھیں دے گیا ۔ اب وہ جاگ اٹھے تھے ۔ نوکر نے ہمارے آنے کی اطلاع کی اور انھوں نے ہمیں فوراً بلا لیا ۔ وہ پلنگ پر بیٹھے رہے ہم تینوں سامنے فرش پر بیٹھ گئے ۔ مجھے اپنے کالج کے لائبریرین صاحب سے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ غالب کے خاندان کے ساتھ خضر صاحب (ان کا اصلی نام مرزا محمد حسین ہے مگر بچپن سے خضر کہلاتے ہیں) کا کیا تعلق ہے ۔ جب میرا تعارف ہوا تو غالب کا نام سن کر کہنے لگے ''ہاں میرے دادا تھے'' پھر امراؤ بیگم (اہلیہ مرزا غالب) اور ان کی بہن بنیادی بیگم کے نام انھوں نے بتائے اور بنیادی بیگم کے متعلق کہا کہ میری دادی تھیں ۔ بنیادی بیگم عارف کی ماں تھیں جن کا مرثیہ (''کوئی دن اور'') غالب نے لکھا تھا ۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ عارف کے علاوہ بھی بنیادی بیگم کے کوئی بیٹے تھے ۔ اب معلوم ہوا کہ عارف کے ایک حقیقی چھوٹے بھائی تھے جن کا نام مرزا حیدر حسن خاں تھا ۔ خضر صاحب انھیں حیدر حسن خاں کے بیٹے ہیں ۔ اپنے متعلق کہا کہ میں ۱۸۵۲ع میں پیدا ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سعید الدین احمد خاں (طالب) مجھ سے چھ دن بعد پیدا ہوئے تھے ۔ میں نے سعید الدین احمد خاں کے متعلق کہا کہ وہ ۸۵۳ ع میں پیدا ہوئے تھے ۔ کہنے لگے پھر میں بھی ۱۸۵۳ع میں پیدا ہؤا ہوں گا ۔ اس حساب سے ان کی عمر ۸۶ - ۸۵ برس کی ہے ۔ جب غالب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر سولہ برس کی ہوگی ۔ غالب کے تین مکانوں کا پتہ انھوں نے بتایا اور ذاتی تجربے کی بنا پر بھی غالب کی بہت سی باتیں بتائیں ۔ شراب کیس طرح اور کس وقت پیتے تھے ، مشاعرے میں غزل کس طرح پڑھتے تھے ، داد کا شکریہ کس طرح ادا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ ۔ عارف کے دونوں بیٹوں کی باتیں سنائیں ۔ یہ دونوں خضر صاحب کے ہم عمر تھے ، اگرچہ جوانی میں انتقال کر گئے ۔

خضر صاحب کا حافظہ بلا کا تیز ہے ۔ باتوں کی پوری پوری تفصیل ان کو

یاد ہے اور ان کے بیانات زیادہ تر بالکل صحیح ہوتے ہیں - میں نے مرزا یوسف بیگ کی دیوانگی کے متعلق پوچھا تو کہا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ، اور یہ تھا بھی صحیح کیونکہ غدر میں جب مرزا یوسف کا انتقال ہوا تو خضر صاحب کی عمر چار پانچ برس کی تھی - بہت دیر تک باتیں کرتے رہے ، اور میں ساتھ ساتھ نوٹ لیتا رہا - لوہارو کے نواب صاحب کے نام مجھے خط دینے کا وعدہ کیا اور میرا اسی سلسلے میں دوبارہ آنا بخوشی منظور کیا - میرا ارادہ ہے کہ ان کی تصویر لے لوں اور ان کے سوانح حیات پر ایک مختصر سا نوٹ بھی تیار کر لوں - جو یادداشتیں میں نے ان کی گفتگو کی لی تھیں ان کو پھیلا کر ابھی لکھنا چاہتا ہوں تا کہ ایک دفعہ پھر ان کے جا کر وہی باتیں سنوں اور اپنی تحریر میں ضروری لفظی ترمیمیں کر لوں - آج کچھ فراغت کا دن آیا تھا مگر وہ تمام کا تمام آپ کو یہ مفصل خط لکھنے میں صرف ہو گیا - اسی لیے میں نے ارادہ کیا کہ آئندہ خط لکھنے کے معاملے میں احتیاط کروں - اگر میں اسی قسم کے خط لکھتا رہا تو پھر غالب پر کتاب لکھنے کے بجائے یہ تمام دورہ خط و کتابت کی نذر کر دوں گا - اب اس کے بعد آپ کو بالعموم میرے مختصر خط یا کارڈ ملا کریں گے ، کیونکہ اس سے زیادہ لکھنا میری کتاب کے لیے مہلک نتائج پیدا کرے گا - اس خط سے آپ کو یہ اندازہ تو ہو ہی جائے گا کہ میری سفر کی زندگی کیسی ہے اور کام کس طریقے پر ہو رہا ہے -

مغرب کے قریب خضر صاحب ہمیں خود لوہارو والوں کی قبریں دکھانے کے لیے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں لے گئے - ان کے مکان کے ساتھ وہ محل دیکھا جس میں بہادر شاہ (اور ان کے والد اکبر ثانی) برسات کے دنوں میں آ کر مہرولی ٹھہرا کرتے تھے - عارف جان اور قاسم جان (لوہارو کے خاندان کے بزرگوں) کی قبریں دیکھیں - نواب احمد بخش ابن عارف جان جو غالب کی بیوی کے چچا اور لوہارو کے پہلے نواب تھے اُن کی قبر دیکھی - اُن کے دونوں بیٹے (امین الدین اور ضیاء الدین) جو غالب کے دوست تھے ان کی قبریں بھی دیکھیں - پھر شاہ عالم ، اکبر ثانی اور مرزا فخرو کی قبریں دیکھنے گئے - اکبر ثانی اور مرزا فخرو کے درمیان ایک خالی سرداوا (قبر کے لیے رکھی ہوئی جگہ) ہے - یہ جگہ بچارے بہادر شاہ نے اپنے لیے رکھی تھی مگر

اسے دلی کی خاک میں سونا نصیب نہ ہوا -

اس احاطے سے نکل کر ساتھ ہی شاہی خاندان کی ایک قبر کو ہم دیکھ رہے تھے کہ اکرم صاحب نے کہا ”دیکھیے سانپ ہے -“ - ان کے اطمینان آمیز لہجے سے میں یہ سمجھا کہ اس جگہ عام طور پر سانپ پائے جاتے ہیں مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایک چھوٹا سا سانپ قبر کے دوسری طرف بھاگتا ہوا نظر آیا -

اب چونکہ گہرا جھٹپٹا ہو چلا تھا اس لیے ہم واپس آئے - میں نے نواب صاحب کے ہاں ایک رات رہنے کی خواہش ظاہر کی جو انہوں نے بخوشی منظور کی - مطلب یہ تھا کہ ذرا اور زیادہ کھل کر وہ باتیں کریں تو شاید کوئی نیا نکتہ ہاتھ آئے - نواب صاحب نے کہا کہ ضمیر مرزا سے ملیے ، وہ آپ کو مفید مشورہ دیں گے - ضمیر مرزا (ضمیرالدین احمد خاں) نواب صاحب کے داماد ہیں اور لوہارو کے سابق نواب سر امیرالدین احمد خاں کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں - کل شام نواب صاحب سے رخصت ہو کر پونے دس بجے لاری میں دلی پہنچے - شیخ سردار علی صاحب نے حسب معمول پھر اپنے ساتھ اسی ہوٹل میں کھانا کھلایا - ساڑھے دس بجے میں اپنے ہوٹل میں پہنچا - ساڑھے گیارہ بجے تک نواب صاحب کی کچھ اور باتیں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا اور ان کی یادداشتیں پہلی یادداشتوں کے ساتھ شامل کیں - اس کے بعد چھت پر جا کر سو گیا - ٹھنڈی ہوا حسب معمول خوب چل رہی تھی -

یہ تو کل کی روئداد ختم ہوئی - آج صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھا - شیو کے بعد غسل کیا - دودھ اور توس مکھن کا ناشتا جلدی سے کیا اور کپڑے پہن کر ہندوستانی دواخانے گیا (ہندوستانی دواخانہ بلیماراں کے جس مکان میں ہے وہ غالب کا آخری مکان تھا) یہاں اکرم صاحب حسب قرارداد میرے انتظار میں کھڑے تھے ، اُن کو ساتھ لے کر گلی قاسم جان سے ہوتا ہوا ضمیر مرزا کے پاس پہنچا - ان کا مکان پرانا اور شکستہ ہے - خود بھی کچھ ایسے مرفہ الحال نہیں - ڈیوڑھی میں آئے اور ملے - عمر ستر پچھتر برس کی ہوگی - اب یاد آیا کہ انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۶ دسمبر ۱۸۶۷ء

بتائی تھی - اپنے خسر کے مقابلے میں مجھے خشک سے معلوم ہوئے - بہرحال ان سے پون گھنٹے تک باتیں ہوئیں - پھر حاضر ہونے کی اجازت ان سے بھی لے لی - مگر دراصل ان سے کچھ حاصل نہ ہوا - ہاں یہ تصدیق ہوگئی کہ جو مکان میں نے پرسوں دوپہر دیکھا تھا وہ نواب شمس الدین ہی کا تھا - انھوں نے ایک تو یہ کہا کہ اس مکان کا نمبر نو یا سات ہے (میں نے جو مکان دیکھا اس کا نمبر سات ہی تھا) اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان کا مکان ''زینت المساجد'' سے بالکل ملا ہوا ہے اور یہی کیفیت اس مکان کی تھی جو میں نے دیکھا - ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب شمس الدین لاولد نہیں مرے تھے بلکہ ان کی دو بیٹیاں تھیں - انھیں کی بیٹی نے یہ مکان کسی کے پاس بیچ دیا تھا - انھوں نے یہ بھی کہا کہ جہانگیرہ بیگم (ہمشیرہ شمس الدین خاں) کی شادی آگرے کے کسی ایرانی سے ہوئی تھی - اس کے برعکس نواب خضر مرزا نے (کسی قدر رکتے ہوئے) یہ کہا تھا کہ جہانگیرہ بیگم کی شادی قلعے کے کسی شہزادے سے ہوئی تھی - ضمیر مرزا کا بیان غالباً صحیح ہوگا - کہتے ہیں کہ فریزر کے ساتھ شمس الدین کا فساد جہانگیرہ بیگم کے متعلق ہی ہوا تھا مگر لوہارو والے اس کی تردید کرتے ہیں -

آٹھ بجے کے قریب ضمیر مرزا سے مل کر میں حوض قاضی سے ہوتا ہوا فتحپوری کو آ رہا تھا کہ چوک کے پاس پہنچ کر کسی کی آواز سنائی دی ''حمید صاحب!'' دیکھا تو حفیظ ہوشیار پوری ایک ہوٹل کے نیچے کھڑے اپنا سامان اوپر بھجوا رہے تھے - ان کو دلی پہنچے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ میں انھیں دکھائی دیا - دیوان سنگھ مہتمم ریاست نے انھیں سو روپے ماہوار پر دلی بلا لیا ہے - میں دس بجے تک ان کے ساتھ رہا - اس کے بعد یہ نہا دھو کر فارغ ہوئے تو میرا ہوٹل دیکھنے آئے - اس کمرے میں دو منٹ بیٹھ کر یہ تو دیوان سنگھ کے پاس گئے اور میں نے کچھ دیر اکرام کا ''غالب نامہ'' دیکھنے کے بعد گیارہ بجے یہ خط لکھنا شروع کیا - ایک بجے کے قریب کھانا کھایا - اس (ہندو)

ہوٹل میں کھانا کھانے کا یہ میرا پہلا اتفاق ہے - صرف سبزی اور دال پر قناعت کی کیونکہ ہندو کا حرام گوشت کھانا مجھے منظور نہ تھا - اس کے بعد تھوڑی دیر ''غالب نامہ'' پڑھا اور پھر ڈھائی بجے تک سوتا رہا - تین بجے پھر خط لکھنے بیٹھ گیا - اب چھ بجنے کو ہیں - خط بند کروں گا اور غسل کے بعد لباس تبدیل کروں گا - حفیظ صاحب حسب قرار داد پونے سات بجے آئیں گے - ان کو لے کر شیخ سردار علی کے ہاں جاؤں گا جہاں اکرم صاحب بھی سوا سات بجے آئیں گے - پھر ممکن ہوا تو چاروں مل کر صادق الخیری سے ملنے جائیں گے -

کرم آباد میرا خط اگر کوئی آئے تو ۲۰ جولائی کے دن تک بلا تامل ''معرفت شیخ سردار علی صاحب بی-اے - اینگلو عربک ہائی سکول دریا گنج دلی'' بھیجتی رہیے - اس کے بعد بھی میں چند روز تک شاید یہیں ٹھہروں لیکن پھر میری مزید ہدایات کا انتظار کیجیے - اُمید ہے کہ لیچیوں کے پانی سے آپ کے خون کے دباؤ میں تھوڑی سی تخفیف ہوئی ہوگی - ڈاکٹر کو بلوا کر اس کی رائے سے عثمان یا کوئی اور مجھے مطلع کرے - آپ خود خط نہ لکھیے - بھائی حامد علی خاں کو بتا دیجیے کہ میں نے پرسوں شام شاہد احمد صاحب سے ملنے کی کوشش کی تھی مگر معلوم ہوا کہ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں -

اپنی صحت کے متعلق پوری تفصیل سے اطلاع بھجوا دیجیے - اپنے ہاتھ سے خط نہ لکھیے - آڑو اگر پسند ہو تو اس کے رس کے متعلق ڈاکٹر کرشن لال سے اجازت لے لیجیے - آج کل وزیر آباد میں بہت بکتا ہے - سب کو سلام -

فرماں بردار

حمید

۲۔ بنام بیگم حمید احمد خاں

۱۴ پامک پیلیس ہوٹل ، سرکیچی ، استنبول — Room 14, Pamuk Palas Otcli

۱۲ نومبر ۱۹۶۰ ع — Sirkeci, Istanbul,

امید ہے میرا پرسوں کا خط جو انقرہ سے لکھا تھا ، مل گیا ہوگا ۔ آپ کے اور سعید کے ۶ نومبر کے خط کے بعد پھر آپ کا کوئی خط انقرہ میں نہیں ملا ۔ ۱۰ نومبر کی شام کو گرُیمے سوکک جانے پر بھائی صاحب کا ۶ نومبر کا خط مل گیا تھا ۔ اس کے وصول ہونے کی اطلاع پرسوں کے خط میں غالباً دے چکا ہوں ۔

میں کل ۴ بجے استنبول پہنچ گیا تھا (اگرچہ بیس پچیس منٹ بعد ہوائی اڈے سے روانگی ممکن ہو سکی) ترک ہوا یلاری (یا ''یلدُر'' ؟) کے دفتر پہنچ کر ٹیکسی لی ۔ پہلے پرسوں صبح کے سفر کے انتظام کے لیے سوئس ایئر کے دفتر روانہ ہوا اور بعد میں اپنے ہوٹل آیا ۔ جب ٹیکسی میں بیٹھا تو سورج غروب ہو رہا تھا ۔ گزرتے گزرتے ایک مسجد سے آذان کی آواز سنائی دی ۔ سڑکیں اور بازار جموں کے ''پکے ڈنگے'' کی طرح کے تھے یعنی اینٹ کی طرح کے پتھر کا فرش تھا ۔ پونے چھ بجے میں اس ہوٹل پہنچا تو یہاں میرا انتظار تھا ۔ معلوم ہوا کہ میرا خط جو انقرہ سے لکھا تھا پہنچ چکا ہے ۔ یہ ہوٹل نسبتاً غریبانہ ہے ۔ اگرچہ کرایہ تقریباً انقرہ کے ہوٹل جیسا ہی ہے ۔ نیچے چوک نواب صاحب اور اکبری منڈی کا نقشہ ہے ۔ پرانی پرانی عمارتوں کی منڈیروں پر کبوتر بیٹھے ہیں ۔ ترک بجائے یورپین معلوم ہونے کے اپنے یار ہی معلوم ہوتے ہیں انقرہ کے لوگ زیادہ ''ماڈرن'' تھے ۔

کل رات سامان ٹھکانے لگا کر میں بازار میں نکلا ۔ ایک جگہ کھانا کھایا ۔ لوبیا کا سالن ، کھچڑی اور ڈبل روٹی ۔ بعد میں کھیر کھائی ۔ اس کے سوا دو لیرا دئیے ۔ تھوڑی دیر سمندر کے کنارے (جو قریب ہی ہے) کھڑا رہا ۔ یہ جگہ شاید غلطہ کے پل کے پاس ہے ۔

رات کو سونے سے پہلے کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھا تو نیچے پچھلی طرف کے بازار میں ایک سینما نظر آیا جس کے اوپر فلم کا نام بڑے زور سے لکھا تھا : NAZLI۔

آپ کو شاید معلوم ہی ہوگا کہ نازلی ترکی نام ہے ۔

انقرہ میں کل ساڑھے گیارہ بجے ایک تار ملا ۔ پہلے تو میں گھبرایا مگر تار کھولا تو مضمون یہ تھا (تار مسز لڈرگ ، نیویارک کی طرف سے تھا) ۔

Will meet you at Airport November nineteenth. Reservation is at Tudor Hotel in case I miss you. Ludwig.

امریکنوں کا کمال ہے کہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہر انتظام کرتے ہیں ۔ اس معاملے میں انگریز بھی ان سے پیچھے ہیں ۔ کیونکہ وہاں دو ایک مرتبہ اس بارے میں غلطی ہوئی ۔

کل میں حاجی بیرم کی مسجد میں ۱۲ بجے جمع کی نماز پڑھنے گیا ۔ ٹھیک ۱۲ بجے پہنچا کیونکہ سنا تھا ۱۲ بجے نماز ہوتی ہے ۔ میرا خیال تھا کہ انقرہ کے یورپین ترک کون سے ایسے بڑے نمازی ہوں گے کہ ضرور جگہ لینے کے لیے پہلے پہنچوں مگر جب میں پہنچا تو عجیب عالم تھا ۔ لاؤڈ سپیکر پر خطیب کے خطبے کی آواز آ رہی تھی اور مسجد کے اندر اور باہر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی ۔ یہاں تک کہ مسجد کے گرد سڑکوں پر بھی لوگ اپنی اپنی جانماز یا کپڑے اور کوٹ بچھائے بیٹھے تھے ۔ میں نے بھی کوٹ آتارا اور ڈٹ گیا ۔ عجیب بات ہے کہ اس علاقے میں پاس ہی ایک مسجد اور تھی وہاں بھی اسی طرح لوگ مسجد کے باہر تک زمین پر بیٹھے تھے بلکہ چھوٹے چھوٹے لڑکے کاغذ کے بڑے بڑے سفید تختے بیچ رہے تھے (کہ جانماز کا کام لیا جا سکے) ۔

ساڑھے بارہ بجے نماز سے فارغ ہو کر میں نے ایک گلی میں ایک دکان پر نان کباب کھایا اور پھر جب ایک بج رہا تھا (اور ہوٹل سے نکلنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا) پانچ تسبیحیں ۲ لیرا میں اور ایک سفید ہار ساڑھے بارا لیرا میں خریدا ۔ میرا ہوٹل دور نہ تھا ۔ وہاں سے 1.35 پر سامان لے کر ترک ہوا یلاری کے دفتر گیا (وہ بھی دو چار منٹ کے فاصلے پر تھا) پونے دو بجے بس ہوائی اڈے کو روانہ ہوئی ۔ سامان تلنے پر پھر کلی نے کہا کہ وزن زیادہ ہے ۔ میں نے Excess Baggage Ticket دکھایا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اب چند سطریں سعید کے لیے لکھ کر سیر کے لیے روانہ ہوتا ہوں - ہاں طبیعت کا حال رہ گیا - کچھ نہ کچھ خرابی اتنے سفر سے بھی ضرور ہوئی ہے - قونیہ کے نو گھنٹے کے سفر سے بھی میں اتنا نہ تھکا تھا کیونکہ وہاں سے واپس آ کر رات کو میں نے قمیص دھوئی تھی ، بوٹ پالش کیا تھا اور اس قسم کے دوسرے کام کیے تھے - لیکن کل شام کھانا کھا کر ۸ بجے باہر سے آیا تو بستر پر پڑ گیا دانت تک صاف نہ کر سکا (حالانکہ ارادہ یہ تھا کہ خط صبح اٹھ کر لکھ رہا ہوں وقت بچانے کے لیے رات کو لکھوں گا) ساڑھے آٹھ بجے سے صبح ٦ بجے تک غنودگی کے عالم میں بستر پر رہا - (ہوائی سفر کے بعد مجھے کچھ دن بری سی نیند بہت آتی رہتی ہے) - بہر حال سر اتنا بھاری معلوم نہیں ہوتا جتنا انقرہ پہنچ کر معلوم ہوتا تھا - اب سعید کے لیے ایک صفحہ لکھ کر باہر جاتا ہوں -

حمید احمد خاں

اوپر والے خط کے ساتھ ہی ، اپنے بیٹے سعید احمد خاں کے نام

استنبول ۱۲ نومبر

میرے پیارے سعید - صبح کے ساڑھے دس بج رہے ہیں اور صرف آج کا دن ہی ایسا ہے جس میں کوئی کتب خانہ دیکھا جا سکتا ہے - کل اتوار ہے اور پرسوں صبح ۷ بجے میں اس ہوٹل سے زیورک روانہ ہونے کے لیے نکل چکا ہوں گا (زیورک —— جنیوا —— میڈرڈ) -

پرسوں شام میں نے ایک ٹیکسی والے کو ۲۰ لیرا دے کر پرانے انقرہ (عسکی انقرہ) کی سیر کی - شکستہ مکان ، پیچ در پیچ گلیاں ، گندی گندی دکانیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا - یہاں سب اپنے بہن بھائی تھے - انگریز اور میمیں نیچے یعنی شہر (نئے شہر) میں رہ گئے تھے - لیا شہر ایک بہت اونچی پہاڑی پر آباد ہے سب سے اوپر قلعہ ہے - اس کے ٹوٹے ہوئے دوازے کے سامنے زینے پر ایک ڈاڑھی والا بڈھا سا آدمی بیٹھا تھا - اس نے خیرات مانگی جو ملی تو اس نے ''اللہ (راضی رکھے)'' وغیرہ کہا - ایک گلی میں سے آٹھ دس سال کی ایک لڑکی قیمص اور شلوار پہنے دو آفتابے ہاتھ میں پکڑے آ رہی تھی - عورتیں کہیں کہیں سر جوڑے بیٹھی بات کر رہی تھیں -

میں قلعے تک گیا مگر اندر نہیں - اندر جانے کی اجازت نہ تھی -

اس سے پہلے میرے ڈرائیور نے جب عسکی انقرہ کی طرف رخ کیا اور مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور ترکی میں کہا یہ عسکی انقرہ ہے ، میں نے کہا ''عسکی انقرہ چوق یشا !'' (پرانا انقرہ ، زندہ باد !) -

اس کے بعد مجھے گریمے سوکک خط پوچھنے جانا تھا - رستے میں ایک سکول آیا - بہت بڑا سکول تھا - ڈرائیور مجھے اندر لے گیا - ہیڈ ماسٹر بہت اچھی طرح ملا - سوڈے کے ایک گلاس اور چاکولیٹ سے میری تواضع کی اور اپنے انگریزی ٹیچر کی مدد سے کہا کہ ہمیں پاکستان سے محبت ہے -

اچھا اب سلام - اب گھڑی پونے گیارہ بجا رہی ہے - ابّا

۳- بنام محمد باسط اللہ بیگ[1]

مجلس ترقی ادب
کلب روڈ ، لاہور
۱۸ اپریل ۱۹۷۳ع

عزیز مکرم

السلام علیکم - پچھلے دنوں مجھے یوم اقبال کی تقریبات کے سلسلے میں مصروفیت کچھ زیادہ رہی اس لیے آپ کے ۷ مارچ کے نوازش نامے کی رسید بھیجنے سے محروم رہا -

آپ کے استفسار کے جواب میں تحریر ہے کہ علامہ اقبال اول و آخر مسلمان تھے - انھوں نے معاشی مسائل کا حل اشتمالیت (کمیونزم) میں ہرگز تلاش نہیں کیا - میری مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ اقبال کے کلام میں جابجا لینن یا کارل مارکس کا جو ذکر ہے وہ ہمدردانہ نہیں ہے ، یا معاندانہ ہے - انھوں نے ان لوگوں کا ذکر بحیثیت مجموعی اچھا کیا ہے - یہ اس لیے کہ معاشی مساوات کا اصول اسلام کو پسند ہے ، لیکن معاشی مساوات اسلام کے اصول مساوات کے کل کا محض ایک جزو ہے - چنانچہ اشتمالیت کی جزوی مساوات کو اقبال نے طنزاً ''مساوات شکم'' کہا ہے - اقبال کے نزدیک

۱- سندھ یونیورسٹی ، حیدر آباد کے ایک طالب علم -

''شکم'' کی اہمیت مسلم ہے، مگر انسان کا دل اور اس سے آگے انسان کی غیرفانی روح اقبال کو عزیز تر ہے - اسی لیے فرمایا ہے :

ترى خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

خلافت راشدہ کا زمانہ گزر جانے کے بعد مسلمانوں کے معاشرے میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور دیگر غیر اسلامی شعائر نے راہ پا لی - اشتمالیت کا اصل اصول سرمایہ داری اور جاگیر داری کے خلاف جنگ ہے اس لیے اشتمالی حکومتوں کے دستور کا یہ خاص حصہ مقتضیات اسلام سے مطابقت رکھتا ہے -

لیکن یاد رہے کہ اشتمالیت کا بنیادی عقیدہ انکار خدا ہے جو مسلمانوں کے لیے (اور علامہؒ اقبال کے لیے) نا قابل قبول ہے - اشتمالیت کے برعکس اسلام کا دعوىٰ یہ ہے کہ خدا کو مان کر بھی پیٹ کی (اشتمالی) اہمیت تسلیم کی جا سکتی ہے ، بلکہ معاشی و معاشرتی انصاف کا ایک ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے جو ''پیٹ پوجا'' پر فوقیت رکھتا ہے - اشتمالی طرز خیال پر سوچنے والے اصرار کرتے ہیں کہ جوں ہی خدا کو مانا ، سرمایہ داری بھی آ گئی اور بادشاہی طور طریقے بھی - یہ درست نہیں ہے - نہ صرف قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے دور فرماں روائی کی مثال اس طرز فکر کو غلط ثابت کرتی ہے بلکہ بعد کے تیرہ سو سال میں بھی بے شمار مسلمان افراد (مزدور ، سپہ سالار ، تجار ، عمال حکومت ، وغیرہ) اپنے عمل سے ، اقتصادی حقائق کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ، اسلام کی حقانیت پر گواہی دیتے رہے ہیں - فکری طور پر بھی ذات باری تعالیٰ کے اسلامی تصور میں بنی نوع انسان کی لوٹ کھسوٹ کو کوئی دخل نہیں ہے - پاکستان کی تجربہ گاہ اسی لیے قائم ہوئی ہے کہ ہم خدا کی عبادت بھی کریں اور خلق خدا سے بھی پورا انصاف کریں - قیام پاکستان کے بعد ہم سے غلطیاں ضرور ہوئیں لیکن خیال رہے کہ مجھے اور آپ کو مایوس ہو جانے کا حق خدا نے نہیں دیا - مایوسی مسلمانوں کا شعار نہیں ہے - والسلام

خیر طلب

حمید احمد خاں

قاضی سید احمد ، ہیڈ کلرک کے ساتھ اپنے دفتر میں (۱۹۶۲ء)

اسلامیہ کالج کے شعبۂ انگریزی کی ایک پک‌نک
راوی کے کنارے کامران کی بارہ دری میں
تصویر میں پروفیسر محمد امین مغل ، محمد یامین ، اختر اقبال کہالی ، مرزا محمد وسیم
اور مسعود اللہ خاں بھی موجود ہیں

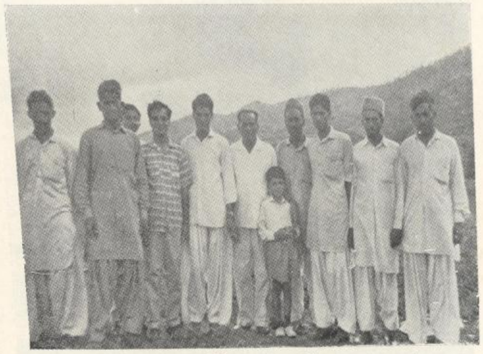

اپنے چپراسی محمد اکبر خان کے گاؤں میں (۱۹۶۴ء)
اکبر بائیں سے دوسرے نمبر پر ہیں۔ پروفیسر صاحب کے بیٹے خلیل (تیسرے)، جمیل (چوتھے) اور منصور (بائیں سے ساتویں) بھی تصویر میں موجود ہیں

پروفیسر صاحب اپنی بیگم اور بیٹے (سعید) کے ساتھ (نتھیا گلی، ۱۹۶۴ء)

جناب سعید احمد خاں

والدِ مرحوم کی یاد میں

۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو سچائی ، ایثار اور محبت کا وہ پیکر جو میرے والد اور اس گھر کی روح تھے ، ہماری دنیا کو خیرباد کہہ گئے ۔ دنیا اُن کو پروفیسر حمید احمد خاں کے نام سے جانتی ہے ۔ ہم اُن کو ابا کہتے تھے ۔ آج جب میں آپ کے سا.نے ان ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُن کو یا: کر رہا ہوں ، تو اُن کو ابا ہی کہوں گا ۔

مجھے ابا کی پہلی جھلک وہ یاد ہے جب وہ ہمارے تیمار پور والے گھر سے صبح بائسیکل پر ، پتلون کے پائنچوں کو " بڑے عمدہ " سیاہ کلپ لگائے ، دہلی پولی ٹیکنک جانے کو نکلتے تھے ۔ یہ شاید ۴۶ یا ۴۷ کی بات ہے ۔ اور پھر لاہور میں سکول کے وہ شب و روز بھی مجھے یاد ہیں جب ابا مجھے بائیسیکل پر سکول پہنچاتے اور گھر لاتے تھے ۔ اس کے بعد ۵۲ تا ۵۴ کا وہ زمانہ جب ابا کیمبرج میں تھے اور ہر تیسرے دن اُن کا خط آتا تھا ـــ جس کا ہمیں ہر وقت انتظار رہتا تھا ۔ اور وہ زمانہ جب ابا مجھے کہانیاں اور انگریزی اور اُردو کی نظمیں سناتے تھے ۔ مجھے ابا کا وہ خفا ہونا بھی یاد ہے جب میں چھٹی جماعت میں تھا ، اور کسی ہم جماعت کی چائے کی دعوت میں شریک ہونے گیا تھا ، اور گھر پہنچنے میں وقت کی پابندی نہیں کر سکا تھا ۔ مجھے دیر ہو گئی تو ابا مجھے ڈھونڈنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے ۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں : اُن کا بیٹا بے قاعدگی نہیں کر سکتا تھا ۔ میں جب کھیل کود کر دعوت سے واپس گھر پہنچا تو وہاں کے حالات دیکھ کر ڈرا ضرور ـــ لیکن زیادہ احساس مجھے ابا کے رنج کا تھا ۔ سزا مجھے ملنی چاہیے تھی ، لیکن اُن کو میری اس نالائقی کا اتنا رنج تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ تکلیف میں

تھے - اور پھر ۵۸ تا ۶۹ کا وہ دور آیا جب ابا پہلے پرنسپلی اور پھر وائس چانسلری میں دن رات مصروف ہو گئے - ۱۹۶۰ میں میٹرک کے امتحان کے بعد مجھے پاکستان کی سیر سائیکل پر کرنے کا جنون ہوا - ابا کو میری یہ مہم زیادہ پسند نہ تھی، لیکن جس صبح میں اور میرا دوست سائیکلوں پر لاہور سے نکل رہے تھے، ابا اپنی کار میں باقی سب گھر والوں کو لیے ہر چوراہے اور موڑ پر پہلے سے ہی ہمیں خدا حافظ کہنے کھڑے ہوتے تھے - راوی کے پُل پر بھی جب ابا نمودار ہوئے تو میں نے اُن سے کہا کہ خدا کے لئے اب واپس ہو جائیے، میرا "سفر" بھی تو شروع ہونے دیجیے! ایم - ایس سی - کرنے کے بعد ۱۹۶۷ میں میں نے پھر مہم جوئی اور گھر سے "آزادی" کی ٹھانی - لاہور سے تین سو میل دور میانوالی کے قریب ملازمت ڈھونڈی - پہلی دفعہ یوں گھر سے باہر قدم رکھا - ایک سال سے زائد مدت یہاں رہا - مگر "آزادی" کے باوجود کوئی کارنامہ نہ کر سکا - بلکہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میں گھر سے باہر اور ابا کے قرب کے بغیر نہیں رہنا چاہتا - تقریباً ہر مہینے میں لاہور آتا رہا - ابا نے بھی اپنی وفاداری قائم رکھی اور اپنی تمام مصروفیات کو پسِ پشت ڈال کر وہ ایک دن سب گھر والوں کو لے کر مجھے ملنے کے لئے پہنچ گئے اور میرے رہنے کا کمرہ اور کھانے کی جگہ اور کام کی جگہ ـــ سب دیکھا - ۱۹۶۸ء میں کیمیکل انجینئرنگ میں ایم - ایس - کرنے کے لئے امریکہ چلا گیا - "غالب صدی" کے سلسلے میں امریکن یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتے ہوئے، ابا مجھے وہاں بھی ملنے پہنچ گئے! اور میری یونیورسٹی کی لائبریری کے لاؤنج میں میرے ساتھ بیٹھ کر گرم چاکلیٹ پی گئے!

امریکہ میں رہتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ باوجود اتنی ترقی کر جانے کے انسان کے معاشرے میں علم اور عقل اور انسانیت کی کتنی کمی ہے - مجھے امریکہ میں اپنا وقت ضائع ہوتا ہوا معلوم ہوا - اپنے گھر میں علم و انسانیت کا نور چھوڑ کر میں کہاں بھٹک گیا تھا! امریکہ سے واپسی پر ملازمت شروع کی - شادی ہوئی اور ابا سے خوب باتیں کیں - طرح طرح کے سوال کرتا تھا: اس تاریخی اور انقلابی دور

ں آپ نے غالب اور اقبال سے دلچسپی کیوں لی ، تاریخ اور معاشیات کو اپنا میدان کیوں نہیں بنایا ؟ آپ ادیب کیوں بنے ؟ لیڈر کیوں نہیں بنے ؟ وہ کبھی ہنس کر اور کبھی سنجیدگی سے میرے سوالوں کا جواب دیتے ۔ میرا سوال کتنا ہی فضول کیوں نہ ہو ، وہ اس کو سنتے تھے ۔ اُن کو میرے ذہنی اضطراب سے ہمدردی تھی ۔ مجھ پر "عمل" چھایا ہوا تھا ۔ شاعر اور ادیب اور خواب دیکھنے والے مجھے فضول نظر آتے تھے ۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے : دو ہزار سال ہوئے ایک شہر میں کچھ لوگ ایک آدمی کو سولی پر چڑھانے کے لئے لے جا رہے تھے ۔ وہ لوگ اُس سے مذاق کر رہے تھے ۔ وہ شخص یہ سب کچھ خاموشی سے سہہ رہا تھا ۔ لیکن اُس کو ایک رویت (Vision) نظر آ رہی تھی ۔ دوسرے یہ نہیں دیکھ سکتے تھے اور اُس پر ہنستے تھے ۔ اُسے سولی پر چڑھا دیا گیا ۔ لیکن اُس کا خواب ایک دن اس طرح حقیقت بنا کہ اُس نے آدھی انسانیت کی زندگیاں بدل ڈالیں ۔

میں ابا سے یوں ہی باتیں کر رہا تھا کہ وہ چلے گئے ۔ وہاں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ۔ اب مجھے سوالوں کا جواب اُن کی یادوں میں اور تحریروں میں ڈھونڈنا ہوگا ۔ لیکن ابھی کوئی سوال نہیں ہے ۔ صرف اُن کی یادیں ہیں ۔ اُن کی زندگی کی محنت و مشقت ، اُن کی سادگی اور پاکیزگی ، اُن کی مروت و شفقت ۔ وہ ایک مثالی باپ تھے ۔ اُن کے نزدیک شاید انسانیت کی سب سے بڑی قدر شرافت تھی ۔ وہ ایک سچے مسلمان ، سچے پاکستانی اور سچے دنیا کے شہری تھے ۔ کاش وہ چند دن اور ہمارے ساتھ رہ سکتے ۔

وہ جب بھی کوئی اچھی بات پڑھتے یا سنتے ، مجھے ضرور بتاتے ۔ میں جو پڑھتا یا سنتا ، بعد میں اُس پر سوالات لے کر اُن کے پاس پہنچ جاتا ۔ ابا علم کا ایک سمندر تھے ۔ اور میں اُن کے ساتھ رہتے ہوئے بغیر کوشش کیے انسان بن رہا تھا ۔ اُن کے چلے جانے سے میری تعلیم رُک گئی ہے ۔ یہ انکشاف مجھ پر اب ہوا ہے ۔ اب آگے بڑھنے کے لئے مجھے خود جان مارنی ہوگی ۔ تنہا ۔ ابا کی زندگی کے آخری دنوں میں میں نے فلسفہ پڑھنا شروع کیا تھا ۔ فلسفے پر ایک چھوٹی سی کتاب پڑھنے کے بعد

ابا نے میرے لیے وینڈلبینڈ (Windelband) کی تاریخ فلسفہ پر کتاب تجویز کی۔

فاران ، ۲۰۸

میں نے مارکسزم پر لینن کا کتابچہ پڑھا ۔ اب میں فلسفے پر کوئی بڑی کتاب پڑ
چاہتا تھا ۔ ابا اُن دنوں اقبال کے نظام فکر پر اپنا مقالہ لکھنے کی تیاری کر رہے تھ
اس کے لیے انھوں نے گھر میں ایک بڑی میز پر فلسفے سے متعلق بہت سی کتابی
سجا رکھی تھیں ۔ میں نے ابھی یہ کتاب شروع بھی نہ کی تھی کہ ۲۲ مارچ آ گ
اور ابا اچانک چلے گئے ۔

جمعہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح ایک عام صبح تھی ۔ ابا حسب معمول صبح سویرے اُٹھے اور دفتر جانے کی تیاری کی ۔ امی اور ننھے ممتاز* کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا ۔ صحت کی خرابی کی کوئی شکایت نہیں کی ۔ دفتر روانہ ہو رہے تھے کہ انھیں ایک قے ہوئی ۔ پھر بھی شاید اُن کو اپنی صحت خاص خراب معلوم نہیں ہوئی کیونکہ اُنھوں نے اُس وقت بھی وقار کو ڈاکٹر بلانے سے روکا ۔ لیکن قے کا سلسلہ جاری رہا اور چند منٹ بعد ، وہ بغیر کوئی خاص بات کہے بیہوش ہوگئے ۔ اُس وقت اُن کے پاس امی ، وقار ، منصور اور میری بیوی تھی ۔ ممتاز سکول جا چکے تھے ، جمیل اپنے دفتر اور میں اپنی فیکٹری ۔ خلیل کراچی میں تھے (جہاں وہ اُن دنوں ملازم تھے ۔) ڈاکٹر نے آ کر ابا کو دیکھا تو فوراً ہسپتال لے گئے ۔ میرے ایک تایا ، پھوپھو اور تین خالائیں بھی فوراً پہنچ گئیں ۔ مجھے فیکٹری فون کیا گیا ، خلیل کو کراچی ۔ بارہ بجے میں ہسپتال پہنچا ۔ کچھ دیر بعد جمیل اور ممتاز بھی آ گئے ۔ عجیب بے بسی کی سی حالت تھی ۔ سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے ۔ ایک شیر اپنے آخری دموں پر تھا ۔ لیکن کوئی یہ کہہ نہیں رہا تھا ، سوچ نہیں رہا تھا ۔ کوئی ڈاکٹر بلانے دوڑ رہا تھا ، کوئی دوا لینے ۔ ابا بے ہوش ہی رہے ۔ دوپہر دو بج کر پینتیس منٹ پر ، جب اُن کو تین ڈاکٹر دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے ، ابا ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے ۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ان کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی تھی ۔ اس کا کوئی علاج نہ تھا ۔ ہسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ کے کمرہ نمبر ۷ میں ابا صرف تین گھنٹے مہمان رہے ۔

---

* میرے چھوٹے بھائیوں کے نام جمیل ، خلیل ، وقار ، منصور اور ممتاز ہیں ۔

فاران، ۲۰۹

ابا کی صحت کبھی بھی بہت اچھی نہ تھی - لیکن کام کے وقت اور کام کے لیے اور دوسروں سے مروت اور اخلاص برتنے میں وہ ہمیشہ اپنی صحت کی کمزوری سے بے نیاز اور بے پرواہ رہے - اُن کی خوراک اور اُن کا رہن سہن سادہ تھا ، اور اس میں وہ اپنی صحت کے مطابق تبدیلی بھی کرتے تھے - لیکن کام میں اُن سے پرہیز نہ ہوتی تھی - زیادہ کام کرنے کا اُن کو شوق تھا ، اور وہ اسے اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتے تھے - خدا کی شان ہے کہ سال ہا سال اس شوق اور مشقت میں ان کی روح کا ساتھ ان کے جسم نے بھی دیا -

مجھے یاد ہے کہ آج سے پندرہ بیس برس پہلے بھی وہ کبھی کبھی اپنی صحت کا ذکر ہم سے اس طرح کرتے تھے کہ ہم جو اُس وقت کمسن تھے ، ذہنی طور پر کچھ نہ کچھ ابا کے دنیا سے غائب ہو جانے کے حادثے کے لئے تیار رہیں - ابا کے اس احساس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے دادا نے لمبی عمر نہ پائی تھی اور ابا کی عمر اُس وقت چھ برس تھی جب دادا جان کا انتقال ہوا - ۱۹۵۷ء میں جب میں ابھی ساتویں جماعت میں تھا، ابا کو ایک دن صبح اچانک چکر آنے لگے اور قے کی کیفیت رہی- گھر سے آدھے میل کے فاصلے پر ڈاکٹر مظفر (مرحوم) رہتے تھے ، جو اُس زمانے میں ہمارے گھر کے معالج تھے - بہت نیک خصلت آدمی تھے - میں بائیسیکل پر اُن کو بلانے بھاگا - رستے میں یہ خیال بار بار ذہن میں آیا کہ معلوم نہیں جب میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر گھر پہنچوں گا تو ابا سلامت بھی ہوں گے یا نہیں - ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا تو تمام ذہنی تیاریوں کے باوجود کوئی بات نہ کر سکا - صرف رو دیا -

اب سترہ برس بعد جب ۲۲ مارچ کی صبح کو دس بجے منصور نے مجھے فیکٹری فون کیا کہ ابا کی طبیعت اچھی نہیں ہے تو میں لکڑی کے آدمی کی طرح ساکت رہا - میں گھر کی طرف چل تو پڑا، لیکن میں نے کچھ نہیں سوچا، نہ سوچنے کی کوشش کی - ابا ہسپتال کے ایک کمرے میں بیہوش پڑے تھے - اُس وقت شاید میرے لاشعور میں یہ خیال آیا ہو کہ کہیں یہ ابا کی زندگی کی آخری گھڑی تو نہیں ہے ؟ خود میں

بغیر اس مسئلہ پر سوچنے کے دل ہی دل میں یہ کہہ رہا تھا کہ کل شام جب ابا نے مجھ سے خلیل کے biodata کی نقل مانگی تو میں نے اُن کو ٹھیک طرح سے جواب نہ دیا - (میں نے اُن سے کہا تھا کہ اس وقت تو میں بہت تھکا ہوا ہوں ، اور ابا نے کہا تھا کہ میں فوراً نہیں مانگ رہا ، کل یا جس وقت دے سکو دے دینا) یا پرسوں رات جب میں اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا اور ابا بند دروازے میں سے ہی کوئی بات کہنے کے بعد جب وہاں سے واپس ہوئے تو مجھے "داب" (آداب — گھر میں ہم سب رات سونے سے پہلے یا صبح جاگنے پر یا گھر سے باہر جانے یا آنے پر ایک دوسرے کو سلام کے بجائے آداب کہتے تھے) کہہ گئے ، جو میں ٹھیک سن نہ سکا اور چند سیکنڈ بعد سمجھا ، اور پھر میں نے جواب میں "داب" نہیں کہا - یا میں بڑے غیر جذباتی اور سائنٹفک انداز میں اس بات پر افسوس کر رہا تھا کہ ابا سے گزشتہ چند ہفتوں اور مہینوں میں جو بے شمار گفتگوئیں اور مباحثے ہوئے — پاکستان ، اسلام اور انسان کی زندگی کے بارے میں — ان کا میں نے کوئی لکھا ہوا ریکارڈ نہیں رکھا ، حالانکہ ابا سے ہر ایسی ملاقات کے بعد میں یہ کرنا چاہتا تھا ، مگر اسے ہمیشہ کل پر ہی ڈالتا رہا - اور اب مجھے کچھ یاد نہیں رہا - ننھے ممتاز سکول میں ساتویں جماعت کے سالانہ امتحان کے پرچے کے بعد گھر پہنچے اور پھر ہسپتال - وہ روتے ہی جاتے تھے اور میں صرف یہی سوچ سکا کہ یہ تو خوش قسمت ہیں جو کل ہی ابا سے جیومیٹری اور حساب کے سوال سمجھ رہے تھے - جو پچھلے کئی ہفتوں سے ابا کے ساتھ ساتھ تھے - آج کل گھر میں سب سے زیادہ دوستی ابا سے اُنھی کی تھی - جہاں ہم ابا کو صرف آداب کہتے تھے ، وہ ابا سے گلے ملتے تھے - ۱۹۶۰ میں ایک دن یہ افواہ گرم ہوئی کہ ابا (جو اُس وقت اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے) کا دفتر میں ہارٹ فیل ہو گیا ہے - اُس وقت گھر میں امی کی جو بری حالت ہوئی وہ بیان نہیں کی جا سکتی - لیکن ۲۲ مارچ کو ہسپتال میں وہ بڑی ہمت سے آخری دفعہ ابا کا سہارا بن رہی تھیں - ان کا ساتھی ان سے ہمیشہ ، ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا تھا - اُن کی روح ، اُن کے دل و دماغ میں جو حشر بپا تھا ، اُن کے چہرے پر درد و کرب کے آثار اُس کا پتہ دیتے تھے - اُن کا چہرہ اُن کا چہرہ نہیں

رہا تھا۔ شاید وہ رو بھی رہی تھیں لیکن ابا کو دونوں ہاتھوں سے سہارا بھی وہی دیے ہوئے تھیں - ابا بچوں کی طرح لیٹے ہوئے تھے - اُن کی آنکھیں بند تھیں ، اور چہرے پر ایک بے چارگی اور معصومیت سی - یوں ہمارا فرشتہ ہم سے جدا ہو رہا تھا - جمیل چپ چاپ سب دیکھ رہے تھے - اس دنیا میں اُن کا سب سے بڑا ہمدرد اور سہارا ختم ہو رہا تھا - میں سمجھتا ہوں کہ وقار اپنے جذبات کا بہت اظہار کرنے والی شخصیت نہیں - لیکن آج وہ بھی رو رہے تھے اور ساتھ ہی بہت مستعدی سے آخری بار ابا کے کام بھی کر رہے تھے - وہ صبح سے تیار تھے ، ابا کو اُس روز دفتر وہی ڈرائیو کر کے لے جانے والے تھے - منصور کا حال بھی ایسا ہی تھا - وہ ایک زندہ دل اور شوخ انسان ہیں ، لیکن آج ان کی زندگی سے بہار ختم ہو چکی تھی - جمعے کی شام کو کراچی سے لاہور ہوائی جہاز کی پرواز نہیں تھی - خلیل شام کو پہلے راولپنڈی پہنچے اور پھر وہاں سے بس کے ذریعے صبح تین بجے لاہور - ان کو صرف ابا کی علالت کی خبر ملی تھی- لیکن ۵ بیگم روڈ کی گلی میں اس رات گئے گھر کا لمپ جلا دیکھ کر بے اختیار ان کی چیخیں نکل گئیں - گھر میں سب جاگ رہے تھے ، لیکن کامل خاموشی تھی - روشنیاں جل رہی تھیں اور ابا سو رہے تھے - میں باہر برآمدے میں کرائے کی نواری کرسی پر اکیلا بیٹھا تھا (وقار ابا کی روایت پر چلتے ہوئے کار لے کر خلیل کو بس کے اڈے پر (ڈھونڈنے) لینے گئے ہوئے تھے) کہ ابا کی طرح کے مختصر جسم والے خلیل دائیں ہاتھ میں بیگ اٹھائے —— تمام دن کے واقعات اور سفر کے تھکے ہارے — بایاں ہاتھ ماتھے پر رکھے سامنے سے گزرے - وہ سر اُونچا کیے چلے جا رہے تھے اور دنیا سے بے نیاز رو رہے تھے - تین سال سے وہ ملازمت کی خاطر اپنے گھر سے دور تھے - وہ چاہتے تھے کہ اُن کو لاہور میں ملازمت مل جائے ، لیکن اس میں اُنھیں کامیابی نہ ہوئی - عجیب اتفاق ہے کہ ۲۲ مارچ کی صبح کو اُنھوں نے فیکٹری میں اپنے افسر سے ملاقات کر کے پندرہ دن کی لمبی چھٹی لی کہ اپنے ماں باپ سے ملیں اور چند دن اُن کے ساتھ گزاریں - لیکن اس سے پہلے کہ وہ کراچی سے روانہ ہوتے ، اُن کو لاہور سے فون پہنچ گیا -

اب خلیل اپنے آپ کو اس طرح سے تسلی دیتے ہیں کہ چلو ، ابا سے دور تو

رہا ، لیکن اس طرح اُن کے بہت سے خط بھی تو مل گئے ۔

۱۹۵۷ میں میں نے بلڈ پریشر کا نام پہلی دفعہ سنا ۔ اُس وقت ابا خاصے بیمار ہوئے ۔ لیکن ایک مہینہ بستر پر رہنے کے بعد پھر زور و شور سے کام میں لگ گئے - ۱۹۵۸ میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہوئے اور ۱۹۶۳ میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر - ۱۹۵۹ء میں جب میں دسویں جماعت میں پہنچ گیا تو ابا نے اس بات پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا کہ اب سعید اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے ، اور اپنے گھر والوں کے لئے سہارا بھی بن سکتا ہے - پچھلے سال جون میں ابا پر پھر ایک بار مرض کا شدید حملہ ہوا ، اور اس کو ابا نے خدا کی طرف سے یہ پیغام تصور کیا کہ اب اپنی زندگی کا کام سمیٹ لو - اور انہوں نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا - جو ہم سمجھ نہ سکے - ہمیشہ کی طرح اب بھی انہوں نے ہر طرح سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی ، لیکن کام زور و شور سے جاری رکھا ۔ اُن کی دوکتابیں ”اقبال کی شخصیت اور شاعری“ اور ”تعلیم و تہذیب“ پریس میں تیار ہو رہی تھیں ، جو اب اُن کے بعد چھپ گئی ہیں - کچھ چیزیں وہ خود پریس میں نہیں بھیج سکے ، لیکن گھر میں وہ مسودے اس طرح سے رکھ گئے ہیں کہ یہ کتابیں بھی چھپ جائیں گی ۔

دو تین دن ہوئے ممتاز امی سے کہہ رہے تھے کہ کبھی ابا کا انتقال اُس وقت ہوتا جب میں بھی سعید بھائی جان جتنا ہو چکا ہوتا ۔ ممتاز نے واقعی ابا کے ساتھ ہم سب کے مقابلے میں کم وقت گزارا ہے ۔ اگرچہ اُن کی آٹھ سالہ سکول کی زندگی میں اُن کو سکول لے جانے اور لانے والے ابا ہی تھے، اور اس مارچ کے ساتویں کے سالانہ امتحان کی سب تیاری بھی ابا نے ہی ممتاز کو کروائی تھی ، لیکن نہ جانے اُن کی کتنی حسرتیں باقی رہ گئی ہیں - چند مہینے ہوئے ممتاز نے کسی ہوٹل میں جا کر ڈنر کھانے کی فرمائش کی ۔ میں نے اس سے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی ، لیکن ابا کو ممتاز کی اس طفلانہ خواہش کا احترام تھا ۔ اور طے ہوا کہ ۱۷ ستمبر ۷۳ء کو جب میرے بیٹے محمد علی کی دوسری سالگرہ کا دن تھا ، ابا ہم سب کو ہوٹل میں ڈنر دیں گے ۔

افسوس ہے کہ ڈنر نہ ہو سکا، کیونکہ اس سے چند دن پہلے ہماری ایک قریبی عزیزہ کا انتقال ہوگیا - اور پھر ابا کی صحت بھی بہت اچھی نہ تھی اور نمک کھانا انھوں نے بالکل ترک کر دیا تھا - لیکن ممتاز کا ڈنر اُن کو یاد تھا - ایک دن کسی رسالے میں مضمون کے معاوضے کے طور پر اُن کو ایک سو روپیہ ملا - وہ ممتاز کو دے دیا - ممتاز کو وہ " ننھے بھیا " کہا کرتے تھے - کہنے لگے " ننھے بھیا، اب میں تو شاید آپ کے ساتھ ڈنر نہیں کھا سکوں گا، لیکن ڈنر بہر حال ہونا چاہیے، اس کے لئے آپ یہ رکھ لیجیے -" ممتاز نے ڈنر ابھی تک نہیں کھایا تھا - اب شاید کھائیں گے بھی نہیں - ابا کی ایک الماری میں انھوں نے یہ سو روپیہ ابا کی زندگی میں رکھا تھا، اب بھی وہیں رکھا ہے - ایک لفافے میں دس دس کے دس نوٹ - مجھے دکھا رہے تھے کہ اب وہ اس کو خرچ نہیں کرنا چاہتے -

معلوم نہیں ممتاز نے اپنا مقابلہ مجھ سے کیوں کیا - میں تیس برس کا سہی، لیکن جس طرح ممتاز ابا سے جیومیٹری کے سوال سمجھ رہے تھے اُسی طرح میں بھی تو ابا سے زندگی کا مطلب سمجھ رہا تھا - آج کل تو ہر دوسرے تیسرے دن بات چیت کا ایک دور ہوتا تھا - میری فیکٹری میں " پرل ٹاور " سے گرتے تیار شدہ یوریا کا نظارہ تو انھوں نے دیکھ لیا تھا لیکن فیکٹری کے کیفی ٹیریا میں اکٹھے بیٹھ کر کھانے کا پروگرام تو بیچ میں ہی رہ گیا - ہم نے اکٹھے بہت سیر کی لیکن کابل اور غزنی اور سمرقند اور بخارا کا بھی تو پروگرام تھا - اور وہ چین کو جانے والی شاہراہ ریشم بھی تو اب تیار تھی! پہلے ابا نے ہمیں سیریں کروائی تھیں - میں سوچتا تھا کہ اب میں اُن کو کراؤں گا - خود ابا نے مجھے اٹھارھویں سالگرہ پر جو کتاب Wonders of the World دی تھی، اُس پر یہ شعر لکھا ہے:

تجھ کو تو دی ہی جائے گی، ہم کو بھی دے خدا
وہ عمر جو بہار میں دیکھے پھبن تری!

ابا جا چکے ہیں - کہانی ختم ہو چکی ہے - خود میری زندگی کی (اگر میری عمر لمبی ہو) یہ آدھی داستان ہے - یہ داستان ابھی تک بن رہی تھی - اب ختم ہو

گئی ہے - مجھے دنیا ویران خاموش اور اندھیری معلوم ہوتی ہے - رات کے سیاہ آسمان کے نیچے ویرانے میں صرف میں ہوں - اکیلا میں - اور ابا کی آواز کی گونج — ایک دن میں نہیں ہوں گا - - - ایک دن میں نہیں ہوں گا - - - ایک دن - - - -

ابا کہاں ہیں ؟ مٹی کے اک ڈھیر کے نیچے ایک خول ہے جو کبھی ابا تھے - اب یہ ابا نہیں - یہ اُن کی ایک چیز ہے ، ایک یادگار - لیکن ابا کہاں ہیں ؟ گھر میں اُن کا کمرہ ویران ہے - اُن کی کپڑوں کی الماری میں اُن کے کپڑے اُسی طرح ٹنگے ہیں - اُن کی کتابیں الماریوں میں اُسی طرح رکھی ہیں - اُداس ہیں - ابا ان کے دوست تھے - ان کا خیال رکھتے تھے ؛ احترام کرتے تھے - (خود ہم یہ سیکھ چکے تھے کہ کتاب کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ صابن سے دھلے ہونے چاہئیں -) کس شوق اور محبت سے ابا نے ان کتابوں کو زندگی بھر ایک ایک کر کے جمع کیا تھا اور اپنے ہاتھوں سے ان الماریوں میں سجایا تھا - اب ان کو ابا کا انتظار ہی رہے گا - ایک الماری میں ابا کی گھڑی پڑی ہے ، جو اب چل نہیں رہی - اُن کے پڑھنے کی عینک اور فاؤنٹین پن بھی رکھے ہیں - سب اُداس ہیں اور انتظار کرتے کرتے تھک چکے ہیں - لیکن ابا کہیں نظر نہیں آتے - وہ بہت دور جا چکے ہیں - اب کبھی واپس نہیں آئیں گے -

میں جو ابا سے روز ملتا تھا جب سوچتا ہوں کہ اب وہ نہیں رہے تو اُداسی اور غم مجھ پر چھا جاتا ہے - خدا نے آدم اور حوا کو جنت سے نکالتے ہوئے روٹی کمانے اور بچے جننے کی سزائیں تو سنائی تھیں لیکن یہ تیسرا عذاب ، یہ باپ یا ماں یا کسی اور قریبی عزیز سے ہمیشہ کی جدائی کا غم کس جرم کی سزا ہے ؟ دنیا اور زندہ رہنے کے عام دھندوں اور مصروفیتوں نے مجھے اس غم سے بچایا ہوا ہے - یا یہ سوچتا ہوں کہ یہ انتظار ہمیشہ کا نہیں ہے - ایک دن میں بھی روانہ ہوں گا اور یہ انتظار ختم ہو جائے گا - یا اُن سے جا ملوں گا ، یا اُس سمندر میں غرق ہو جاؤں گا ، جس میں ابا غائب ہو گئے ہیں -

زندگی اور موت کیا ہے ؟ انسان کیا ہے ؟ میں یہ سمجھ نہیں سکتا - اسی

لئے اپنے آپ کو ابا کی جدائی کا غم کھانے کے قابل نہیں سمجھتا - غم ضرور ہے ، لیکن اس کو میں نے ایک پردے کے پیچھے چھپا رکھا ہے - جی چاہتا ہے کہ یہ پردہ ہٹا کر جی بھر کر غم کھاؤں مگر ایسا نہیں کرتا - ایک دن یہ سب سمجھنا ضرور ہے - ایک دن ابا کو یاد ضرور کرنا ہے - میں فلسفہ و تاریخ و ادب کے اوراق چھانوں گا اور ابا کو ضرور پا لوں گا - اُن سے ملاقات کروں گا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ تمام باتیں جو رہ گئی ہیں -

کاش میں بھی انسانیت کی مشقت ، قربانیوں ، کارناموں اور اچھی باتوں کے اس سمندر میں ایک قطرہ شامل کر سکوں جس کے لئے ابا نے بھی اپنی زندگی نذر کی - شاید مجھ میں اس لائق سکت یا قابلیت نہیں ہے - لیکن میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں - میری کوشش جاری رہے گی - میرے اندر ایک جذبہ ہے - جو ابا نے پیدا کیا - پھر سال ہا سال ہم دونوں نے — ابا نے اور میں نے — اس کو "پالا" - اب ابا یہ شہر چھوڑ چکے ہیں اور میں اکیلا ہوں - لیکن اپنے اندر اس جذبے کو میں اب پہلے سے بھی زیادہ مضبوط پاتا ہوں - میں ابا کا بہت دوست تھا لیکن مجھے اُن کی روح کے اتنے طاقتور اور پُر اثر ہونے کا اندازہ نہ تھا -

اب مجھ پر واضح ہو رہا ہے کہ افلاطون کا کیا مطلب تھا جب اُس نے کہا کہ اصل حقیقت خیال (idea) ہے - صرف خیال کا وجود ہے - مادہ وجود نہیں رکھتا -

———

پروفیسر خواجہ محمد اسلم

یادِ یار مہرباں

حضرات! کالج کی بزمِ فروغِ اُردو کے زیرِ اہتمام آج کا یہ اجلاس اُس عظیم انسان کی یاد میں منعقد ہو رہا ہے جو کل تک ہمارے درمیان موجود تھا اور جس کے لئے آج مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ہوئے زبان لرزتی ہے اور دل میں گہرے گھاؤ پڑتے ہیں - غالباً ۱۹۳۴ء میں پروفیسر حمید احمد خاں کا تقرر انگریزی لیکچرار کی حیثیت سے ہوا- میں یہاں ۱۹۳۶ء میں آیا اور اُس وقت سے لے کر آخری دم تک میرے اُن کے ساتھ نہایت مخلصانہ اور برادرانہ روابط قائم رہے - جب وہ کالج میں لیکچرار تھے تو اُن کی شادی ہوئی اور میں اُن کے دوسرے دوستوں کے ہمراہ اس تقریب میں شریک ہوا - مسرت و شادمانی کے اس موقع پر ہم نے دو روز اُن کے آبائی گاؤں کرم آباد میں قیام کیا - اس سفر میں ہمیں ان کی والدہ مرحومہ کے مرقد کی زیارت بھی نصیب ہوئی - اُن کی تربت پر جو اشعار کندہ تھے اُن میں اس قدر سوز و گداز تھا کہ اب بھی جب کبھی مجھے وہ اشعار یاد آتے ہیں تو میری آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں - یہ اشعار ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں -

پروفیسر حمید احمد خاں نے مختلف حیثیتوں میں کالج کی خدمت کی اور جب وہ اس کالج سے یونیورسٹی میں بطور وائس چانسلر تشریف لے گئے تو اُس وقت بھی اور اُس کے بعد بھی اس کالج کی محبت اُن کی رگ رگ میں تھی اور میں نے کوئی

۱- خواجہ صاحب اسلامیہ کالج کے سابق پرنسپل ہیں - اُن کی یہ تقریر ایک جلسے میں ٹیپ ریکارڈ ہوئی اور بعد میں لکھی گئی -

لمحہ اُن کی زندگی میں ایسا نہیں دیکھا جب میں یہ کہہ سکوں کہ انہوں نے کالج کو فراموش کر دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کالج کو کبھی نہ بھولے ۔

یونیورسٹی گئے تو جہاں ایک طرف انتظامیہ کی پیدا کردہ پیچیدگیاں سلجھانے میں منہمک ہو گئے تو وہاں دوسری طرف ایسے کارہائے نمایاں سر انجام دئے جو قومی نقطہ نظر سے میرے خیال میں اس قدر غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں کہ اُن پر آنے والی نسلیں بجا طور پر فخر کریں گی ۔ آنہوں نے یونیورسٹی میں کئی ایسے شعبے قائم کئے جن کا مقصد اسلامی علوم اور اسلامی و پاکستانی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا تھا ۔ آنہوں نے Encyclopedia of Islam کے شعبے میں ایک نئی روح پھونک دی اور Research Society of Pakistan قائم کی اور تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند لکھوانے کا اہتمام کیا اور پھر اس کے علاوہ جیسا کہ بعض مقررین نے ابھی فرمایا کہ انھیں غالب اور اُس کے فن کے ساتھ والہانہ لگاؤ تھا ۔ اس سلسلے میں آنھوں نے جو قابلِ قدر تنقیدی کام کیا وہ مستقل حیثیت رکھتا ہے ۔ یونیورسٹی میں آنھوں نے غالب Chair قائم کی اور ۱۹۶۹ء میں غالب کے صد سالہ جشنِ ولادت میں آنھوں نے اُس میں یونیورسٹی کی پُر وقار شرکت کا اہتمام کیا ۔

اُن کی دُور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر ہماری قومی زبان اُردو کو سرکاری زبان بننا ہے تو لرنڈ سائنسز (Learned Sciences) کی تدریس کا کام بھی اُردو زبان سے لیا جائے گا ۔ چنانچہ آنہوں نے ایک ادارہ تالیف و ترجمہ بھی قائم کیا جس نے دوسری زبانوں کی فنی اصطلاحات (Technical Terms) کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا ۔ اس کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں نے اسی چیز کے پیشِ نظر طلباء کو یہ آسانی بہم پہنچائی کہ وہ بی۔ اے۔ تک اور بعض آرٹس کے مضامین میں ایم۔ اے۔ تک اپنے سوالوں کے جواب یونیورسٹی کے امتحانوں میں اُردو میں دے سکیں ۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے زمانے میں یونیورسٹی کانووکیشن کی کاروائی اُردو میں ہونے لگی ۔ یہاں تک کہ اسناد کا لکھا ہوا ڈھانچہ بھی اُردو میں

تبدیل ہوگیا -

ایک چیز کا میں خاص طور پر ذکر کروں گا - گذشتہ ۳۵ سال کے عرصے میں ایک چیز جو میں نے آن میں دیکھی وہ یہ تھی کہ کبھی آن کے منہ سے کوئی کلمہ، کوئی جملہ، کوئی بات ایسی نہ سنی جو کسی معیار کے مطابق شائستگی سے گری ہوئی ہو - چونکہ میرے آن سے گہرے روابط تھے اس لئے کبھی کبھی میں آن سے Liberties لے لیا کرتا تھا - یہی حال فیاض محمود اور عبدالواحد کا بھی تھا۔ لیکن وہ ہماری باتوں کا برا نہ منایا کرتے تھے - اگر وہ کبھی کسی سے ناراض بھی ہوتے تو اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے الفاظ کے چناؤ میں خاص احتیاط برتتے کہ کہ کہیں برہمی کے عالم میں آن کے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جس سے دوسرے کے جذبات مجروح ہوں - یہ بھی ایک خاص چیز میں نے آن میں دیکھی -

حمید احمد خاں بڑے صاحبِ عزم آدمی تھے- جس بات کا بیڑا آٹھاتے تھے آس کو پورا کر کے دم لیتے تھے - جو بات کرتے تھے نہایت سوچ سمجھ کر کرتے تھے - دوستوں سے مشورہ کرتے تھے اور جب آنہیں یقین ہو جاتا کہ آن کا موقف صحیح ہے تو پھر راستے میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں وہ اپنے عزم اور جزم کے ساتھ حالات پر قابو پاتے تھے اور بالآخر کامیابی آن کے قدم چومتی تھی -

خاں صاحب میں قدرت نے کچھ ایسی خوبیاں پیدا کر رکھی تھیں جو اب لوگوں میں بہت کم نظر آتی ہیں- جہاں تک طلبا کا تعلق تھا، نہ صرف طلباء بلکہ سٹاف کے ہر لیکچرار سے بھی آن کی شفقت بے پایاں تھی- جب وہ پروفیسر تھے طلباء کالج میں آنہیں اپنا آخری سہارا سمجھتے تھے - اسی طرح سٹاف کو جب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ آنہیں کی طرف رجوع کرتے تھے اور جس محبت، خلوص اور دلسوزی کے ساتھ وہ ان سب کی مشکلات سنتے اور پھر آنہیں دور کرنے کی کوشش کرتے لوگ آسے آج بھی یاد کرتے ہیں -

تو پروفیسر حمید احمد خاں اگرچہ اس وقت ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن اُن کے کارہائے نمایاں کبھی فراموش نہیں ہو سکتے - یونیورسٹی میں انھوں نے بہت کچھ کہا - بہت کچھ کیا - اور میں یہ بات اس لئے پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا تقریباً دس سال ممبر رہ چکا ہوں - یونیورسٹی کی کوئی ایسی مقتدر High Powered کمیٹی نہ ہوگی جس کا میں یا تو چیئرمین یا ممبر نہ ہوں گا - اس لئے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ خاں صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے لئے جو کام کیے ہیں - میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کے کسی دوسرے وائس چانسلر نے اتنا کام یونیورسٹی کے معاملات سدھارنے کے لئے نہ کیا ہوگا -

حمید احمد خاں کی باتیں اگر انسان کرنے لگے تو کرتا ہی چلا جائے - لیکن وقت زیادہ ہو چکا ہے اور جب آدمی ماضی کے دریچوں سے جھانک کر دیکھتا ہے ، تو اُس کے سامنے کئی ایسے نقوش اُبھر آتے ہیں جن کے حُسن کا احاطہ کرنا انسانی بساط سے باہر ہوتا ہے - حمید احمد خاں کی متنوع زندگی کے بارے میں کہنے کو تو بہت کچھ جی چاہتا ہے لیکن وقت کی تنگ دامانی میرے راستے میں حائل ہے -

تو صاحبو ! حمید احمد خاں کی موت ایک ادیب کی موت ہے - ایک عظیم دانشور کی موت ہے - ایک ایسے انسان کی موت ہے جس نے انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو اپنایا جس نے اپنی ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری اور بالآخر علم ہی کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی -

یہ تصویر (پروفیسر حمید احمد خاں کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جو آپ دیکھ رہے ہیں ، جب پروفیسر حمید احمد خاں اس کالج سے بطور وائس چانسلر یونیورسٹی گئے تو میں نے ایک ہفتے کے اندر اسے بنوا کر یہاں سامنے دیوار پر آویزاں کیا اور پھر پروفیسر حمید احمد خاں کو ہی تکلیف دی کہ وہ خود اس تصویر کی نقاب کشائی کریں -

اس کالج کی ایک ایک اینٹ پر، اس کے ایک ایک پتھر پر حمید احمد خاں کا نام نقش ہے اور نقش رہے گا۔ اس کالج کے طلباء اور سٹاف کے دلوں اور دماغوں پر اور اسی طرح یونیورسٹی کے طلباء اور سٹاف کے دلوں اور دماغوں پر یہ نام ہمیشہ مرتسم رہے گا۔

مجھے یقین ہے کہ حمید احمد خاں کو کبھی نہ بھلایا جا سکے گا اور اُن کی خدمات کو کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ میری دعا ہے کہ خدائے عز و جل ان کی واجب الاحترام رفیقۂ حیات، اُن کے بچوں، ان کے بھائیوں اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو صبر و ثبات کے ساتھ یہ صدمۂ جانکاہ برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

————

جناب وحید اطہر

پروفیسر حمید احمد خاں ــ محبت و شفقت کا پیکر

آج سے نو سال پہلے اپنے والد محترم کی وفات پر آخری بار قلم اٹھایا تھا ۔ پنجابی نظم کے ان مختصر مصرعوں پر واہ واہ کے ڈونگرے برسائے گئے ۔ اور آج طویل خاموشی اور جمود مسلسل کے بعد پھر قلم اٹھایا ہے ۔ لیکن اب کی بار تو ہر طرف ''آہ آہ'' کا سماں ہے ، ''واہ'' کون کہے گا ۔

کالج کے رسالے فاران کے لیے مضمون نگاری کا ایک مقابلہ منعقد کیا گیا ۔ طبع آزمائی کے لیے موضوع تھا ''میرے کالج کے ابتدائی تاثرات''۔ میں نے اپنے شکستہ فقروں سے مضمون لکھا اور مقابلے کے لیے دے دیا ۔ اس مضمون میں کچھ تھا یا نہیں البتہ ایک چیز بدرجہ اتم موجود تھی ۔ وہ یہ کہ کالج کی درو دیوار ، ماحول ، طلبا اور اساتذہ سے بے پناہ عقیدت ، لگاؤ اور محبت کا اظہار ہوتا تھا ۔ مضمون شائع ہوا ۔ رسالہ کی تقسیم کے پہلے روز مجھے پروفیسر افتخار احمد صدیقی جو ان دنوں اسلامیہ کالج میں تھے اور رسالہ کے نگران تھے ملے اور فرمانے لگے کہ تمھیں پرنسپل صاحب نے یاد کیا ہے ۔ میں پریشان ہو گیا ـــ یہ پریشانی بے جا نہ تھی اس لیے کہ نیا نیا کالج میں آیا تھا ۔ یہاں کے ماحول سے ناواقف تھا اور یوں ماضی کے مشاہدات گواہ تھے کہ ایسا بلاوا سرزنش کے لیے ہی ہو سکتا ہے ۔ خائف تھا کہ خدا جانے کیا حال ہو ۔ ڈرتے ڈرتے پرنسپل صاحب کے دفتر پہنچا ۔ دفتر میں داخل ہوا ، مختصر جسم لیکن عظیم شخصیت کے مالک پرنسپل صاحب نے انتہائی شیریں لہجے میں کہا ''فرمائیے ۔''

''جی مجھے وحید اطہر کہتے ہیں ، آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے ، میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ۔ وہ اپنی نشت سے اٹھے ، میز سے گھوم کر میرے بالکل

قریب آ گئے اور فرمانے لگے "میں نے رات آپ کا مضمون پڑھا ، پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا اس بات کا کہ وہ میرا لکھا ہوا نہیں ہے" اور ساتھ ہی مجھے تھپکی دینے کے انداز میں گلے لگا لیا - یہ تھا میرا پروفیسر حمید احمد خاں سے پہلا تعارف -

جن لوگوں نے خاں صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ ان کے تعریف کرنے کے اس انداز سے بخوبی واقف ہوں گے - کسی کی تعریف کے ضمن میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا - طبعیت میں انتہا کی فیاضی تھی - مادی امدد ہو یا روحانی یا محض "شاباش" مقصود ہو" انداز اس قدر کھلا اور غیر مبہم ہوتا کہ بخل کا شائبہ تک نہ ہوتا -

بات مالی امداد کی ہوئی ہے تو مجھے ۱۹۶۴ع کا وہ واقعہ یاد آ رہا ہے جب میں نے بی - اے - امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور ایم - اے - میں داخلہ لیا - خاں صاحب ان دنوں وائس چانسلر تھے - اپنی سعادت مندی کے تحت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا محض یہ عرض کرنے کے کہ میں نے بی - اے - اعزاز کے ساتھ پاس کر لیا ہے اور یہ کہ اب یونیورسٹی میں پہنچ گیا ہوں - یہ وہ زمانہ تھا کہ میں انتہائی مالی پریشانیوں کا شکار تھا - تین تین ٹیوشنیں پڑھاتا ، تحریر کا کام کرتا تو بھی ہوسٹل کے اخراجات پورے نہ ہوتے اور نوبت بعض اوقات کھانا نہ کھانے تک پہنچ جاتی - میری اس تنگ دستی کا علم خاں صاحب کو پہلے سے تھا - جونہی دفتر میں داخل ہوا وہی مخصوص وضع دارانہ انداز . . . مجھے بیٹھنے کو فرمایا —— اس سے پہلے کہ میں بات شروع کرتا آپ فرمانے لگے ،

"یہ تو میں آپ سے بعد میں پوچھوں گا کہ آپ کیسے تشریف لائے ، پہلے یہ بتائیے آپ نے آج صبح ناشتہ کیا تھا ؟"

"جی" میں نے عرض کیا -

"کیا کھایا تھا ؟"

"توس تھے ، چائے تھی اور مکھن تھا" (مکھن کا نام میں جھوٹ لیا تھا) ۔

"انڈے نہیں تھے؟" انھوں نے پھر پوچھا ۔

"جی نہیں" میں نے قدرے خفیف ہو کر مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔

"انڈوں کے بغیر تو ناشتہ ہی مکمل نہیں ہوتا" انھوں نے فرمایا ، اور ساتھ ہی گھنٹی دے کر چپراسی کو بلایا اور حکم دیا کہ "کیفے ٹیریا سے اس قسم کی چائے لائیے جو چائے کم اور دوپہر کا کھانا زیادہ ہو" اور پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ آپ سے ابھی چائے پر بات ہوگی آپ باہر تشریف رکھیے ــــ"

توڑ پھوڑ اور ہڑتالوں کے اس دور کے طالب علم شاید اس چائے کو محض خورد و نوش کی نظر سے دیکھیں اور مجھے نمک خوار قرار دے کر حق نمک ادا کرنے کا الزام دے دیں ، لیکن جو لوگ اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں وہ ان جذبات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو اس چائے کے پس پردہ کارفرما تھے ۔

۱۹۶۳ع کا زمانہ تھا ، آپ وائس چانسلر بن چکے تھے ، میں کریسنٹ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۵۹ میں رہتا تھا ۔ تعلیمی اور غیر تعلیمی مشقت نے مجھے شدید علیل کر دیا ۔ کسی نے میری اس علالت کی خبر انھیں دے دی ــــ وہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر کے ساتھ ہوسٹل میں تشریف لائے ، میرے کمرے میں آ کر نہ صرف میری مزاج پرسی کی بلکہ ڈاکٹر کو معائنے کے لیے کہا اور میری حالت کے پیش نظر اپنی کار میں مجھے اسی ڈاکٹر کی نگرانی میں ہسپتال پہنچایا ۔

وقت کی پابندی ، وضع داری ، رکھ رکھاؤ اور سادگی ایسے خواص تھے جن کے مجموعہ نے پروفیسر حمید احمد خاں کا نام پایا تھا ۔ انگریزی ادب کا مسئلہ ہو یا اُردو زبان کا ــــ صحت کا خیال انتہا پر رہتا ۔ یہاں تک کہ کوئی اگر ان کا نام لکھتے وقت "خاں" میں نقطہ ڈال دیتا تو انتہائی ناراضگی کا اظہار کرتے ۔ انگریزی کے ضمن میں یہ حال تھا کہ وائس چانسلری کے زمانے میں انھوں نے ایک بار اخباری بیان کے ذریعے طلبا کو انگریزی میں درخواست لکھنے سے منع کر دیا تھا ۔ اس کی وجہ جہاں ان کا اُردو زبان سے پیار اور لگاؤ تھا وہاں یہ وجہ بھی تھی کہ طلبا انگریزی میں

درخواست لکھتے تو فاش غلطیاں کرتے جو خاں صاحب کو ناگوار گزرتیں ۔ اسی لیے انھوں نے اس میں بیان فرمایا تھا ۔

,'They are bringing the Queen's language out of shape''.

جب تک استاد گرامی حیات رہے مجھے یہی گمان رہا کہ مجھ سے بڑھ کر وہ اپنے کسی شاگرد کو عزیز نہیں رکھتے ۔ لیکن آج ان کی وفات کے بعد جب ہر طرف اخبارات ، رسائل اور ادبی و نجی محفلوں میں ان کی شخصیت کے تذکرے ہو رہے ہیں تو محسوس ہوا ہے کہ جو کوئی بھی ان سے ملا ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ خاں صاحب اس سے بڑھ کر کسی کو عزیز نہیں جانتے ۔ اسلامیہ کالج کے قدیم طالب علم ارشاد راؤ کا تار خاں صاحب کے بڑے صاحب زادے سعید احمد خاں کے نام موصول ہوا ہے کہ "قوم عظیم رہنما کے لیے سوگوار ہے اور میں اپنے باپ کے لیے ماتم کناں ہوں ۔" ہر شخص کے لیے یہی وہ پدرانہ شفقت تھی کہ گمان ہوتا تھا کہ خاں صاحب کی نظر شفقت صرف مجھ ہی پر ہے ۔

اپنے شفیق روحانی باپ کے انتقال سے صرف چند دن قبل میں آپ سے ملنے ان کے دفتر پہنچا تو پتہ چلا کہ آپ دفتر تشریف نہیں رکھتے ۔ گھر پر ہیں اور کوئی مقالہ یا لکھنے کا کوئی دوسرا ضروری کام کر رہے ہیں ۔ ملنے کی خواہش کچھ اس قدر شدید تھی کہ سیدھا ان کے دولت خانے کا رخ کیا ۔ ملاقاتی گھنٹی بجائی تو گاؤن پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور اسی روائتی انداز سے تھپکی دیتے ہوئے سینے سے لگایا ۔ برآمدے میں رکھی کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے ۔ پانچ دس منٹ کی یہ ملاقات ان سے میری آخری ملاقات تھی ۔ میرے پاس ان کے لیے نئے سال کی ایک ڈائری تھی جو میں ملاقات کے بہانے کے طور پر ساتھ لایا تھا ۔ انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول فرمائی ۔ پھر اور باتیں ہوئیں ۔ میرا حال پوچھا ۔ کہنے لگے کہ اسلامیہ کالج کے رفقا تو ملتے ہوں گے ؟ میں نے کہا ، جی ہاں اور بعض اساتذہ کے نام لیے ۔ کہنے لگے مجھے تو ان سے ملے عرصہ ہی ہو گیا ہے ۔ پھر خود ہی فرمانے لگے ، آپ کو عزیز الرحمٰن چپراسی یاد ہے ؟ اس کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا ۔ کالج کا بہت پرانا اور خدمت گزار چپراسی تھا ۔ میں اسلامیہ کالج گیا تھا ۔ دیر تک مرحوم کے کوارٹر میں بیٹھا رہا اور

فاتحہ خوانی کی ۔ اس دوران میں آپ کچھ آبدیدہ ہو چکے تھے ۔ ساتھ ہی فرمانے لگے "اور ہاں آپ کو علم ہے کہ ڈاکٹر سعید اللہ انتقال فرما چکے ہیں" میں نے عرض کیا کہ اس عظیم سانحہ کا پتہ مجھے چل چکا ہے ۔ فرمانے لگے "ڈاکٹر صاحب ایک عظیم رفیق تھے ۔ آخری دنوں میں ضعیفی کے باعث زیادہ چل پھر نہ سکتے تھے ۔ باہر کم جاتے تھے ۔ کبھی کبھار میں انھیں کار میں کہیں گھومنے یا کسی جلسے میں لے جاتا تھا ۔ پھر بہت دیر پرانے شاگردوں اور رفقاء کار کا ذکر فرماتے رہے ۔ عزیز الرحمٰن چپراسی سے لے کر ڈاکٹر سعید اللہ تک سبھی ، قطع نظر اپنے معاشی مرتبہ کے ، انھیں یکساں عزیز تھے ۔

استاد گرامی کے شاگرد ، میرے استاد ، محسن اور دوست دلدار بیگ مرزا سے ملاقات ہوئی ۔ خاں صاحب کا ذکر زبان پر آتے ہی وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر آبدیدہ سے ہو کر صرف اتنا کہا "لوگ کہتے ہیں پروفیسر حمید احمد خاں رحلت فرما گئے لیکن میں کہتا ہوں کہ اپنی نوع کا ایک دور ختم ہو گیا ۔" اور یہ ہے بھی بجا کہ حمید احمد خاں شخصیت نہ تھے ایک دور تھے جو ان کے ساتھ ختم ہو گیا ۔ مجھے احساس ہے کہ میری اس تحریر میں عدم تسلسل ہے لیکن اس کی وجہ محض یہ ہے کہ کبھی تو میرے ذہن میں پروفیسر حمید احمد خاں ایک انسان کے روپ میں آتے ہیں تو ان کی شخصی خوبیوں کو یاد کرنے لگتا ہوں ۔ لیکن ذہن کے دوسرے رخ سے وہی حمید احمد خاں ایک استاد ، عالم اور ادیب بن کر نظر آتے ہیں تو ان کی علمیت اور ادب نوازی کا تذکرہ کرنے لگتا ہوں ۔ اس عدم تسلسل کی وجہ جہاں میری گزشتہ آٹھ سالہ بنکاری اور ادب سے لاتعلقی ہے وہاں استاد گرامی کی گھمبیر شخصیت بھی ہے کہ تحریر میں نہ روانی ہے نہ تسلسل ۔

اس دنیاوی علم و ادب کی تکمیل کے بعد یوں لگتا ہے جیسے پروفیسر حمید احمد خاں "حیات بعد الممات" کے علم کی پیاس میں بہت دور چلے گئے ہیں جیسے کسی چینی شاعر نے ایک بچے کی وفات پر مرثیہ کہا تھا کہ :

"وہ بھونروں کی تلاش میں بہت دور نکل گیا ہے"

Twilight and evening bell,
  And after that the dark !
And may there be no sadness of farewell,
  When I embark ;

For tho' from out our bourne of Time and Place
  The flood may bear me far,
I hope to see my Pilot face to face
  When I have crost the bar.

THE FARAN

MAGAZINE OF THE ISLAMIA COLLEGE
CIVIL LINES, LAHORE

●

MEMORIAL ISSUE

●

Chairman of the Editorial Board
Professor IRSHAD-UL-HASAN

●

MARCH 1975

Vol. 17 No. 1

Printed by Mohammad Yaqub at the Himayat-i-Islam Press Lahore and Published by
Prof. H. M. Yaqub, Islamia College, Civil Lines, Lahore.

ILLUSTRATIONS

Professor Hamid Ahmad Khan	Frontispiece
A Letter of Recommendation by Iqbal	Facing Page 18
With the Staff Members (1962)	19
Professor Sirajuddin Addresses a Convocation	24
Hafiz Jullundari reciting his Poems	24
A Manual Work-Camp on the College Campus	25
Leaving on a Foreign Tour (1960)	40
Roaming through monuments of Classical Greece	41
With a Friend in Trafalgar Square, London	41
At the Africa-Asia Islamic Conference	64
With the Chinese Ambassador (1965)	65
At the Mausoleum of Ataturk	65

CONTENTS

In Memoriam	Professor Irshad-ul-Hasan	1
An Admirer's Homage	Professor Muhammad Amin Mughal	2
This Land of Ours	Professor Hamid Ahmad Khan	3
The Maker of Men	Maj. Siddiq Salik	7
Glimpses	Professor Akhtar-ud-din	9
Some Recollections	Dr. Mohammad Saleem	13
A Letter of Recommendation by Iqbal		18
In the Pages of the College Journals		19
A Perfectionist	Professor Eric Cyprian	25
Hamid Ahmad Khan of Pakistani Linguistics	Dr. Anwar S. Dil	26
The Young Ghalib	Professor Hamid Ahmad Khan	31
A Humanist Passes Away	Gp. Capt. S. F. Mahmud	38
A Rememberance	The Rev. W. G. Bailey	41
The Summer Vacation of 1938		43
Professor Hamid Ahmad Khan	Professor Khwaja Ghulam Sadiq	46
Shakespeare Quatercentenary Speech	Professor Hamid Ahmad Khan	55
A Letter of Condolence	Professor Basil Willey	58
Homage to a Friend	Professor Sirajuddin	59
Mian Bashir Ahmad	Professor Hamid Ahmad Khan	61
A Meaningful Life	Mr Hassan Habib	64
A Teacher There Was	Professor Iftikhar Ahmad	66
A Committed Teacher	Professor Razi Abedi	68
Professor Hamid Ahmad Khan— A Tribute	Syed Zulfiqar Ali Shah	72

PROFESSOR HAMID AHMAD KHAN
1 November 1903 — 22 March 1974

IN MEMORIAM

Professor Irshad-ul-Hasan

This Issue is a tribute to the memory of Professor Hamid Ahmad Khan, whose demise in 1974 was deeply mourned by the nation. A Cantabrigian and a former Vice-Chancellor of the Punjab University, he was a great educationist and luminary whose research on Iqbal and Ghalib is an important milestone in literary criticism. As founder-Principal of Islamia College, Civil Lines, he introduced post-graduate classes, founded English Study Circle and M.A. Library, gave impetus to research and co-curricular activities, fostered amicable ties among the faculty, narrowed the gulf between the teachers and the students, made the College campus enviably quiet and disseminated gospels of courtesy and self help through Good Manners Weeks and Community Development Projects. He burnished the image of the College and enriched its traditions by putting premium on talent and merit and attracting teachers of outstanding ability. He possessed, among other sterling qualities, transparency which, while it showed that he had a character with no need for cupboards in which to secrete skeletons, carved a niche for him in the hearts of all those who came into contact with him. His rare quality in this strident age was that there was no malice in him. He was a scrupulously courteous man of unimpeachable integrity. He had strong convictions and he expressed them freely with little regard to the cost. A perfectionist in morals, he was a purist in language. Painfully aware of the disintegration of the English language he invariably attempted in his writings to revive concepts of linguistic clarity and particularity in the face of conceptual generalisation. He meticulously undertook the difficult and lonely exercise of dispensing with self indulgent adjectives and redundant adverbs, paring experience down to the barest detail and leaving out all kinds of vagueness and inelegant structure. A conscientious and thought-provoking teacher, he enabled his students to step into a larger and more varied world, made them feel that the acquisition of knowledge was the beginning of an exciting adventure and that limitations, surprises, frustrations and grim realities invested life with challenging charm and fiery possibilities. His classicism, humanism and fastidiousness inspired his colleagues to engage in fruitful endeavour while his Promethean spirit blazed a shining trail for generations to follow. May his soul rest in peace.

An Admirer's Homage

Professor Muhammad Amin Mughal

A great humanist and a great teacher, Professor Hamid Ahmad Khan will be remembered with gratitude by many generations of young men and women who sat at his feet and by many others who had the privilege of working with him. Urbanity, finesse, correctness and the desire for perfection, inspired by a classical vision of the ideal, marked every moment of his conscious life. Work for him was beauty and he carved images of beauty in all that he said and in all that he did.

Behind the austere but thin exterior throbbed a passionate concern for humanity, which manifested itself in things great and small. His life long devotion to letters was a way of life with him, an instrument for the realisation ofhumanism. His vigorous personality made exacting demands on his colleagues but launched them on adventures which were only rewarding at the end. He was the last of the Augustans, who lived well and died without regrets.

———

THIS LAND OF OURS

Professor Hamid Ahmad Khan

This is from the opening chapter of an unfinished book on the Qaid-i-Azam which Professor Hamid Ahmad Khan was writing for young readers.

The present boundaries of Pakistan were fixed as recently as 1947. But it is an ancient land which had a civilization of its own more than 4000 years ago. I will not, however, go so far back into the pre-historic story of Pakistan. The part of the story that concerns you and me here is the coming of the Muslims to our land. One of the earliest Muslim settlements was at a place near which the largest city of Pakistan stands today.

The first Muslims came from Arabia in 711 A.C. They were followed by Muslims from many other countries, who spread over almost the whole of the Pak-Indian sub-continent. The Muslims ruled the sub-continent for more than a thousand years. They could do so because they brought a new social order and a civilization which proved its worth to all the peoples of the sub-continent. We may be justly proud of our glorious past, for we produced, during this period, kings and statesmen, scholars and saints, poets and artists, who were among the greatest ever seen in the world. The monuments of that glorious past may still be found all over Pakistan and Bharat.

Then, early in the eighteenth century, decay set in. It was at this ominous time that the British appeared on the scene as a rival power. They began with East Pakistan, where they struck us a great blow in 1757. They continued the process for another hundred years, until, in 1857, they were undisputed masters of the whole sub-continent.

I am sure you have all heard of the great Revolt of 1857. After that disaster the Muslims found themselves fallen on evil days. The British ruthlessly put them down in every walk of life. The Hindus gleefully came forward to help the British in this task. This was not unexpected. For, although individual Hindus and individual Muslims had made good friends, the two peoples had always lived apart. Their systems of life were not only distinct; they were opposed to each other in a number of ways. Between these opposing national groups there could be no union of the spirit as had taken place, for instance,

between Saxon and Norman in England. The Hindu, even after a thousand years of fellowship continued to regard the Muslim as an invader. He was, therefore, relieved to see the Muslim fallen from power. Now he felt was his own chance.

The British rulers distrusted the Muslims and, in the early years, even hated them. All responsible posts in the government were filled either by Britishers or by Hindus. The Muslims could not hope for any post "above the rank of porter, messenger, filler of ink-pots and mender of pens." The Hindus welcomed this opportunity, and got whatever they could from the British Government. Trade and industry passed completely into the hands of the Hindus.

The Muslims, on the other hand, were angry with the British. They sullenly kept aloof from the new rulers. They hated everything that had a British connection—even modern education. This attitude of theirs, more than anything else, brought them to the verge of ruin.

Then came the great Sayyid Ahmad Khan to uphold and guide a down-trodden and bewildered community. With his calm, clear judgment he grasped the whole situation, and went forward with his schemes for national progress and reform. He partly overcame British hostility, and then opened for us the way to modern education. He created a new literature—alive and healthy—and at the same time he gave us a new social outlook. Need I say that we are even now an impoverished and backward people? That does not, however, matter so long as we are determined on looking forward. We always look forward because Sayyid Ahmad Khan taught us to look that way. But for him our beloved Pakistan might have been only a far-off dream.

Not many decades had passed after the time of the great Sayyid, when the Second World War broke out, and it began to appear that the incredible was about to happen in our sub-continent. The mighty British Indian Empire shook and seemed undoubtedly to be heading for decay.

The Hindus had awaited such a crisis for two hundred years. Earlier in the eighteenth century, when Muslim Bengal was crushed on the battle-field of Plassy, they had eagerly hoped to turn the British victory to their own advantage, thinking that the time had come for the Hindus to sweep away the weakening Muslim power once for all. They had then got together a huge army and had marched on Delhi to put an end to the enfeebled Mughal power. This, however, was not to be. The Muslims had found a great leader in the person of Ahmad Shah Abdali, the Afghan king. Under his able command, the Muslims hit back

and utterly routed the vast Hindu force in 1761.

This had, however, happened long ago. Things seemed to be so very different now. The decay of the British power in the twentieth century brought a historic opportunity which electrified Hindudom as never before. The Muslims were now much worse off than they were two centuries earlier. They had been stripped of much of their eighteenth-century wealth—material, moral and intellectual. The Hindus, on the other hand, had grown fat on British patronage, and were at last strong enough to direct a powerful nationalist movement against British rule itself. If they could do *that*, surely the absorption of a distracted, disunited Muslim population was no big affair.

It was now that a world-wide propaganda was started that the Pak-Indian sub-continent belonged to the Hindus alone. Since 1857 the British rulers, too, had sided with the Hindus. They had, for reasons of their own, always promised to leave the sub-continent to the Hindus, if leave it they must. For this purpose they had invented the theory that the Muslims and the Hindus were really a single national group. The differences between the two, they said, were differences only in name.

Naturally, the Hindus welcome the one-nation theory. This they thought would enable them one day to rule even over the Muslim homelands in the sub-continent. 'Give us power" cried the Hindus, "And there will be no more Hindu-Muslim differences !"

Politically, the Hindus were never so well-organised as they were during the period 192 -1947. They had built their astounding economic prosperity during long years of systematic co-operation with the British. This prosperity was now equalled by the political strength which they gradually gained through a powerful National Congress of their own. Through this Congress they brought every persuasion and pressure to bear on the Muslims so as to make them feel that their only hope lay in a sub-continent united under Hindu rule.

The Hindus did not rest content with political organisation and propaganda alone. They went far beyond this. They started secret centres of military training on a vast scale. Under the cloak of physical training, these centres made fighting men of bands of Hindu volunteers who eagerly joined As the fateful moment of striking a blow drew nearer, more and more private armies were drilled all over the sub-continent. With the decline of British power, it seemed history was repeating itself. Exactly two hundred years before, the second Mahratta Peshwa, Baji Rao, had similarly spent a number of years in drilling and strengthening his army for a similar purpose. This was the army

that had finally marched to the battlefield of Panipat.

Except for this similarity on the Hindu side, the sub-continent presented a very different scene. The generation of Muslims that had fought the Third Battle of Panipat, was now dead and gone. We were now a battered and broken people, full of fear and without confidence in ourselves. Our utmost hopes clung round the Islamic countries beyond our own borders. If we strove, we strove for them, not for ourselves. Within us there was no hope ; before us there was no ideal. Listlessly we wandered from one political aim to another, for we had mentally resigned our own motherland to the would-be Hindu rulers of a united Pak-Indian sub-continent.

In 1930, when Iqbal demanded a national state for the Muslims of India, not even the Muslims could take him seriously. We were a people dead—or near-dead. Many of our intellectuals joined the National Congress of the Hindus. Many shuddered and bowed their heads down with a sense of impending fate, shuddered and awaited the inevitable doom. It appeared that the tragedy of Muslim Spain was once again to be enacted—this time against an Indian background.

And then the miracle of miracles ! There was a keen, clear call—

UNITY ! FAITH ! DISCIPLINE !

The dead and the near-dead arose at this call, and there *was* unity, and faith, and discipline !

The call was the call of Mohammad Ali Jinnah—a tall, spare man, who was growing old and had already passed his sixtieth year. He stood for his people alone but with unruffled brow, holding his lean hand against the congregated might of Hindu nationalism and British policy. This great leader combined in his person the fighting spirit of Abdali with the constructive genius of Sayyid Ahmad Khan. "The Man of Faith" for whom Iqbal's soul had thirsted, had come at last. He stood contending with Destiny for a rich prize. Destiny yielded ; the Man won. He won for us this Land of the Pure where you and I may live in peace and honour, and the coming generations may find a home.

———

THE MAKER OF MEN

Maj. Siddiq Salik

If I am asked to recall today, at the age of 40, one single teacher whose influence I have accepted most in life, I will unhesitatingly name Professor Hamid Ahmad Khan. When I reflect, on his first anniversary, what was his most outstanding quality, I am tempted to call him the maker of men.

Many things go to the making of a man : economic factor, intellectual guidance, moral influence, etc. I find that my late Professor's contribution expressed itself in all these dimenstons.

I know innumerable persons who, but for Professor Hamid Ahmad Khan's help, would have easily slipped into the muck of worldliness away from the realm of literature. In many cases, he was their single scurce of sustenance.

Although he was on the giving end, he never gave this impression to the recipient of his benevolence. He gave without injuring the dignity or self-respect of the man. His knowledge of human psychology, in this context, was deep and his ways to protect human sensibilities were superb. For instance, he asked a student to assist the college librarian in cataloguing and arranging the books. This was enough to pay his hostel expenditure. Another class-mate of mine was "requested" to spare one hour every evening to guide two school-going children of his wealthy friend. This "one hour" sacrifice of time covered all his monthly expenses. In another case, he "borrowed" the complete set of text books (for M.A. English) from a prosperous graduating student and "lent" it to a deserving student. (Lending is definitely different from charity).

Most of these beneficiaries were personally known to me. I also remember their reaction. They never felt that they were living on the charity of their teacher (later Principal and Vice-Chancellor) or that of his opulent friends. They rather considered it as their earning. They were, nonetheless, deeply obliged to him for "arranging" these sources of livelihood.

It may be added that Professor Hamid Ahmad Khan's patronage was not confined to the academically outstanding students. Probably, any Principal would have set a stake on the winning horse. But Professor Hamid Ahmad Khan was different. The boy might be average in studies but if the Professor was sure that, with some financial support, he would climb up he would give him a helping hand.

Again, Professor Hamid Ahmad Khan was not a patron of financially poor students alone. The rich equally benefited from his benignness. Only the cup was different. It was filled according to the need. Most of the rich students were relatively poor in the field of academics. He worked very hard on them to scratch off their crust of undue wealth with all its attendent ills, and injected, very carefully and discreetly, the value of learning in them. Many such sons of rich families finally turned out different citizens after two years' chiselling by Professor Hamid Ahmad Khan. While writing these lines, many such "converts" come to my mind. Their names hardly matter.

The poor and the rich alike drank from his cup of morality. It was probably necessary to give a proper shine to the product. His opening address to a new class always centred on morality and the same strain was kept up in his subsequent lectures. This at times earned him the title of a "preacher rather than a teacher". But it did not offend him. Perhaps, there was no fundamental difference between the aims of the two. Both worked for producing good citizens.

When having benefited from financial, intellectual and moral upbringing by the late Professor, one left the parlours of the college or university and fell upon the thorns of life, he found the world very different from the one Professor Hamid Ahmad Khan had prepared him for. It was a world of treachery and crookedness—shorn of all morality, the late Professor used to emphasize. Many of us, for instance, missed our chances for the Central Superior Services or other lucrative vocations because we, according to our Professor's sermons, believed that the sources of happiness lay within ourselves rather than in high office or social status. While we contented ourselves with reading Keats and Shakespeare, our contemporaries shot very high in life. Alas, we were not on a social island but lived on the same planet and, in certain cases, in the same cities and the same streets. The contrast was very sharp and the social compulsions very agonising. But we, the disciples of Professor Hamid Ahmad Khan, survived these jerks of society and did not have to regret very long.

I cannot say about others but I can vouch for myself that with time my faith in my Professor's teachings has deepened rather than shaken. Now I appreciate that he didn't prepare his students for temporary worldly gains but equipped them for their ultimate triumph over evil. I honestly believe that as long as good is regarded superior to evil, virtue to vice and the sublime to the mundane, the teachings of Professor Hamid Ahmad Khan will hold good.

———

GLIMPSES

Professor Akhtar-ud-Din

A tribute to Professor Hamid Ahmad Khan cannot but begin with the expression of deep shock and disbelief in the fact that he is no more. The death of noble souls, particularly when they are ensconced in the innermost recesses of one's heart, is repelled by the mind because it will not accept the unacceptable. I was one of his many young colleagues at Islamia College and could have little claim on his friendship because of the difference in age, maturity, learning, in short, in everything. And yet he never made me feel that because his culture bridged such gaps. He had a way with him to raise people, to make them feel important by pretending to receive favours when he conferred them. I often sat with him after my College work was over, not to seek self advancement from my boss, but because it was both instructive and delightful. His speech, whether he used English, Urdu or Punjabi—and he spoke in each one with equal facility and ease—was a pleasure to hear. The classical restraint of his style, its elegance, its chasteness, its beauty and the tremendous confidence behind every word had a charm all its own. Sometimes he would discuss an official letter written by me and there would begin a very fruitful chase after words ; from among a large array he would suggest one in each place and it was always the best. I have yet to come across a Pakistani whose judgement in the selection of words matches his. When I begged leave, he would thank me in such a manner that I felt embamassed for I knew I had done no personal favour. This is how he dealt with everyone.

He was so considerate towards others. He never wanted to hurt their self respect or sense of self importance. Even when he expressed displeasure his outer composure did not betray his inner agitation and this at times led to amusing situations. Once, an elderly colleague did something wrong and Khan Sahib's disapproval, couched in politely ironic terms, evoked a hearty guffaw from the gentleman. On another occasion a young colleague was inattentive to an important detail while making arrangements for a foreign scholar's lecture. Epidiascope was to be used and the colleague forgot to arrange a screen. Khan Sahib politely said "—— Sahib, will the pictures be screened on the black-board?"

The colleague, deceived by the quietness of Khan Sahib's tone, answered in the affirmative. Khan Sahib then said, "—— Sahib, I am being ironic".

Professor Hamid Ahmad Khan was a very thoroughgoing man. If he did not like others to take liberties with the spelling of his name, he took none himself with others'. His attention to minutia was superhuman. We ordinary mortals were often taxed by his attention to detail even while arranging trifles such as the pandal for a convocation. The gentlemen incharge of these arrangements felt that a greater trust should have been reposed in their efficiency and yet almost always Khan Sahib spotted and corrected omissions. This thoroughness was a way of life with him. Meticulous care in all that he did was the keynote of his life. Thus he made use of the hours of his life as a sacred trust for whose useful employment he was responsible to God.

The tremendous self control that this implies may make one assume that he was rigidly mechanical and lived an artificially contrived imitation of real life. But that was not so. Many were the occasions when the mask slipped off and the real Khan Sahib peeped out. The gusto with which he participated in fun-raising games and sports on College Day or during an excursion to Changa Manga or a cricket match against Government College Staff was revelatory. Then the legendary awe of Khan Sahib—and we all held him in great awe—made room for human contact when one could cut jokes and indulge in the all important informal trivialities which make the sum and substance of the lives of common mortals. He then laughed most heartily and entered into the fun of the moment.

A tough fighter when roused, he did not leave off till he had humbled his adversary but he never began the fight. And when his staunchest enemy wilted, he put an end to hostilities and was as gentle as ever. Far from gloating over his fallen opponents, he gave them a helping hand to put them on their feet again. Once, an old friend of his, forgetting the past years of their friendship, chose to oppose him in a petty official matter. Khan Sahib firmly stood his ground and when counselled to soften towards that gentleman in view of their past friendship replied that he believed in crushing snakes when he saw them. He was such a strange mixture of steel and wax. If you approached him as a suppliant you were never turned away disappointed but if you assumed a billigerent tone you came up against hard granite. He was particularly considerate towards his colleagues and did not turn down their requests even if they taxed moderation. A young colleague appeared in the C.S.S. examination secretly and the matter came to the notice of the Principal who was angry and wanted to take disciplinary action against that young lecturer. Khan Sahib, as Head of the English Deptt.

politely, in a cultivated voice, to pass John the salts. Englishmen are a strange amalgam of the conservative and the liberal, so was Khan Sahib. He stood for traditional values, had great fondness for our oriental past but he never opposed new things only because of their newness. Rather, he hated bigotry and was willing to accept new ideas. For his classical virtues he has been called an Augustan by a colleague ; moderation, propriety, elegance, economy, restraint he liked but he was broad minded enough to understand the younger generation, their problems, aspirations, conflicts and frustration and to sympathise with them. He did not oppose new ideas only because they ran counter to orthodox opinion but tested them on the anvil of reason and adopted them if proved sound. A devout Muslim who wrote a book on the Holy Prophet, he was not a fanatic and was attentive both to form and spirit, understood Islam to be dynamic and for all times and hence susceptible of interpretation according to the needs of the time.

Khan Sahib was the only great man that I had the good fortune to know and when I think of him, memories come crowding in upon me endlessly. But there is an end to everything and, strangely enough, Khan Sahib knew of his beforehand. On being asked by him over the telephone to come, Professor Irshad-ul-Hassan and I went to his office. It was some trivial service he wanted us to do and now that I think of it, it seems as if he wanted to give us an opportunity to meet him for the last time. During the conversation he was cheerful and we talked about objects of common interest and he even laughed at some of the pleasantries exchanged but when I casually remarked that after the humdrum life of a Vice Chancellor, his present occupation must be Gosha-i-Aafiat, he suddenly grew serious and said, "Akhtar Sahib, the only Gosha-i-Aafiat is the grave and I am waiting for it. At this time Tenny son's Crossing the Bar often comes to my mind. Do read it again when you go home". I not only read it again myself but asked my M.A. students to write an appreciation of that poem, little knowing the import of it. A few days later, it became clear when the sad news of his death came that he was aware of his approaching death and, besides hurrying through his unfinished work, was also bidding farewell to those of his acquaintance he could contact. Anyway, I am grateful to him for his gift of the last conversation.

Some Recollections

Dr. Mohammad Saleem

It so happened that once Professor Hamid Ahmad Khan took disciplinary action against a few students of the University. These students knowing well that practically no Vice-Chancellor would be strong enough to defy a Chancellor as strong as the late Malik Amir Muhammad Khan, went over to Governor's House and gave their version of the story. The Governor, after listening to the students, invited Professor Hamid Ahmad Khan to a meeting in which he proposed to thrash the matter out in front of the affected students. Professor Hamid Ahmad Khan, extra-ordinarily perspicacious as he was, lost no time in comprehending that the situation he was confronting was fraught with grave consequences and that his own reaction would be the decisive factor in the outcome. He, therefore, told the messenger of Malik Amir Muhammad Khan that it was in his capacity as Governor and not as the Chancellor that Nawab Sahib had invited him because in taking that step the Vice-Chancellor had never been consulted. He made it clear that no Chancellor should act without consulting the Vice-Chancellor. He conveyed a message to the Chancellor that such a meeting would lead to a lowering of the prestige and moral authority of a teacher in the eyes of the students, that he had no desire to participate in an act which would be fatal to the moral authority of a teacher over his students and he, therefore, would not come to that meeting. His principles were so dear to him that he did not hesitate to run the risk of his replacement as Vice-Chancellor.

Professor Hamid Ahmad Khan was a plainspoken and a straightforward person. Whenever he had any difference of opinion with his colleagues and others, it was always based on matters of principle. But he, would never allow any such difference of opinion to stand in the way of progress of any deserving person. Perhaps in 1948, when Mr. Ghulam Ali Chaudhry was a member of the teaching staff of Islamia College while Professor Hamid Ahmad Khan was the Head of English Department in the same college, there was a serious difference of opinion between the two which resulted in the resignation of Mr. Ghulam Ali Chaudhry. Mr. Chaudhry, thereafter, served in various colleges before he went abroad for further studies. When he came back from Edinburgh with a doc-

torate, Professor Hamid Ahmad Khan had become the Principal of the College. In spite of differences on matters of principle, Khan Sahib was always conscious of the qualities of Dr. Ghulam Ali Chaudhry as a man and a teacher. He, therefore, got an appointment from the College Committee for Dr. Chaudhry and accommodated him at a very good salary.

In 1958 when Professor Hamid Ahmad Khan became Principal he decided to do away with distinction between rich and poor students. He ordered that all the students of the college should wear one and the same uniform. It was a sight to see groups of students moving about in the college during the entire summer session, dressed in simple "militia" cloth. But when winter season arrived, poor students of the college found it very difficult to get the winter uniform made. Consequently college authorities supplied the students with blazer cloth at a cheap rate. Above all, needy students were provided money to be repaid in instalments for the purchase of winter uniform. In spite of this, one day when Professor Hamid Ahmad Khan was on his usual round of the college, he found a student without the prescribed uniform. Instead of threatening him with dire consequences, Khan Sahib took him along in his office and asked why he was not in uniform. Down came tears in the eyes of the student and sobbing he said that poverty did not permit him to purchase the college blazer. Khan Sahib immediately ordered that the student be provided with a uniform from the funds of the college. Such Principals who are moved by poverty-stricken conditions of their students are few and far between at present.

Probably it was in the year 1961 that a rumour was afloat that the Government College and F.C. College authorities were increasing their tuition fees. Without having confirmed this rumour Anjuman Himayat-i-Islam ordered an increase in the tuition fees of Islamia College and made it almost twice as much as was being charged at that time. For a number of months the students continued to pay their fees at the enhanced rate. When Professor Hamid Ahmad Khan came to know that the other colleges had not increased their fees, he advised the Anjuman to decrease their fees to the old level and return the excess fees received from the students. While Khan Sahib was still negotiating this matter with the Anjuman, the students became excited and in order to get the same demand accepted they went on strike. Khan Sahib was at his residence when he received this news. He immediately came to the college and submitted his resignation. He said that when the students were not prepared to rely on him, it was useless for him to remain as the head of their institution. The popularity of Khan Sahib can be judged from the fact that the entire teaching staff also submitted its resignation saying that without Khan Sahib they too would

not remain in the college. The students felt sorry on their over-zealousness and expressed their regrets to Khan Sahib. They vehemently insisted that he should withdraw his resignation. Under these circumstances the Anjuman had to hold its emergency session the same day and accepted all the demands of the students. On the sincere entreaties of the students, Khan Sahib withdrew his resignation.

Professor Hamid Ahmad Khan was self-confident and unassuming. When he joined the Punjab University, a senior officer of the University told him to remain conscious of his new office and avoid mixing with the staff of the lower strata. Professor Hamid Ahmad Khan told the officer that he was fully aware as to how a Vice-Chancellor should behave with his staff. He further told him that a Vice-Chancellor does not lower his status if he talks politely to a peon or a clerk. Pointing towards his own head and heart he said that the real greatness of a human being is only judged from these two sources. He said that to him no other criterion for judging the greatness of a man was acceptable. In this context it would be pertinent to mention that when as Vice-Chancellor he went to Abbotabad for spending summer vacation he gave a practical demonstration of this principle by dining at the house of one of the peons, Aziz-ur-Rehman, at his village near Abbotabad.

This reminds me of another incident. Hafiz Ahmad Yar, who is now a teacher in the University Department of Islamic Studies, did his M.A. in Arabic, probably in 1956. At that time he was a lecturer in Islamia College, Lahore and Professor Hamid Ahmad Khan was Vice-Principal. Hafiz Ahmad Yar, on finding an excuse for a get-together of his colleagues, invited them by circulating a list showing the names of the invitees. However, conscious of the superiority complex of his senior colleagues, Hafiz Sahib did not include their names in the list and went to them personally to extend the invitation for this get-together. When Hafiz Ahmad Yar approached Professor Hamid Ahmad Khan, he told him that although he had invited the teachers in writing, yet he was moving about personally to invite senior teachers. At this, Professor Hamid Ahmad Khan insisted that the invitation paper on which Hafiz Sahib had obtained the signatures of other teachers might be shown to him. Taking the paper from the hands of Hafiz Sahib, Professor Hamid Ahmad Khan wrote on it "Although my name is not included in the list of invitees, I insist to participate in this get-together and I hope that Hafiz Sahib will surely feel obliged to me for this participation !"

Professor Hamid Ahmad Khan, stands among the most distinguished Vice-Chancellors of the University of the Punjab. Perhaps only a few of them could match the qualities of head and heart possessed by him. It was impossible to get him deviated from what he considered to be the right path. It was this

salient feature of sticking to his principles that cost him the job of the Vice-Chancellor. This happened at the time when Malik Abdul Latif was the Provincial Education Secretary. He used to consider himself as the Chief Officer even above a Vice-Chancellor and wanted to grab the little semblance of university autonomy which was there actually in name only. Professor Hamid Ahmad Khan raised his voice against the attempts of the Education Secretary to treat any university as his handmaiden. This resulted in a tussle between the Education Secretary and the Vice-Chancellor which lasted till the last days of Ayub regime. When the Ayub regime was tottering, Musa Khan was acting as the Governor. At that time Malik Abdul Latif found an opportunity to strike. He manoeuvred things in such a manner that the Chancellor expressed his desire through him that Professor Hamid Ahmad Khan should proceed on long leave. Consequently Khan Sahib proceeded on long leave. Soon after he was asked either to resign or to get himself charge-sheeted by those who were high up on the ceiling. On this attitude of the Government, Khan Sahib got enraged and felt that it was absolutely indecent on the part of the Government to make such a suggestion. He, therefore, accepted the challenge, prepared himself to face the consequences and refused to resign. On the last day of the Governorship of Musa Khan, when he was to lay down the reigns of the Chancellor of the Punjab University, Malik Abdul Latif got a frivolous and preposterous charge-sheet issued against Professor Hamid Ahmad Khan in the name of Chancellor. That was perhaps the darkest day in the history of the universities of the Indo-Pakistan sub-continent ; this was the maiden attempt on the part of bureaucracy to charge-sheet an educationist Vice-Chancellor. But Professor Hamid Ahmad Khan did not take this challenge lying down. He rebutted this offensive with all the force at his command and gave a reply which shattered the authors of the charge-sheet. The matter would have gone on further and the framers of the charge-sheet would have had to face the consequences but the travesty of circumstances changed the course of events. The Government which wanted to proceed against Professor Hamid Ahmad Khan was toppled. Martial Law was promulgated and the new Chancellor felt in the interest of the Government not only to withdraw the charge-sheet but also to start negotiations, to patch-up the debacle, with Professor Hamid Ahmad Khan. Consequently Khan Sahib resigned from the office of the Vice-Chancellor. How much one wishes and prays that God may give such courage and fortitude to all the Vice-Chancellors to safeguard the autonomy of the universities and to take a stand whenever need be.

In 1958 when Professor Hamid Ahmad Khan took over as the Principal of Islamia College, Civil Lines, one thing which everyone of us noted about him was his scientific bent of mind. Whenever anyone made a demand, he would

immediately ask for the justification. He would never agree with a view-point until he was really convinced. And then he would use all powers at his command for its fulfilment.

Professor Hamid Ahmad Khan had a great yearning that scientific research should be carried out in our country. When he was the Principal of Islamia College, he thought of bringing out a scientific research journal of a good standard, so as to promote and encourage research. In this connection he approached various scholars asking them for giving research papers for publication in the said journal. By the time he was able to convince them, he was appointed Vice-Chancellor of the Punjab University. He was able to see at the University his dream come true in the shape of Journal of Scientific Research. This journal was supposed to publish regularly the research articles of university teachers and research workers belonging to other educational and research organizations. It continued as such for some time but, after the retirement of Professor Hamid Ahmad Khan, the condition of its publication became deplorable. At present the position is that no issue of this journal has been published for the last two years. It seems as if no one is interested. Although it was not a research journal of a very high standard, yet with a little effort on the part of the authorities it could have become a standard journal of repute. I am sure he will feel much happier in Heavens if we can arrange that.

These incidents give some glimpses of the personality of Professor Hamid Ahmad Khan. He was a very kind teacher whose heart was full of love for his students. He was a research scholar of an extraordinary calibre. He has created a place for himself in the realm of Urdu literature. He was a highly efficient administrator. During his tenure as Principal, Islamia College, Lahore attained special heights. After his retirement from the Punjab University, the image of this oldest seat of learning has been completely shattered. His intelligence and decency impressed everyone and above all he was a man of principle. Compromise was alien to him. He would never feel shy of uttering the truth before anyone, howsoever strong the authority might be. When he was a lecturer, no Principal could overawe him. When he became the Principal, the authorities of the Anjuman Himayat-i-Islam had always to bear the brunt of his bluntness. When he became the Vice-Chancellor, he fought for the autonomy of the University and took a stand against the autocratic bureaucracy. The light that he shed will always show and kindle the path of righteousness. Professor Hamid Ahmad Khan is no longer with us but his memory still glows in our hearts.

A Letter of Recommendation by Iqbal

The following letter was written a couple of months before Professor Hamid Ahmad Khan joined Islamia College, Lahore as a Lecturer in English in January 1934. At that time Professor Hamid Ahmad Khan was utterly untried and unknown as a teacher but notice the confidence expressed in the last sentence of this testimonial from the great philosopher-poet.

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M A., Ph.D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

24th Nov. 1933

My dear Shujauddin,

I write this on behalf of Mr. Hamid Ahmad Khan who, I understand, is applying for a post in the Islamia College. I have met him several times and have had opportunities of judging his scholarly attainments. I would advise the College Committee to appoint him. He is a man of scholarly habits and not very much suited to the post he is occupying at present in the accounts department. I have found him keenly interested in Literature and Philosophy and I have no doubt he will be quite a successful lecturer on English Literature and Philosophy. Besides, unlike many a Muslim youngman of our day he is very enthusiastic about the Cultural history of Islam. I am sure his contact with Muslim youngmen will do them a lot (of) good.

I would like to see more Muslim teachers like him.

Yours sincerely,
Sd/- Muhammad Iqbal

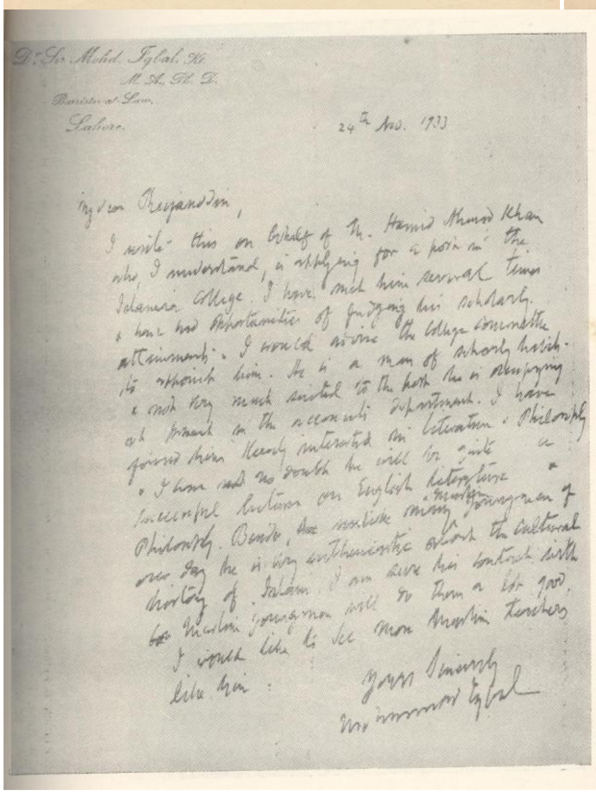

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A., Ph.D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

24th Nov. 1933

My dear Shujauddin,
I write this on behalf of Mr. Hamid Ahmad Khan who, I understand, is applying for a post in the Islamia College. I have met him several times & have had opportunities of judging his scholarly attainments. I would advise the College Committee to appoint him. He is a man of scholarly habits & not very much suited to the post he is occupying at present in the accounts department. I have found him keenly interested in Literature & Philosophy & I have no doubt he will be quite a successful lecturer on English Literature & Philosophy. Besides, unlike many Muslim youngmen of our day he is very enthusiastic about the cultural history of Islam. I am sure his contact with Muslim youngmen will do them a lot good. I would like to see more Muslim teachers like him.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

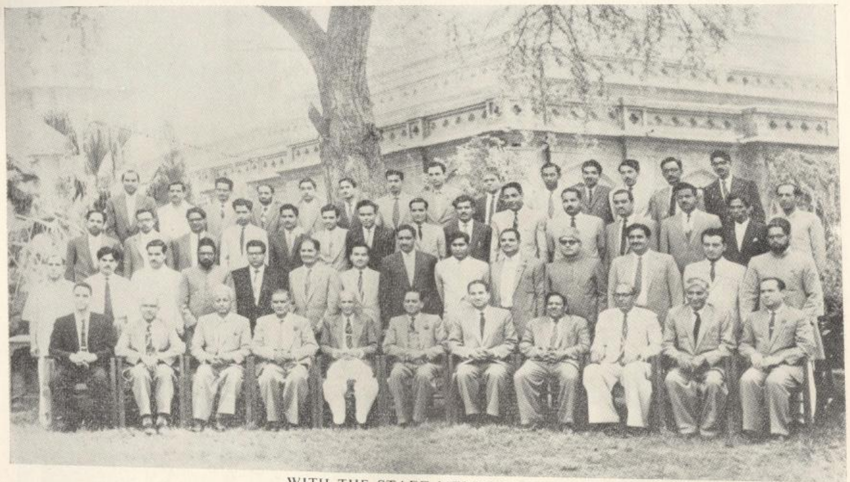

WITH THE STAFF MEMBERS (1962)

L to R : ● J. Lehrberger, S. Ali, C. Hasan, S. Ullah, A. H. Beg, H. A. Khan, K. G. Sadiq, E. Cyprian, Shamsuddin, K. Siddiq, S. A. Rashid ● T. Butt, K. Waheed, I. Hasan, I. A. Siddiqi, M. Nasir, S. M. Yameen, Akhtaruddin, M. Ahmad, M. Yasin, G. M. Din, A. I. Kamali, W. Qureshi, A. B. Ghaznavi, A. Yar ● S. Hilal, N. Ahmad, A. Ali, K. Ahmad, S. Safdar, S. Ahmad, A. R. Beg, A. Farooq, S. Hussain, M. Safdar, D. B. Mirza, F. H. Bokhari, R. Sheikh, S. B. Rizvi, E. J. Ansari ● M. H. Siddiqi, K. M. Rafi, P. Mohammad, H. A. Haq, M. Maruf, S. Ahmad, R. Ali, M. Israr, A. K. Abdullah, Z. A. Qureshi, H. A. Kidwai, M. M. Wasim, A. Ahmad, M. A. Mughal

In the Pages of the College Journals

Reproduced below are a few writings of Professor Hamid Ahmad Khan which appeared in the pages of the *Crescent*, the *Faran* and the *Islamia College Bulletin.*

<u>*AN EDITORIAL*</u> (the *Crescent*, March 1949).

We bid good morrow to the New Year in a more cheerful mood than we had been able to muster in the years immediately preceding. Our present optimism springs from known and tangible causes—our achievements in 1948. For one thing, we vindicated ourselves as a nation in the eyes of the whole world. Our moral fibre was tested when, at a most trying time, God in his wisdom thought fit to take away the Qaid-i-Azam from our midst. The East and West watched us as we stood with heads bowed in grief at the great calamity of September 11th. Our friends feared—and our enemies hoped—that we might fail and stagger and fall. For the hand that had guided and sustained us for years was lapped in the dust of the grave. But no craven heart quaked, no faltering voice disturbed the greatness of that awful hour. We stood up to that crisis with the grim determination which had linked us with the Great Leader. That was a solid gain which came in the wake of a most grievous loss. And our hearts are raised in gratitude to God who was with us throughout those solemn days of national sorrow.

Far humbler, but no less pure, is another source of satisfaction. We refer to our come-back as an educational institution. About three years ago we stepped forth from the shadow of our walls at the call of the nation. Our struggles and achievements in that glorious cause are now a part of history. So no more of that. Yet there is something else that must be mentioned—the way we switched back from politics to academics. We do take pride in that performance, as who will not ? For when once the floods are out, their flow is not easily coaxed back into the original channels. Great praise is due to the zeal of those quiet workers of the College Staff who made the miracle possible. Our educational life is now perfectly normal in its adventures among books and ideas. Once more the cloistered study and the midnight lamp ! Indeed, if there can be too much of a good thing, we would say there is now too much of seriousness. At one of our bigger gatherings in the College Hall, a friendly critic among visitors protested to

us : "There is much too much of discipline here. These boys are reprehensibly well-behaved !"

Behind this transformation is our new Principal, Dr. M. D. Taseer, who joined the College in September, 1948. We give him greetings and our best wishes. We should have liked to bid him welcome much earlier. But good wishes never come late and, in any case, we feel sure the Principal would not mind the delay, for the *Crescent* and he are old friends. We can almost hear him say with the well-known merry twinkle in his eyes : "Better late than never !"

H. A. K.

<u>*A POSTSCRIPT*</u> (the *Crescent*, November-December 1950).

[The November-December 1950 issue of the *Crescent* was already in the press when Dr. Taseer died suddenly on 30 November 1950. The following was inserted as a postscript in that issue.]

God has in His wisdom stricken us with a great sorrow. Our beloved Principal, Dr. M. D. Taseer, is no more. He was suddenly taken away from us on the black morning of the last day of November. His death came to him, as to us who loved him like a stab in the darkness of the night. Our own first reactions were shock and anguish. Yet when we went up to his beside and uncovered his face, he seemed to be quite content. So let him rest in eternal peace.

This blow has touched our life at many levels and in many spheres Think of his family—Salman, Maryam, Selma, Begum Taseer, think of the Islamia College, think of the Punjab University, think of this City of Lahore, of this province and this country,—the political chess-board, the cultural diapason ! It has been like a stone flung in the deep Pool of Sorrow ; the dark waves that have arisen in ever-widening concentric circles seem to go on without end.

It is said that a void is repugnant to Nature ; but the void created by a human being must for ever remain unfilled. Which Man can ever replace another Man ? Personality is unique, everlastingly unique. And Dr. Taseer's personal uniqueness was so utterly overwhelming.

He is gone when he was at the very peak of his great powers—pulsating with life, vibrant with energy, in the midst of the turmoil of affairs. It is difficult to believe that he is really dead. Death and Dr. Taseer were so incompatible ! And yet, during the last days, he had sometimes, in his own smiling way, complained of the heavy strain of

work on himself. So at last that strain is over ; there is no more work for him to do now. May he rest in God's mercy for ever and ever !

(It may be mentioned here that the well-known Taseer Number of the *Crescent* was brought out by Professor Hamid Ahmad Khan in February-April 1951. The 350-page Taseer Number is not only a lively portrayal and a tribute to Dr. Taseer but also a beautiful literary endeavour.)

A FOREWORD (the first issue of the *Faran*, April 1959).

[In accordance with the national reforms in education at that time, Islamia College, Lahore was bifurcated in 1958. The Civil Lines campus was allotted to the degree part and the Railway Road campus to the intermediate portion. The *Crescent* remained at the old campus and the degree college brought out a new magazine in 1959, namely the *Faran*.]

I am grateful to the Editorial Board of the FARAN for affording me an opportunity to address a few words to readers of this first issue of the College Magazine.

May I begin by observing what a great pity it is that the printed word—and the whole array of wonderful mechanical contrivances for increased human intercourse—should have in effect reduced occasions of living contact between man and man. The teacher has receded into the shadow. The book looms larger in the foreground. Had this not been so, it would have been easier to see through the popular delusion that education is no better than book-learning. Book-learning is one of the intermediate stages : the goal of education is adjustment of human relationships. Socrates, Ghazali, Erasmus—all teachers in all times and places, thought of education in these terms alone.

We moderns have resorted to education on an industrial scale. The human touch is gone, or all but gone. On this account, we should all the more remember that in teaching and learning we are striving for the attainment of certain essentially human values. In the scale of values there are some which are not our very own : we share them with others. Efficiency, for instance, we share with the machines ; power, with the beasts ; and wisdom, of course, belongs to God. Culture, however, is essentially human. It is the most precious of our own creations. Unless our education makes us cultured men, it is not worth the scraps of paper on which it comes to us.

Culture is a matter of adjustment within us and without. Our own being must be inwardly balanced before we seek a balanced relationship with the living beings around us. Let us regard education as a preparation for these inward and

outward adjustments. If our sense of discipline is passing from control to self-control, we are educating ourselves. If we are eliminating unnecessary resistances, we are educating ourselves. If we are not treading on other people's toes —mentally as well as physically—we are educating ourselves.

A hundred years ago culture was defined by a great Englishman as sweetness *and* light. We have had enough of light, I think Let us have some sweetness now.

10 March 1959 *HAMID AHMAD KHAN*

A POSTSCRIPT (the *Faran* January—February 1962).

[Professor Hamid Ahmad Khan became Principal of Islamia College in May 1958. As a man and as a scholar, as a teacher and as an educationist, he cherished some things. One of the foremost among these was the sanctity (and the importance of this sanctity) of the academic life and the teacher-student relationship. He worked hard, day and night, for his goals. His achievements were many and are well-known. His Colleagues and his pupils loved him. But on 31 January 1962 his efforts suffered a setback when a few students of the College, without taking the Principal into confidence, organized a demonstration on the streets of Lahore (on some issue against the Anjuman-i-Himayat-i-Islam). Professor Hamid Ahmad Khan resigned from Principalship, and although his colleagues and his pupils and the Anjuman succeeded by late evening in making him agree to stay, yet he was terribly hurt and aggrieved. Next day, when he returned to College, he addressed the "family" in the following words. (This whole incident is recounted by Professor Sajjad Baqir Rizvi in an article in the Urdu Section of this issue).]

POSTSCRIPT

(Principal's speech at a College meeting held on 1 February 1962)

It is with a sorrowing heart, and as a much older man than I felt only a day before, that I come back to the College today, seeking a spark of honour in the dust and ashes of yesterday. Yesterday, the hand of murder shot out—in the dark, as it always does—and at one blow killed that which we had held dear, that which we had reared in months and years of toil and travail.

My confidence in the goodness of our young men is shaken. The spirit of evil has gone forth over the streets of Lahore to besmirch the bright name of the College and blacken it in the eyes of the world. All around is now a scene of

disgrace abounding even for the best amongst us.

We had a name, and a flag—until yesterday. Let us lower this flag in keeping with our new status. Let it fly half-mast to mourn the loss of all that we cherished until yesterday—honour and a fair name, good manners and civilized conduct and mutual affection, and a state of blessedness attained through service.

Some students and some teachers at least will understand, and feel the sadness that is in my heart. With me, they will bow their heads in grief and shame.

We will observe this day as a day of mourning.

A MESSAGE FROM THE PRINCIPAL (For the first issue of the *Islamia College Bulletin*, 19 September 1959).

I am glad to give fellow-members of the College my good wishes and greetings on the appearance of our College *Bulletin*. For this happy event we are beholden to the initiative of two enterprising spirits among younger members of the teaching staff.

When the College entered on its present graduate phase, some of us dreamed of building an institution which, at least in terms of moral discipline, would have an Islamic character. But dreams are intangible things, and do not always change into reality overnight. Our progress has been slow and painful, and yet no one will deny that we have kept moving forward. *The College Bulletin* is undoubtedly another step forward.

It is another step forward because it brings us a little nearer to our original aspiration of making the College what it ought to be. A College is a place where like-minded persons *work together* for the attainment of common ends. A College is at once a family and a civilized community. It is a family because members of a College are bound to each other by a vital, human relationship. It is a civilized community because members of a college work, not as individuals (not merely as *a* lecturer or as *a* student), but as an organized and purposeful group conscious of its complete, composite personality—a group which functions constructively in the interest of all—is considerate for individuals, but never for a moment forgets the whole. In order so to function members of a college must *know* each other and must face common problems in consultation with each other.

The College Bulletin is going to put us in touch with each other. Let us make full use of the opportunities the *Bulletin* opens to us. With the necessary

goodwill on our part, the *Bulletin* will help foster in us a sense of belonging to the College and to each other.

This is what makes the appearance of the *Bulletin* an auspicious event. Slowly, but surely, the College is forging itself into an instrument of corporate activity.

A NOTICE (the *Islamia College Bulletin*, 23 September 1961).

Attention of members of the College is invited once again to the good old Pakistani tradition which makes a greeting to each other in the morning, and later in the course of the day, the *sine qua non* of decent behaviour. I am sure we can all indulge in this essential kind of courtesy without much cost to ourselves. From younger people to their elders the customary Islamic *salaam* is almost a religious injunction. Our College takes disciplinary notice of disregard of this duty.

I expect every student to set, and leave behind, this particular example of civilized conduct for generations of Islamia College students who will follow.

PROFESSOR HAMID AHMAD KHAN,
Principal.

TO A STUDENT OF THE COLLEGE (*the Islamia College Bulletin*, 29 *March* 1963).

To "A student of the College"
who sent me his 'Id greetings "incognito"

Anonymous letters are not welcome as a rule, and are better left unanswered. But there are exceptions to every rule and I am going to make one in your case.

I was both surprised and pleased to get your extremely cordial and respectful greetings on the occasion of 'Id-ul-Fitr'. Please accept my thanks and kindest regards in return. I wish it were possible for me to be more specific and to indulge in details as you have so affectionately done. The opportunity is denied to me since you have chosen to appear under a mask. But you are certainly a person in the College, and I may, therefore, venture through this notice to communicate to you my very best wishes for your health and happiness.

13th March 1963. PROFESSOR HAMID AHMAD KHAN,
Principal.

———

Professor Sirajuddin addresses a College Convocation

Hafiz Jullundari reciting his poems in a College Function

A MANUAL WORK-CAMP ON THE COLLEGE CAMPUS

The Principal Professor Hamid Ahmad Khan and Professor Eric Cyprian

From L. to R. Professors S. Abu Bakar Ghaznavi, K. G. Sadiq, Irshadul Hassan and G. Mohiyuddin

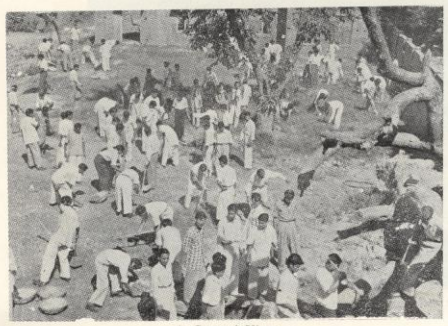

A General View
The Tuck-Shop (under construction) is in the background

A PERFECTIONIST

Professor Eric Cyprian

Professor Hamid Ahmad Khan was the embodiment of some of the best qualities of the East and the West. Both as an administrator and as a scholar he was guided by the rigorous standards of the West and by the best in the traditions of the East. What impressed most in him was his passionate and meticulous attention to details. Whether he was drafting a letter, organising a formal ceremony of the college, or just arranging a routine meeting, he would take infinite pains to get things just right. He would be most precise in his instructions and supervise everything himself down to the last minute detail, leaving nothing to chance. In all his work he made heavy demands on his subordinates, but he never spared himself in seeing that work was carried as planned. He was impatient of shoddy work done half-heartedly or carelessly. It was this quality that made Islamia College during the years that he was its Principal, one of the best colleges in the country.

Although he sometimes appeared to be a martinet, he had a wholesome hatred of bureaucratic methods, and under his stern exterior there always beat a very tender heart. He made all his subordinates work hard, but he was always mindful of their needs and feelings especially of his menial staff. His sympathetic care and regard for those who had the good fortune to work under him came from a deep genuine human feeling for those who were less fortunate than himself. Poor students, people in distress and all those who were in any kind of need were always certain of finding in Professor Hamid Ahmad Khan a helpful friend who would go out of his way to render what assistance he could to relieve distress.

Khan Sahib was primarily a scholar, devoted to the things of the mind. His contributions to the development of Urdu, his criticism, his labours as an inspiring teacher are too well known for me to say much on this occasion. In his literary work he was a perfectionist, never satisfied with second rate work.

Professor Hamid Ahmad Khan belonged to a class which is rapidly disappearing from Pakistan and with his passing away it seems to me that a whole epoch of humanist scholarship has also passed away.

Hamid Ahmad Khan Of Pakistani Linguistics

—Professor Anwar S. Dil

Hamid Ahmad Khan (1903-74), well-known for his distinguished contributions to Pakistani education and literature, was a language scholar whose active involvement in the sociolinguistic affairs of his country assure him a prominent place among Pakistani linguists.

Born in an eminent literary family of Wazirabad, Panjab, he was educated at the local Church of Scotland High School where he came in contact with the famous British linguist Grahame Bailey whose studies in Panjabi language, in particular, inspired Hamid Ahmad Khan (somehow he was generally called by his full name) by awakening his interest in studying language as a socio-cultural phenomenon and in learning a language well. Bailey had learnt Panjabi with such facility and distinction that it must have inspired Hamid Ahmad Khan to learn English with equal competence. For Urdu he had his elder brother Maulana Zafar Ali Khan, a brilliant poet and orator, as a challenging model. In his time Hamid Ahmad Khan acquired an enviable command over Panjabi, Urdu and English, a good knowledge of Classical Persian and Classical Arabic, besides a working knowledge of a number of languages and dialects of the sub-continent. For his bachelor's degree he went to Osmania University (Hyderabad, Deccan) where his love for Urdu received new stimulus in a literary and cultural climate in which the cultivation and promotion of Urdu language was highly valued. For his master's degree in English language and literature he studied at the Government College, Lahore, where he was introduced to phonetics and social dimensions of language behavior by J. R. Firth. Later he earned an M. Litt. degree from Cambridge University.

Hamid Ahmad Khan started his teaching career at Islamia College, Lahore, in 1934, and in course of time became known as one of the most distinguished teachers and scholars of English in the province. His love for Urdu language and literature was expressed through his active participation in literary organizations, his founding the Bazm-e-Farogh-e Urdu (Society for the Promotion of Urdu), and contributing essays in literary journals such as *Humayun*, *Makhzan*, and *Adabi*

Dunya. He was an active member of a distinguished group of writers and promoters of Urdu language, including, among others, Mian Bashir Ahmad, Maulana Salah-ud-din Ahmad, Syed Muhammad Abdullah, Justice S. A. Rahman, Hakim Ahmad Shuja, and his brothers Professor Mahmud Ahmad Khan and Maulana Hamid Ali Khan.

It would be no exaggeration to say that he was associated with almost all the language committees and boards dealing with the development of Urdu as the national language of Pakistani, e.g., the Central Board for the Development of Urdu, the Official Language Committee, the Urdu Academy, the Anjuman Tarraqi-e-Urdu.

While Hamid Ahmad Khan recognized the importance of linguistic studies and research per se, his own interest in this field was limited to seeking a scientific basis for what he called "the inherent unity" of various languages and speech varieties in Pakistan for the overall purpose of achieving a national cohesion in the newly carved nation-state in search of its identity. He was quite convinced that Urdu was the only medium for such national purposes but he was also aware of the complexity of problems involved in meeting the challenge of developing such a role for Urdu in Pakistan. He favored a policy of developing closer contact and exchange between Urdu and Pashto, Sindhi, Baluchi and other languages spoken in Pakistan ; upgrading the role of Arabic, Persian, and Turkish as the languages of Pakistan's literary and cultural traditions and Islamic heritage ; and adopting a bold approach to English and other international languages for wider communication and modern-scientific and technological development. He believed that a pragmatic language policy for Pakistan's progress must reconcile the respective claims of these elements, and through this approach he aspired to bridge "the historical gap between our classical culture and the new learning."

His determined support for a change-over to naskh script for Urdu was part of this overall policy. He was opposed to the introduction of Roman script for Pakistani languages but saw no reason why Urdu and Punjabi nastaliq script should not be changed to naskh which could then become the standard for all Pakistani languages. I remember his enthusiastic response to Fathollah Mojtabai's presentation at the Second Pakistan Conference of Linguists describing the change-over from Persian nastaliq to naskh resulting in remarkable progress in literacy and reading among Iranian students. Hamid Ahmad Khan in his comments on Mojtabai's recommendation that such a change was over-due in Pakistan, said : "I cannot over-emphasize and cannot really give enough praise to what Mr. Mojtabai said about the desirability of a change in orthographical

methods in West Pakistan. As a matter of fact, apart from the scientific efficacy of that move, some of the regional languages are already using naskh. It is only unfortunate that Urdu prefers nastaliq. Pashto and Sindhi are written in naskh and there is no reason why Urdu and Panjabi should not change to the other script. There are good scientific grounds for doing so." (1964)

Hamid Ahmad Khan's committment to the language problems of Pakistan is shown in his paper on the common structural basis of Urdu and Panjabi, presented to the First Pakistan Conference of Linguists (December 1962) and his presidential remarks at the symposium on the development of linguistic studies and research in Pakistan (January 1964). He believed that scientific knowledge and techniques should be "as purposefully applied to the study of language as to other departments of nation-building activity", and in his paper made a call for this approach to be applied to all languages of Pakistan to show the basic linguistic unity of the country despite its apparent diversity. He saw two basic elements underlying this unity : "the ancient native substratum of Indo-Aryan origin, and the neo-cultural superstructure of Arabic and Persian." To illustrate the "surprising degree of homogeneity" between Urdu and Panjabi he pointed out the remarkable continuum of Panjabi dialects from Rawalpindi to Ambala and from there southeastward to Saharanpur and Delhi a rising gradation of Urdu elements. Referring to a study of the process of reduplication by Iftikhar Ahmad (1962) who had noted close resemblance between Panjabi and Urdu as far as the syntactic behavior of reduplicates is concerned, Hamid Ahmad Khan proposed that similar investigations of rules governing tense, gender, and number, for example, would show remarkable similarities between the two languages. In this context he made references to Hafiz Mahmud Shirani's classic thesis that Urdu originated in the Panjabi-and Sindhi-speaking areas and Pandit Dattatarya Kaifi's claim that the lexical content of Waris Shah's *Heer* is in essence the same as that of early 19th Century Urdu. But he did not challenge Sir George Grierson's and Masud Husain Khan's view that Urdu and Panjabi, in their origin, are two different languages, and carefully concluded his argument thus : "Whatever may be the correct historical position, the fact remains that Old Urdu reads surprisingly like Panjabi."

In his 1964 presentation, however, he made a more categorical observation that Urdu and Panjabi were structurally one language up to the 14th century and that the bifurcation came in the 15th century and that an historical study of the structural development of Pakistani languages will establish this viewpoint. In this context he made another interesting remark that Urdu is "an India-based language" and "ultimately we do not want in this country to have India-based languages." He challenged the Pakistani language scholars to

consider how it could be done without causing a break in the tradition. What was really intended by these remarks was to highlight the problem of standard language and prestige norm of Urdu speech and writing in Pakistan that has continued to be Delhi, Lucknow or Hyderabad Deccan varieties. It was a call for scientific investigations in the process of language standardization in Urdu (and other Pakistani languages) for purposes of identifying features of Standard Pakistani Urdu. I am aware that these remarks were the subject of several critical comments especially among some Indian and Western scholars but it must be said in all fairness that Hamid Ahmad Khan's point was not understood in its proper context. But then he was at times misunderstood even by his close associates. For example, during the Urdu Conference in February 1959 when he tried to work for a settlement between the supporters of Urdu and the regional languages, Mian Bashir Ahmad of *Humayun* confronted him with the quip : "Et tu, Brutus." Interestingly, this anecdote was narrated by Hamid Ahmad Khan himself in his last published talk. (Dawn, April 6, 1974.)

In his presidential remarks at the symposium on the development of linguistic studies and research that was held as part of the Second Pakistan Conference of Linguists (Januar 1964) he discussed at length the Language Unit established in 1958 at University of the Panjab. Hamid Ahmad Khan was closely associated with its establishment and development plans. The Unit was projected as a pilot experiment to establish linguistic programs in Pakistan. In spite of the fact that at least three eminent British and American linguists had full-time appointments with the project and some interesting research studies were initiated, no serious effort was made by the Unit to integrate itself as a Pakistani undertaking. The Unit had to be wound up in 1962 and it must be said here that it was a serious blow to the development of linguistic programs in Pakistan. Hamid Ahmad Khan, for whom it was like a shattering of a bright hope, summed up the problems that led to the failure of the Language Unit in these words : "Somehow the Language Unit so withdrew its activities into itself that, apart from the immediate neighbours of this department inside the university, people outside did not know much of what was happening and naturally enough, did not derive much benefit either. Also difficulty arose, I think, because most of the work was concentrated upon the teaching of English and the techniques of teaching English were not extended to the teaching of national and regional languages. Had we started work on the languages of this area, Panjabi, Sindhi, Pashto and Urdu, perhaps the work of the Language Unit could have proved more fruitful."

After he became Vice-Chancellor of the University of the Panjab in 1963, Hamid Ahmad Khan made several attempts to establish a linguistics program at Lahore. He appointed a Committee on Linguistics to look into the matter. I

recall participating in the first, and perhaps the only meeting of this committee. One of the items on the agenda was the discussion of my proposal for a certificate and diploma course in linguistics in collaboration with different language departments of the university. Vice-Chancellor Hamid Ahmad Khan wanted very much to establish a research-oriented university department of linguistics and as he discussed some of his plans with me on a number of occasions it might have been possible but for the lack of support among his colleagues and agencies such as the Ford Foundation and the British Council, mainly because of their unfortunate experience with the Language Unit.

As Vice-Chancellor, Hamid Ahmad Khan had the satisfaction of successfully sponsoring such prestigious literary projects as the Cultural and Literary History of the Muslims of the Indo-Pakistan sub-continent and the Majlis-e Yadgar-e Ghalib (The Ghalib Memorial Society). One of his contributions could have been the establishment of linguistic teaching, training, and research programs at Pakistani universities coordinated by the Inter-Varsities Board or some other central organization to ensure a solid supportive base for scientific research on Pakistani languages and language policy planning. Those who knew him must remember how he strove for over fifteen years to establish such a nucleus at the University of the Panjab. He aspired to make Lahore once again a great seat of linguistic studies it once was in the pre-independence days. This was one of his dreams that did not come true. But his efforts to establish the importance of an area of research so vital to discovering the elements of the national oneness of the Pakistani people, assure him a place in the history of Pakistani linguistics.

THE YOUNG GHALIB

—Professor Hamid Ahmad Khan

This is Chaper Two of an unfinished book on Ghalib by Professor Hamid Ahmad Khan. This was written in November 1973.

اے نوا ساز تماشا ، سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

شمع ہوں لیکن بہ پا در رفتہ خار جستجو
مدعا گم کردہ ہر سو ہر طرف جلتا ہوں میں

O Thou Who filled this goodly mart
With things that bless the eye,
In me there glows a bitter smart—
On one side burns my heart
And on the other I.
I know I am a candle bright :
Flame of eternal quest—
I have nor end nor aim in sight,
Throwing this way and that my light—
No purpose and no rest.

1

Ghalib's earliest verse was written sometime about 1807, when he was ten years old. This early verse was composed in Urdu, but a few years later (probably in 1811) he began experimenting with Persian verse as well.*

As is well known, Persian remained officially the undisputed literary language of the Indo-Pakistan sub-continent till the time that the Emperor Aurangzeb died in 1707. Towards the close of the second decade of the eighteenth century Urdu poetry received royal recognition, and was freely quoted, recited and composed even at the Mughal court. The Emperor who set the seal on this linguistic revolution was Mohammad Shah (1719-1748). This literary change had been given a start much earlier—in the sixteenth century by poets of Southern and Central India, but the newly adopted literary medium travelled up north (under the auspices of Wali of Gujerat) only in the eighteenth century. Once the new

*Iqbal did the same a hundred years later in Lahore.

fashion received the approval of the Emperor, it was immediately popular in the city of Delhi, and the creation of a new language for poetry began.

Naturally, the greatest amount of attention was given to the polishing of the new verse (then described as Hindi or Rekhta), so as to give it the finish and grace of the set patterns of Persian verse. The lucidity and sweetness of expression in Urdu verse, which the Dekani (South Indian) poets had initiated, matured in the course of a hundred years in the verse of prominent Delhi poets, like Hatim and Dard, and was finally established by the great master, Mir Taqi.

Besides this one-century-old tradition of smoothness and euphony in Urdu poetry, there existed another literary approach—very different from that of the Urdu poets and, indeed, one diametrically opposed to naturalness and clarity. This was the approach of the seventeenth century Persian poets—the so-called خیال بند or "metaphysical" poets—who insisted on complexity of thought and quaint imagery, preferring the strikingly original and the incisively analytical. The favourite figure of these Persian "Metaphysicals"—as that of their English counterparts about the same time—was the "conceit". The great masters at the turn of the century were Mirza Jalal Asir and Shaukat Bokhari and, inside India, Mirza Bedil of Azimabad and Nasir Ali of Sirhind. The critical canon of this school of poets, as cited by the author of مراۃ الخیال was : "Good poetry has no meaning".

2

The first thing to note about the early Ghalib is that although he writes in Urdu, his models are not Wali and Mir, the Urdu poets, but seventeenth century Persian poets like Asir and Bedil. In the verse of these early years Ghalib seems to be utterly oblivious of the fact that someone called Mir Taqi (1723-1810) had preceded him. This hard fact had inevitably to be reckoned with by younger writers for, during Mohammad Shah's reign a great gulf had been fixed between Persian literature on the one hand and the literature of the Indo-Pakistan sub-continent on the other. The poetic labours of the eight decades that followed Mohammad Shah's surrender to native usage made the gulf virtually unbridgeable. And yet, as soon as Ghalib appears on the scene we find him nonchalantly trying to put a bridge across the great gulf.

This challenge from a raw youth—a mere boy—to the skilful workmanship of generations of poets, was doomed to failure. The plain fact was that Urdu had replaced Persian as the literary medium of the people. The poetically-minded public of Agra and Delhi turned round and jeered at the fantastic conceits and outlandish jargon of the young rebel. Ghalib himself retraced his

steps, probably during the period 1816-1818, but his profound spiritual kinship with the genius of Persian language and literature held fast. Soon after his surrender to the Urdu tradition, he turned his back on Urdu verse and devoted himself exclusively to writing in Persian. (The Persian *Kulliyyat* is five times bigger than the Urdu *Diwan*). Even when he turned back to Urdu in the eighteen-fifties, the strong link with Persian remained unbroken. This aspect of cultural identity apart, it is good to remember that Ghalib's return to Persian did not go in vain. He successfully interrupted a movement in history. Had he not stoutly disrupted the line leading from Wali and Mir to Zauq and Dagh, Urdu literature would be different from what it is today. What is more, he opened the door for Iqbal to come in during the next century.

Ghalib's great feat in the history of language and culture was the renewal of a link between his people and their past. Exactly a hundred years after the death of Aurangzeb, he takes a long jump back to the position where our Persian poets (Bedil and others) had stood towards the end of Aurangzeb's long reign. He pays no heed to the new language pattern developed by the great Urdu poets when they drifted away from Persian. He composes apparently in Urdu, but makes no distinction between Urdu and Persian. Many of the Urdu verses he wrote in this early period are all Persian without a Hindi word interposed. Here is an example :

اسد خستہ گرفتار دو عالم اوہام
مشکل آساں کن یک خلق ! تغافل تا چند ؟

The stricken Asad is a prey to a world of alarms !
O Thou Who resolvest the problems of creation, how long this neglect of me ?

The Urdu verses of these years do not consist entirely of Persian words. There is very often a Hindi element intermixed :

وحشت بہار نشہ و گل ساغر شراب
چشم پری شفق کدۂ راز ہے مجھے

Frenzy is the spring of rapture, and the cup of wine a rose ;
And her beauteous eyes the twilight of a sacred mystery !

Some of these early verses (but only some !) mix Persian and Hindi in the right proportion, so that they are acceptable to modern Urdu usage :

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

Because of me each speck of dust—a chalice brimful of desire !
Whose heart am I that I go out to this world and the next ?

3

Ghalib's juvenile verses are almost always precociously analytical : they are profound in a strikingly obscure way. The obscurity arises from the utterly unexpected coordination of disparate images often based on the observation of exotic aspects of reality. Take, for instance, the pared nail, which (because of its curved shape) the poet likens to an eyebrow. But since the pared nail is cast away, it becomes also a symbol of being's passage into non-being. Thus the pared nail represents a "raised eyebrow" at the heedlessness of the poet who has failed to enjoy the blessed selfless state :

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوق فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

O the heedlessness that kept us far from the joy of the selfless state !
To the discerning glance each pared nail was an admonishing eyebrow.

This ruggedness and obscurity stems from an irrepressible love of the concrete. The external world is unfailingly the focus of the poet's attention. A great deal of what he wrote about this time reads like the scrap-book of an amateur scientist. The young Ghalib is always "the poet of induction", that is, a man who never starts with an idea *a priori*, but must, in any case, make experience his final court of appeal. In this early period he lays too much stress on the *fact* (the physical fact), while the *idea* connected with the fact is sometimes so thin as to be negligible. Here is a typical verse :

بسکہ زیر خاک با آب طراوت راہ ہے
ریشہ سے ہر تخم کا دلو اندرون چاہ ہے !

Since under the soil there is a way to the refreshing water,
Each seed, by means of a fibre, throws its bucket into the well !

And the poet goes on, in the same *ghazal*, to remark :

عکس گلہائے سمن سے چشمہ ہائے باغ میں
فلس ماھی آئنہ پرداز داغ ماہ ہے

The scales of fishes mirror the spots of the moon,
When the jessamine flowers reflect themselves in the fountains of the garden.

This emphasis on the description of crass physical reality shows the way to a sensuous approach, which should be expected, as a matter of course, from the young man with whom we are at present concerned. The following is a

beautiful illustration :

فشار تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جوغنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

Ah the close, the squeezing, embrace which forms the dew ;
Whenever the breeze strays secretly into the bower of the bud.

Another delightful verse on the same theme :

بہار در گرو غنچہ شہر جولاں ہے
طلسم ناز بجز تنگیٔ قبا معلوم !

The spring, locked up in buds, streams through the town :
Beauty cannot work its charm save in a tight-fitting vest !

In some of the happier moments of these youthful days the poet has left us lines of exquisite loveliness replete with his love of sensuous detail. The surging music of the following verse comes to you only in the original—not, alas, in the translation :

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سر و سبز جوئبار نغمہ ہے

O the raptures succulent with colour ! O the harmonies drunk with joy !
The flask of wine is a cypress green along the stream of melody.

4

Sometimes the predilection for the starkly concrete fact does yield happy results, as in some of the foregoing illustrations, or as when he compares the sky to a tiny egg laid by an ant, or the heart to the shape of a falling drop of blood in its downward course, or again, when he refers to the curves of a hair singed with fire or to the twinkling dots which fire leaves for a while on a burnt piece of paper. This can happen only when the physical detail is harnessed to an idea or a reflective mood.

In later years the restless eye of the poet of concrete situations became remarkably quiet and unobtrusive. He had now completely mastered the art of transmuting a bare record of fact into sheer poetry. But that great time had not come yet. From pure physical description to pure thought is a far cry. The young man was not, however, devoid of the master's touch, which was even now seen in the offing. In one of the *ghazals* dating back to these early days he has

the following two memorable verses :

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ؟
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا
خا کبازیٔ امید کارخانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

Where is the second footstep of the heart's desire ?
This desert of Being is, O Lord, so very like a footstep.
To me the sand-houses of Hope look like a children's game :
I see Despair laughing in scorn, his lips apart with the two worlds.

The "two worlds" in the last line are, of course, this world and the next, here represented as the two eternal lips of Despair gone wide apart in derisive laughter.

The above verse is not, and should not be taken to imply, a pessimistic or atheistic theory of life. In metaphysics the young Ghalib gives expression to faith and unfaith with equal vigour :

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز !

My prayers do not avail me in my trouble ;
This grant me, O Almighty, "Long live Khizr !"

Such word-play with the Almighty appears to be impious. But the same young poet has the following devout prayer :

گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریاد بے دلاں تجھ سے
چراغ صبح و گل موسم خزاں تجھ سے

The power of speech man's tongue must beg of Thee :
By Thee is silence decked with eloquence !
In sorrow the afflicted call to Thee !
The autumn rose, the glimmering morning candle, live by Thee !

In spite of his comparative youth, Ghalib was capable—even in these early days—of giving expression to remarkably mature moral judgments on human

affairs.

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ !
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

Art sure thy prayer is heard ? Then do not pray at all !
Ask nothing but a heart without desire.

Here is advice befitting an older mentor, although this, unquestionably, is one of his early verses :

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

Solicit not enjoyment from conviviality ;
For, in this net-house, colour is a quarry escaped from the net !

No less striking is this rugged but forthright judgment pronounced by a poet who was no more than a boy :

دریوزۂ ساماں ہا ، اے بے سر و سامانی !
ایجاد گریباں ہا در پردۂ عریانی !

What ! Begging round for ways and means ? O destitution !
Alas ! these gorgeous collar-bands, all screened by utter nakedness !

The "collar-bands" in the second line is a Persian allusion to the collar being torn into shreds in a fit of delirious fury.

The first MS. *Diwan*, from which all quotations in this chapter have been taken, is dated November 1821. Even this MS. has early and late entries. The young Ghalib had probably finished his work by 1818. The boyish and adolescent verse of Ghalib holds forth—however dimly—a promise of the vision which characterized the seer, the stoic, the humanist, the humorist, the rebel against authority, and the realist who freely accepted whatever came to him from the world of matter and from the world of spirit.

A Humanist Passes Away

—Gp. Capt. S. F. Mahmud

Professor Hamid Ahmad Khan, scholar, educationist and a gentleman in the truest sense of the word, passed away on Friday, 22 March, at the age of 70 years and four months. With him ended an era.

He was of the generation which burgeoned in the twenties and thirtees of this century. Those were the decades when Iqbal burst into glory and Hafiz and Josh sang of youth and beauty, when the Muslims of the sub-continent awoke from a long sleep, when a new concept of life was in the air, when the skies were loftier, the vistas more spacious and the atmosphere rang with the sound of golden bells.

Professor Hamid Ahmad Khan came of a distinguished family. His illustrious father Maulana Sirajuddin Ahmad Khan started the famous "Zamindar", which, in the hands of Hamid Ahmad Khan's eldest brother, Maulana Zafar Ali Khan, became a clarion call of liberty, of dignity, of national pride and of Indo-Islamic culture.

Hamid Ahmad Khan was educated at the Church of Scotland High School, Wazirabad and was a class-fellow of another scholar, later Judge, Mr. S. A. Rahman. The famous Dr. T. Grahame Bailey was the Manager of that School and Hamid Ahmad Khan's teacher.

Hamid Ahmad Khan went to Hyderabad Deccan for his degree. There his elder brother, Professor Mahmud Ahmad Khan was Head of the Department of Chemistry, later Registrar of the Usmania University.

Hamid Ahmad Khan obtained a First Class First in the University in his three year's Honours course. He took his M.A. English from Government College, Lahore. In 1934 he joined Islamia College Lahore as a Lecturer in English. Here he soon made a reputation as a great teacher and a profound scholar. He founded the Bazm-i-Frogh-i-Urdu and was later Chief Editor of "The Crescent", the College Magazine.

In 1945 he joined the Directorate of Education Delhi but came back to Islamia College after Independence. He went to Cambridge in 1952 and did his M. Litt. on "The Sensuous and the Mystical in Wordsworth". He told me on return that Professor Arberry, who was one of his Examiners and his own Tutor, pressed him to stay on for another year and enlarge his Thesis and they would recommend for a Ph.D. but circumstances would not permit such a course, and so he came back to his college in Lahore.

In 1958 he was made Principal. Even as Principal he did not forsake teaching, which was his primary level. He now devoted himself whole-heartedly to the task of raising the tone of Islamia College and soon made that institution the envy of all academic circles. In dress and deportment, in discipline and devotion to studies, Islamia College students led the younger generation

In 1963 he was appointed Vice-Chancellor of the Punjab University which post he occupied for six years. As Vice-Chancellor he worked almost twelve hours a day and ruined his health. I had to beg his wife many times to ask him to relax but his sense of urgency was so great that nothing would stop him from working even on holidays.

The love of Urdu was an article of faith with him and he was a fanatical devotee of Indo-Islamic Culture. He sponsored two scholarly and cultural Projects during his Vice-Chancellorship : The Majlis-i-Yadgar-i-Ghalib on Ghalib's Centenary and The Cultural and Literary History of the Muslims of the Indo-Pakistan sub-continent. He brought the first to fruition and lived to see fourteen volumes of the latter in print.

He was awarded Sitara-e-Imtiaz in 1962 and Sitara-e-Pakistan in 1967. For his great scholarship and ardent love of Urdu language and literature, he was appointed Director of the Board for Advancement of Literature in 1970 which office he held till the last.

Even an eventful life like this cannot describe the richness of his days. It was not the office, which made Hamid Ahmad Khan, it was he who distinguished the office.

As an educationist alone, he showed a vision and followed a course, which enlightened two generations. As a scholar his insight and depth of understanding, his meticulous eye and attention to detail were the despair of sluggish minds, as they were an inspiration to dozens who worked with him and under him.

Every word that he wrote, whether in English or Urdu, was weighed and measured and his Urdu prose scintillated as it informed. His sympathies were

so broad that whether he spoke on moral influences in education or cultural influences on the morals of the times, he gave a fresh slant to themes, which have been washed clean of meaning by demagogues.

It is difficult to assess the protean qualities of such a man. His love of Man was as great as was his love for Ghalib or Iqbal. His appreciation of secular or mystical verse was as profound as his veneration of the great Sons of Islam. Whether it was Jamal-ud-din Afghani, or Sir Syed, the Quaid-i-Azam or Iqbal, Ghalib or Goethe, he talked of them as if they were the finest flowers of Creation.

One would, however, be doing him an injustice, if one ignored the diplomatic services he rendered to his country, as a representative of Pakistan, at the Afro-Asian Islamic Conferences. I believe it was the lambent personality of the man, the cultural aura that he shed, the courteous air he had about him, the genuine humility that, he showed in whatever he did, that won the hearts of foreigners as well as his own countrymen.

I have known him for forty-five years, closely and intimately. I would say that his most distinctive quality was his courtesy. The goodness of his heart was a feature of his many-faceted personality which endeared him to thousands. His epitaph should be :

"Here lies a great scholar, who had true nobility of soul and who loved to do good: who was considerate to the lowliest as he was kind to all".

Leaving on a Foreign Tour (1960)

Roaming through Monuments of Classical Greece (1960)

With a friend in Trafalgar Square, London (1960)

A REMEMBERANCE

—The Rev. W. Grahame Bailey

The Rev. W. Grahame Bailey is the son of Dr. T. Grahame Bailey, the well-known orientalist who taught English to Professor Hamid Ahmad Khan in a Wazirabad School more than halj a century ago. We are told that Dr. Bailey, a missionary from Scotland who could speak excellent idiomatic Punjabi, once asked the boy Hamid Ahmad Khan what he wanted to be in life. As the young boy looked for an answer, the teacher continued, "I'll tell you what you will be. You will be a Professor of English!" As the Rev. Bailey recounts in this short note, Professor Hamid Ahmad Khan made contact with his late teacher's son when he visited the United Kingdom in 1960.

It gives me very great personal pleasure to write a short note about the late Professor Hamid Ahmad Khan, sometime Vice-Chancellor of the University of the Punjab.

Dr. Hamid Ahmad Khan was known to me because as a boy he was a student in the Mission High School in Wazirabad, where he was taught English by my father, the late Dr. T. Grahame Bailey (Nizam's Reader in Urdu in the University of London). His ability as a scholar impressed my father, and led to a deep mutual respect. My father's exceptional knowledge of Urdu, and even more his detailed familiarity with Punjabi impressed his pupils: and was later matched by Dr. Khan's own knowledge of the English language and English literature.

I first met the Professor about ten years ago, when he was on an official visit to Britain and was kind enough to make the 400 mile journey from London to Edinburgh, in order to meet the son of his old teacher: and we had a very happy day together, making a 'pilgrimage' to the home of Sir Walter Scott.

Little did I think that day that within a few years I should return to Pakistan, and have the privilege of meeting the Vice-Chancellor again, and being entertained by him in his official residence, and later visiting him in his own home.

He was obviously a thoughtful scholar and an able administrator: but

خاں صاحب بہت حساس آدمی تھے - خود گفتگو کرتے ہوئے بہت محتاط تھے اور کسی کو ناخوش گوار بات کہنا یا خلاف تہذیب بات کرنا اُن کو بہت ناگوار ہوتا تھا - اسی وجہ سے اگر کوئی شخص بھی اُن سے ناشائستگی کی بات کرتا تو سخت برہم ہوتے تھے - انھیں اس سے بہت تکلیف ہوتی تھی - اور اس تکلیف کو وہ چھپاتے بھی نہیں تھے - وہ بہت واضح طور پر اُن کے چہرے سے عیاں ہو جاتی تھی - مجھے اُن کی یہ بات پسند تھی - میرا خیال یہ ہے کہ آدمی کی حسوں کا کند ہو نا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے - اور ذہین ہونا اور حساس ہونا ، یہ دو مترادف باتیں ہیں - پھر وہ آدمی جس کا دل خود صاف ہو اور جس کے مزاج میں لطافت ہو ، اُس کے جی پر بڑی تیزی سے غبار آتا ہے اور اُس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے -

اُن کی وضع داری کی وجہ سے بعض اوقات آدمی اُن سے خوفزدہ بھی ہوتے تھے - بعض صورتوں میں خاں صاحب خود یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ شخص میرے ساتھ ناشائستگی یا بدتہذیبی نہ کرے اُس کو کچھ فاصلے پر رکھتے تھے - اُن کے ذہن میں یہی ہوتا تھا کہ یہ آدمی جو حدود میں نہ رہنے کا عادی ہے کہیں مجھے تختۂ مشق نہ بنائے - اور اگر میں اپنی متانت اور سنجدیدگی کی وجہ سے اس کی زد سے بچ سکوں تو بہتر ہے - مگر اس کے ساتھ جب میں نے اُن کو اندر سے جھانکا تو اُن میں ایک عجب بھر پور تواضع بھی پائی - شاید اس تواضع کو ہر آدمی نہ دیکھ سکا ہو -

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ کوئی شخص واقعی صحیح طالب علم ہے یا یہ فن جانتا ہے تو اُس شخص کے لیے ، اُس کے فن کے لیے ان کے اندر عجب تعظیم اور احترام نظر آتا تھا - میں نے علم کی دنیا میں بھی ایک بخل پایا ہے ، جیسے سرمایہ داروں کی دنیا میں دولت کے بارے میں ایک بخل ہوتا ہے - میں نے دیکھا ہے کہ دوسرے کے علم یا اُس کے فن کی تعریف کرنے میں علماء بہت بخیل ہوتے ہیں - لیکن خاں صاحب کو جب کوئی چیز اچھی لگتی تھی تو اپنی تمام وضع داری اور احتیاطوں کو چھوڑ کر وہ بے ساختہ اور دل کی گہرائیوں سے داد دیتے تھے - ایک دفعہ (غالباً ۱۹۷۲ع میں) شام ہمدرد میں احترام بارگاہ الٰہی کے موضوع پر میری تقریر تھی - اس تقریب میں

despite his distinguished career and the importance of his position as the head of a great university, he remained unassuming and unpretentious. And I remember him as a man of great courtesy and charm, warm-hearted and very kind, a kindness that he showed not only to me and my wife, but also to our daughter when she was in Lahore once with a party of students.

I remember one particular occasion when I was in his company. He had asked that he might be invited to visit his old school. A meeting and a programme was arranged, but the highlight was Dr. Khan's address to the boys. Unlike some other distinguished men, he said little or nothing about himself: instead he reminisced about his old teacher, and in humbly paying a tribute to his ability and his scholarship, he quietly acknowledged his own debt.

I was deeply sorry to learn of his death last year. Although we did not meet very often I thought of him as a real friend, and remember him with great affection and respect. And I, in my turn, feel humbly grateful to him for the friendship and kindness that I received from a man of such ability and distinction.

THE SUMMER OF 1938

The following note may be of interest to the students of Urdu Literature.

STAFF ROOM
ISLAMIA COLLEGE, LAHORE

Principal :

During the last summer vacation I made a tour of various places in India, visiting libraries and looking into old manuscripts in the possession of private individuals. The names of some of the places that I visited are given below :

Delhi ; Lucknow ; Allahabad ; Benares ; Patna ; Calcutta ; Hyderabad-Deccan and Bhopal.

The object of the tour was to collect material for a book on social life in Delhi before 1857 and to make (with the help of certain dated manuscripts) a chronological arrangement of Ghalib's Urdu and Persian works. I am glad to say that the tour was on the whole quite successful. I have not only arranged Ghalib's *Diwan and Kulliyat* chronologically, but have discovered some hitherto unknown poems of Ghalib, as also some biographical facts about the poet which have cleared a few obscurities in the story of his life. As to my work on the social life of Delhi, I have, besides having collected some material on the subject, procured a number of illustrative photographs.

Hamid Ahmad Khan
8/11/38

P.S. I hope to publish my work by the winter of 1939.
H.A.K.

42 THE FARAN

despite his distinguished career and the importance of his position as the head of a great university, he remained unassuming and unpretentious. And I remember him as a man of great courtesy and charm, warm-hearted and very kind, a kindness that he showed not only to me and my wife, but also to our daughter when she was in Lahore once with a party of students.

I remember one particular occasion when I was in his company. He had asked that he might be invited to visit his old school. A meeting and a programme was arranged, but the highlight was Dr. Khan's address to the boys. Unlike some other distinguished men, he said little or nothing about himself: instead he reminisced about his old teacher, and in humbly paying a tribute to his ability and his scholarship, he quietly acknowledged his own debt.

I was deeply sorry to learn of his death last year. Although we did not meet very often I thought of him as a real friend, and remember him with great affection and respect. And I, in my turn, feel humbly grateful to him for the friendship and kindness that I received from a man of such ability and distinction.

THE SUMMER OF 1938

The following note may be of interest to the students of Urdu Literature.

STAFF ROOM
ISLAMIA COLLEGE, LAHORE

Principal :

During the last summer vacation I made a tour of various places in India, visiting libraries and looking into old manuscripts in the possession of private individuals. The names of some of the places that I visited are given below :

Delhi ; Lucknow ; Allahabad ; Benares ; Patna ; Calcutta ; Hyderabad-Deccan and Bhopal.

The object of the tour was to collect material for a book on social life in Delhi before 1857 and to make (with the help of certain dated manuscripts) a chronological arrangement of Ghalib's Urdu and Persian works. I am glad to say that the tour was on the whole quite successful. I have not only arranged Ghalib's Diwan and Kulliyat chronologically, but have discovered some hitherto unknown poems of Ghalib, as also some biographical facts about the poet which have cleared a few obscurities in the story of his life. As to my work on the social life of Delhi, I have, besides having collected some material on the subject, procured a number of illustrative photographs.

Hamid Ahmad Khan
8/11/38

P.S. I hope to publish my work by the winter of 1939.
H.A.K.

43

STAFF ROOM

ISLAMIA COLLEGE, LAHORE.

Principal:

During the last summer vacation I made a tour of various places in India, visiting libraries and looking into old manuscripts in the possession of private individuals. The names of some of the places that I visited are given below:

Delhi; Lucknow; Allahabad; Benares; Patna; Calcutta; Hyderabad-Dn. and Bhopal.

The object of the tour was to collect material for a book on social life in Delhi before 1857 and to make (with the help of certain dated manuscripts) a chronological arrangement of Ghalib's Urdu and Persian works.

I am glad to say that the tour was on the whole quite successful. I have not only arranged Ghalib's Diwan + Kulliyat chronologically but have discovered some hitherto unknown poems of Ghalib, as also some biographical facts about the poet which have cleared a few obscurities in the story of his life. As to my work on the social life of Delhi, I have, besides having collected some material on the subject, procured a number of illustrative photographs.

Hamid Ahmad Khan

8/xi/38.

P.S. I hope to publish my work by the winter of 1939.

HAK

Professor Hamid Ahmad Khan

— Professor Khwaja Ghulam Sadiq

I first met Professor Hamid Ahmad Khan in June 1938 when I joined the 1st year class at the Islamia College, Railway Road. It was the 6th of June, my first day in the College, and the class was waiting for the teacher of English language and literature in a room in the eastern flank of the first floor of the College building, when a lean but nicely dressed person, in early thirtees, walked into the class room quite briskly. As the students rose in their seats he got on to the dias and with a smile said politely but firmly, "sit down, gentlemen". He wore brown shoes (with a protective rubber sole and heel) which he hardly changed during the first two years of my stay at the college. His ever shining shoes bore a sharp contrast to the ever unclean shoes worn by my Professor of History, the late Syed Abdul Qadir. The first thing that impressed me about Professor Hamid Ahmad Khan was his earnest desire to establish inter-personal relations with his students. On the very first day he took down, in Urdu, the names of all members of the class in his register and never took the roll call by calling out roll numbers, which was almost a universal practice with other teachers in the college. He was quite particular, when taking roll call, about calling out full names of the students even if a name ran into three or four words. Some of my class fellows had lengthy names, some had initials added to their surnames but the teacher would never miss to call out their full name. Twenty years later in 1958 when Professor Hamid Ahmad Khan became Principal of the Islamia College Civil Lines, the first thing he did was to have a chair installed in front of the Principal's chair, across the table, for the students who were to meet him in his office. That showed his great respect and regard for his wards. He believed that education was a two-way process in which both the teacher and the taught contributed their share. It was an I-thou relationship. He believed that one way to rehabilitate the confidence of students in their teachers was to have a regular dialogue with them.

Lecturing was almost like performing a religious rite with Professor Hamid Ahmad Khan. He would take his classes with Kantian regularity : was never

late and seldom took any leave. After having taken the roll call he would leave his chair, walk to the edge of the dias in front of the table, take out his pocket watch, look at the dial and putting it back into his pocket start his well-prepared lecture. His communication with the students was marvellous. The words as they left his lips were nicely chiselled. The labour that he put behind his lectures and the great regard that he had for his students soon endeared him to all members of the class. Our ties with him started growing and in a few weeks he established such a marked rapport with the class that his lectures were listened to with wrapt attention and in pin drop silence.

Only once did he come late by about twenty minutes. Most of the students kept waiting, some, of course, had left the class. He entered the class room in haste and apologised for being late and told us that while on his way to the college he had met with an accident and had to rush back home for changing his clothes. He lived, in those days, in a small flat at the northern end of the cemetry on Circular Road, outside Taxali Gate, and would cycle all the way to the college every morning.

It is not simply teaching a text book or covering the courses of reading prescribed for a particular class which constitutes the process of education. Books can be read privately or at home as well. A teacher is not simply a substitute for books. He is a human being enjoying a privileged position of an exampler and has a great impact on young minds if he has something to deliver. He is in an active give-and-take relationship with his wards. He helps create a dynamic existential situation which goads the young minds to have a peep into their not-yet transcendent being. My personality is not a finished product, an accumulation of past-experiences. It lies more in the future, is a movement towards the not-yet. I am the possibilities of my being. I, in a way, transcend myself. The process of education is aimed at helping the young souls to have an awareness of the existential possibilities of their being and this function Professor Hamid Ahmad Khan performed with great success. In the period meant for teaching English language (grammer, composition, etc.) Professor Hamid Ahmad Khan was at his best. Here he would find an opportunity to take us into the inner-most recesses of his mind to relive his personal experiences and recreate situations he had lived through in early childhood. He was just six when he lost his father and was looked after and brought up by his mother whom he held in very great esteem. He had the same degree of regard and respectful awe for his elder brother, Professor Mahmud Ahmad Khan. As he would walk back home from school along with his elder brother (Maulana Hamid Ali Khan) during hot summer days, they would just start running as they approached their house so that, Maulana Zafar Ali Khan, their eldest brother, who looked after the assets of

the family after the death of their father, might, on seeing them perspiring pr-fusely and panting, place at their disposal the tonga which the family owned. This ruse did not work and after a few weeks they gave it up.

In May 1939 Khan Sahib suffered a great shock. His mother died after a brief illness. When the news of her death reached the College the class assembled for a condolence meeting. Mr. Ahmad Saeed Kirmani, at present our ambassador to Egypt, moved the condolence resolution which was adopted and a copy of the resolution was cabled to Khan Sahib at his native village, Karamabad. When he returned after the burial rituals were over he looked forsaken and a deeply disturbed person. He told us how his mother had a great liking for the Quranic Sura Maryam. He had the consolation of having recited to her the same Sura during the last moments of her life. The 12th of May became a day of mourning for the son and so far as I remember Khan Sahib observed her death anniversary in a simple but befitting manner to the end of his life. He would make it a point to have no engagements on the afternoon of 12th May and would spend the afternoon with his children reading letters of his mother to his sons (Khan Sahib had no daughter) and also his own article on her that was published in the Humayun. Professor Hamid Ahmad Khan's liking and taste for the green tea popularly called Kashmiri Tea was a legacy that he inherited from his mother who was from Jammu, a province of the State of Kashmir. Many times at functions held at the Islamia College, Civil Lines, I arranged Kashmiri tea for him which he always sipped with a feeling of personal gratitude. His mother was a source of enduring inspiration to him and he showed great regard for persons who held their mothers in high esteem. Once Mian Iftikhar Ahmad Tari, a former Provincial Minister for Communication and Works, during his stay at the College, was involved in a case calling for disciplinery action He was presented to the Principal along with a few other students who had been accused of creating indiscipline. Mian Tari in his defence began his statement with the phrase میں اپنی ماں کی عصمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں and after hearing him, Khan Sahib told Qazi Said Ahmad, the Head Clerk, that he had wrongly involved Mian Tari in the case and acquitted him of the charges forthwith.

Professor Hamid Ahmad Khan never believed in taking half-way measures. This trait of his personality was very much in evidence when in 1958 the question of bifurcation of the college into Degree and Intermediate Sections arose. The General Council and the Colleges Committee of the Anjuman Himayat-e-Islam were greatly divided on the question of keeping the college in its old premises on the Railway Road or moving it to the newly acquired building of the D.A.V. College near the District Courts. Sheikh Muhammad Aslam, Principal-designate for the Intermediate wing of the College, was a man of violent emotions and

wielded a strong influence on the Anjuman President, the late Maulvi Ghulam Mohy-ud-din Kasuri. He was for taking the Intermediate wing to the D A V. College building. Professor Hamid Ahmad Khan, the Principal-designate for the Degree College, and Sheikh Muhammad Aslam had been great friends for over twenty-five years. As early as 1938 Khan Sahib had suggested during his class lectures that the college had better be shifted to a quieter corner of the town. He would stop lecturing and resume his seat when a marriage party accompanied by the marriage band passed along the Railway Road. The College was in the heart of a congested commercial area and the fanfare of a marriage procession would make lecturing for a teacher of his sensitivity an impossible task. Professor Hamid Ahmad Khan was quite naturally all for shifting the College to the Civil Lines area. A great tussle ensued and there was a great rift in the Anjuman circles on this issue. Professor Hamid Ahmad Khan had to plead his case against heavy odds. The Principal-designate for the Degree Section had no clerk, no stenographer, while Sheikh Muhammad Aslam being the Principal of the composite College at that time had access to the College Office and its staff. Khan Sahib had to write long notes in his own hand and that would consume a lot of his valuable time. He inspired such confidence in his colleagues that a strong team of devoted workers gathered round him and they all worked tirelessly as one man, preparing scale drawings of the D A.V. College buildings, measuring seating accommodation in the built area of the College to prove that more students could be accommodated at the Railway Road College than in the D.A.V. College building. Besides preparing a strong case with singleness of devotion what endeared Khan Sahib to his colleagues, what helped him, to raise his stature as a man, was his decision to sacrifice his life-long friendship for the good of the college. He could not betray his college. It was his conviction that an exclusively degree college (the Civil Lines College was made a purely degree college) should be away from the thickly populated area of the town and be also quite close to the University. In his younger days he had desired the college to be shifted out of the congested area and now there was the chance of his life to serve the institution which he so dearly loved. Khan Sahib's relation with Sheikh Muhammad Aslam got estranged but he did not for a moment think of saving his friendship and fought and won his case.

In the first Hostel directory that I published in 1959-60 I had the names, addresses, classes, etc., of the residents printed Block-wise. I also got name plates of the Blocks fixed at prominent points in the hostel. In 1939 the Crescent Hostel, which was situated on the Cooper Road, was lost to the College as the Anjuman had decided to set up a Women's College in Lahore. The Crescent Hostel became a part of the Women's College at Cooper Road.

At first the College had possession of only a small portion of the D. A. V. College Hostel No. 1, which was contiguous with the teaching departments of the College. When I was appointed Superintendent of the Hostel, in October 1957, there were squatters in a number of rooms in the hostel, and about 35% of the building had been enclosed by a boundary wall and was being used as a transit Camp for the non-Muslim ladies who had been abducted during the partition of the sub-continent and were being recovered and were then on the way back to East Punjab, India. The walled portion was acquired during the Principalship of Professor Hamid Ahmad Khan.

As Vice-Chancellor Professor Hamid Ahmad Khan had to deal with the Chancellor, the late Malik Amir Mohammad Khan of Kala Bagh. People who worked under Nawab Kala Bagh know that it meant to displease the mighty administrator. Immediately after assuming the charge as Vice-Chancellor there was a students' strike. The Vice-Chancellor was told that an unruly mob of students was coming towards his office and that he should slip away through the back door. Professor Hamid Ahmad Khan refused to accept the advice and braced himself to meet the angry faces. The students grossly misbehaved, broke his furniture and raising their voices demanded answers to their questions. The Vice-Chancellor very calmly answered that he had never addressed a mob, he could only address students. Thereat the students withdrew without doing any harm to his person. Later on they met the Chancellor who summoned the Vice-Chancellor for holding discussions on the students' problems. Professor Hamid Ahmad Khan refused to attend the meeting on the ground that since the Chancellor had entertained the students over the head of the Vice-Chancellor he should meet them alone.

Professor Hamid Ahmad Khan's love for Urdu language and literature is too well-known to be mentioned. He belonged to a family the services of whose members to the enrichment and promotion of Urdu language in the sub-continent spread over three quarters of the twentieth century. As Principal of the Islamia College, Civil Lines, he convened an Urdu Conference to initiate the crusade to accord the National Language its proper place at all levels of our collective life. During the days of President Muhammad Ayub Khan efforts were made to adopt Roman Script instead of the Arabic Script for Urdu. Dr. Justice S. A. Rahman, Dr. Syed Abdullah, Mian Bashir Ahmad, Maulana Salah-ud-din, Maulana Hamid Ali Khan and a host of other crusaders of the National Language and members of the Urdu Conference felt greatly disturbed over such sinister moves against and murderous attack on Urdu. The crusade had to be carried on a number of fronts. Dr. Syed Abdullah led the drive to have Urdu signboards at the shops in the commercial and fashionable areas in Lahore. To have Urdu as the medium

of instruction at the degree and the post-graduate levels, and the option to answer questions in Urdu at all levels of the University examinations and to introduce Urdu as one of the office languages at the University and Government offices are some of the fronts at which the members of the Urdu Conference worked. Besides Urdu, Professor Hamid Ahmad Khan had a special concern for philosophy. He graduated from the Usmania University, Hyderabad Deccan. He stood first in the University and also first in Philosophy and English. His Professor of Philosophy, the late Dr. Khalifa Abdul Hakim, recommended him, on the basis of the result, for the award of a scholarship for doctorate in Philosophy in Germany. The University authorities turned down this recommendation on the ground that the candidate, being a *non-mulki* (not from the area, did not belong to Hyderabad) was not eligible for the award and the scholarship was awarded to a local student who was number two on the merit list. Thereat the young scholar rushed to Lahore and took admission in M.A. English at the Government College, Lahore. It was thus by an accident of history that Professor Hamid Ahmad Khan could not go in for a doctorate in philosophy. But he never severed his ties with philosophy. Before he took over as Vice-Chancellor of the University of the Punjab the University had taken a decision to start post-graduate classes in Philosophy under the administrative control of the Head of the Department of Applied Psychology. But before the classes could start an altercation developed between Dr. Ghulam Jilani, Head of the Department of Applied Psychology and Professor Q. M. Aslam. The latter was working in the Department of Applied Psychology and had been deputed to run the M A. Philosophy Classes. On the advice of Dr. Ghulam Jilani, the then Vice-Chancellor, the late Justice Mohammad Sharif, decided that the M A. Philosophy classes be not started for the time being. In September 1963 Professor Hamid Ahmad Khan took over as Vice-Chancellor and on learning that the starting of Philosophy classes at the University had been postponed, felt a little disturbed. It was his typical and innate courtesy, and in keeping with his moral code that he first wanted to check with Justice Mohammad Sharif about the whole affair. So he sent me to him to get his assent for setting up the Department of Philosophy at the University. Justice Mohammad Sharif told me that he would be only too happy to see the teaching of Philosophy commence at the University. On my reporting back that Justice Mohammad Sharif had given his assent to the starting of M.A. Classes in Philosophy, Professor Hamid Ahmad Khan wrote him a letter to get his assent in writting. After going through the formalities the Department of Philosophy was set up in September Oblique October, 1963. The credit of naming the Chair of Philosophy, at the University after our Poet-Philosopher Allama Muhammad Iqbal, and the starting of the annual Iqbal Memorial Lectures at the University, goes to the late Professor Hamid Ahmad Khan. Professor Qazi

At first the College had possession of only a small portion of the D. A. V. College Hostel No. 1, which was contiguous with the teaching departments of the College. When I was appointed Superintendent of the Hostel, in October 1957, there were squatters in a number of rooms in the hostel, and about 35% of the building had been enclosed by a boundary wall and was being used as a transit Camp for the non-Muslim ladies who had been abducted during the partition of the sub-continent and were being recovered and were then on the way back to East Punjab, India. The walled portion was acquired during the Principalship of Professor Hamid Ahmad Khan.

As Vice-Chancellor Professor Hamid Ahmad Khan had to deal with the Chancellor, the late Malik Amir Mohammad Khan of Kala Bagh. People who worked under Nawab Kala Bagh know that it meant to displease the mighty administrator. Immediately after assuming the charge as Vice-Chancellor there was a students' strike. The Vice-Chancellor was told that an unruly mob of students was coming towards his office and that he should slip away through the back door. Professor Hamid Ahmad Khan refused to accept the advice and braced himself to meet the angry faces. The students grossly misbehaved, broke his furniture and raising their voices demanded answers to their questions. The Vice-Chancellor very calmly answered that he had never addressed a mob, he could only address students. Thereat the students withdrew without doing any harm to his person. Later on they met the Chancellor who summoned the Vice-Chancellor for holding discussions on the students' problems. Professor Hamid Ahmad Khan refused to attend the meeting on the ground that since the Chancellor had entertained the students over the head of the Vice-Chancellor he should meet them alone.

Professor Hamid Ahmad Khan's love for Urdu language and literature is too well-known to be mentioned. He belonged to a family the services of whose members to the enrichment and promotion of Urdu language in the sub-continent spread over three quarters of the twentieth century. As Principal of the Islamia College, Civil Lines, he convened an Urdu Conference to initiate the crusade to accord the National Language its proper place at all levels of our collective life. During the days of President Muhammad Ayub Khan efforts were made to adopt Roman Script instead of the Arabic Script for Urdu. Dr. Justice S. A. Rahman, Dr. Syed Abdullah, Mian Bashir Ahmad, Maulana Salah-ud-din, Maulana Hamid Ali Khan and a host of other crusaders of the National Language and members of the Urdu Conference felt greatly disturbed over such sinister moves against and murderous attack on Urdu. The crusade had to be carried on a number of fronts. Dr. Syed Abdullah led the drive to have Urdu signboards at the shops in the commercial and fashionable areas in Lahore. To have Urdu as the medium

of instruction at the degree and the post-graduate levels, and the option to answer questions in Urdu at all levels of the University examinations and to introduce Urdu as one of the office languages at the University and Government offices are some of the fronts at which the members of the Urdu Conference worked. Besides Urdu, Professor Hamid Ahmad Khan had a special concern for philosophy. He graduated from the Usmania University, Hyderabad Deccan. He stood first in the University and also first in Philosophy and English. His Professor of Philosophy, the late Dr. Khalifa Abdul Hakim, recommended him, on the basis of the result, for the award of a scholarship for doctorate in Philosophy in Germany. The University authorities turned down this recommendation on the ground that the candidate, being a *non-mulki* (not from the area, did not belong to Hyderabad) was not eligible for the award and the scholarship was awarded to a local student who was number two on the merit list. Thereat the young scholar rushed to Lahore and took admission in M.A. English at the Government College, Lahore. It was thus by an accident of history that Professor Hamid Ahmad Khan could not go in for a doctorate in philosophy. But he never severed his ties with philosophy. Before he took over as Vice-Chancellor of the University of the Punjab, the University had taken a decision to start post-graduate classes in Philosophy under the administrative control of the Head of the Department of Applied Psychology. But before the classes could start an altercation developed between Dr. Ghulam Jilani, Head of the Department of Applied Psychology and Professor Q. M. Aslam. The latter was working in the Department of Applied Psychology and had been deputed to run the M A. Philosophy Classes. On the advice of Dr. Ghulam Jilani, the then Vice-Chancellor, the late Justice Mohammad Sharif, decided that the M A. Philosophy classes be not started for the time being. In September 1963 Professor Hamid Ahmad Khan took over as Vice-Chancellor and on learning that the starting of Philosophy classes at the University had been postponed, felt a little disturbed. It was his typical and innate courtesy, and in keeping with his moral code that he first wanted to check with Justice Mohammad Sharif about the whole affair. So he sent me to him to get his assent for setting up the Department of Philosophy at the University. Justice Mohammad Sharif told me that he would be only too happy to see the teaching of Philosophy commence at the University. On my reporting back that Justice Mohammad Sharif had given his assent to the starting of M.A. Classes in Philosophy, Professor Hamid Ahmad Khan wrote him a letter to get his assent in writting. After going through the formalities the Department of Philosophy was set up in September Oblique October, 1963. The credit of naming the Chair of Philosophy, at the University after our Poet-Philosopher Allama Muhammad Iqbal, and the starting of the annual Iqbal Memorial Lectures at the University, goes to the late Professor Hamid Ahmad Khan. Professor Qazi

THE FARAN 51

of instruction at the degree and the post-graduate levels, and the option to answer questions in Urdu at all levels of the University examinations and to introduce Urdu as one of the office languages at the University and Government offices are some of the fronts at which the members of the Urdu Conference worked. Besides Urdu, Professor Hamid Ahmad Khan had a special concern for philosophy. He graduated from the Usmania University, Hyderabad Deccan. He stood first in the University and also first in Philosophy and English. His Professor of Philosophy, the late Dr. Khalifa Abdul Hakim, recommended him, on the basis of the result, for the award of a scholarship for doctorate in Philosophy in Germany. The University authorities turned down this recommendation on the ground that the candidate, being a *non-mulki* (not from the area, did not belong to Hyderabad) was not eligible for the award and the scholarship was awarded to a local student who was number two on the merit list. Thereat the young scholar rushed to Lahore and took admission in M.A. English at the Government College, Lahore. It was thus by an accident of history that Professor Hamid Ahmad Khan could not go in for a doctorate in philosophy. But he never severed his ties with philosophy. Before he took over as Vice-Chancellor of the University of the Punjab, the University had taken a decision to start post-graduate classes in Philosophy under the administrative control of the Head of the Department of Applied Psychology. But before the classes could start an altercation developed between Dr. Ghulam Jilani, Head of the Department of Applied Psychology and Professor Q. M. Aslam. The latter was working in the Department of Applied Psychology and had been deputed to run the M A. Philosophy Classes. On the advice of Dr. Ghulam Jilani, the then Vice-Chancellor, the late Justice Mohammad Sharif, decided that the M A. Philosophy classes be not started for the time being. In September 1963 Professor Hamid Ahmad Khan took over as Vice-Chancellor and on learning that the starting of Philosophy classes at the University had been postponed, felt a little disturbed. It was his typical and innate courtesy, and in keeping with his moral code that he first wanted to check with Justice Mohammad Sharif about the whole affair. So he sent me to him to get his assent for setting up the Department of Philosophy at the University. Justice Mohammad Sharif told me that he would be only too happy to see the teaching of Philosophy commence at the University. On my reporting back that Justice Mohammad Sharif had given his assent to the starting of M.A. Classes in Philosophy, Professor Hamid Ahmad Khan wrote him a letter to get his assent in writting. After going through the formalities the Department of Philosophy was set up in September Oblique October, 1963. The credit of naming the Chair of Philosophy, at the University after our Poet-Philosopher Allama Muhammad Iqbal, and the starting of the annual Iqbal Memorial Lectures at the University, goes to the late Professor Hamid Ahmad Khan. Professor Qazi

Muhammad Aslam was the first Iqbal Professor of Philosophy at the Punjab University. Professor Hamid Ahmad Khan was requested by the University in January 1973 to deliver the Iqbal Memorial Lecture (the fifth of the series) for the 1972-1973 session by the end of June. Professor Hamid Ahmad Khan in his letter of acceptance suggested that he might be permitted to deliver the lecture without strict adherence to the time limit suggested by the University. I kept on reminding Khan Sahib about the Iqbal Memorial Lecture. His pre-occupations and his failing health did not permit him to start writing even as late as the beginning of December 1973. I met him in his office (Board for Advancement of Literature) at 2 Club Road, in December 1973 and requested him that he must start writing the annual lecture and that it be delivered in the last week of December. By that time he had decided upon the subject of his discourse. He told me in the last week of December that I might fix January 19, 1974 for the Iqbal Memorial Lecture. I insisted that since the lecture was to be printed and distributed to the audience when it was delivered, the date wauld be fixed after the manuscript had been delivered to me. On 13th January 1974 the first function in connection with the Iqbal Centenary Celebrations was held under the auspices of Majlis-e-Tariqqi-e-Adab. The function was presided over by Mr. A.H. Kardar, Minister for Education, Government of Punjab. Professor Hamid Ahmad Khan acted as stage Secretary. After the function I inquired if his Iqbal Memorial Lecture was ready. He regretted that that was not the case. A little later he told me that he had planned to project Iqbal's thought in its true perspective against the background of the ancient and modern western thought. Professor Hamid Ahmad Khan was busy writing his lecture on Iqbal which he planned to deliver early in April 1974. The month was never to dawn in his life. To my deep anguish I received a telephone call from Mr. Iqbal Kanwar (Fahim Jozi) of Radio Pakistan Lahore on 22nd March, at 4.00 p.m. inviting me to participate in a Radio obituary programme for Professor Hamid Ahmad Khan. I then realized what a great harm I had done to the Iqbal Memorial Lecture Series and to the Urdu language by not accepting Professor Hamid Ahmad Khan's offer to fix and announce January 19, 1974 as the date for the Iqbal Memorial Lecture. I am sure that an announcement in the press about the Iqbal Memorial Lecture would have made him deliver the lecture. As Principal, Professor Hamid Ahmad Khan would usually complete his convocation addresses and annual college reports just on the eve of the function.

Among the games Professor Hamid Ahmad Khan loved cricket and only cricket. He could not share his love for cricket with any other game and this he acquired through witnessing the memorable annual cricket fixture between the Islamia College and the Government College, Lahore. In any account of cricket

In Pakistan the names of these two colleges must appear in bold letters and in connection with the Islamia College the services rendered by the late Professor S M. Aslam in building up cricket in the college and in the country can never be ignored. I shall not be exaggerating if I were to say that Professor S M. Aslam lived in the thought of cricket, dreamt of cricket and died at the altar of cricket. He got his fatal heart attack while watching the annual cricket match between Islamia College. Railway Road and the Government College, Lahore Intermediate Sections). I have yet to come across a person more devoted to cricket than he. He gave us Nazar Mohammad, Gul Mohammad, A,H. Kardar, Khan Mohammad, Fazal Mahmood, Merry Max, Imtiaz Ahmad—all stalwarts of the game of cricket, but of course, regional prophets, yet these names will have to be remembered if the history of cricket in this country is ever to be written. The Islamia College had a string of cricket wins against the Government College stretching over 12 long years commencing 1938-39 session. The last match in this series was played under the captaincy of Imtiaz Ahmad. We won by a very narrow margin of FIVE RUNS. The last pair of the Government College held fort for a pretty long time. The 5th delivery of the first over by Khan Mohammad with the new ball ended the great duel. The last man was clean bowled with a truly Khan out-swinger. Professor Hamid Ahmad Khan, who was sitting close to me, jumped out of his chair, with his face wreathed in smiles and stretching out his hand to me for a hand-shake, said, 'What a match !' Professor Sheikh Mohammad Aslam had smoked away a number of cigarettes in less than half an hour of the morning's play.

As Principal of the College, Professor Hamid Ahmad Khan very much desired to win at least once during his tenure the annual cricket fixture against our worthy rivals, the Government College, Lahore. In 1962 he appointed me President of the College Cricket Team in the hope that some miracle might be worked to win back the coveted cricket trophy. To build up a good cricket team is no joke. It requires a lot of labour, contact with clubs and the colleges, and above all genuine interest in, nay love for, cricket on the part of persons responsible for running the show. In 1962 we shifted the venue of the match to the Gaddafi Stadium, thinking that by negating the advantage of home ground which the Government College had, at the University Grounds we might work a miracle. We had a good team, yet we failed to produce any results. Bashir Haider, our fast bowler, was in great form, but in the match of the year for the College he failed and we added another defeat to our inglorious record of college cricket. I was sorely disappointed and did not attend the college on the following day. I sent in an application but Professor Hamid Ahmad Khan refused to grant me leave, sent a peon to my residence and summoned me to the college to say that we

had put up a good fight and without wasting a moment we should start planning for the next year. In September 1963 Professor Hamid Ahmad Khan was made Vice-Chancellor of the University of the Punjab and I joined the Department of Philosophy on 30th November, about 2 months later. In December 1963 the annual fixture was played and the long cherished wish of Professor Hamid Ahmad Khan was realised, although it came a little too late.

The Government Islamia Cricket match had all the colourings of a true Awami Mela. Before Independence the Government College, was, and perhaps even now is, a great institution where bright students from well-off families alone could pursue their studies, while the portals of the Islamia College remained open for all sections of the community and especially for the poorer sections of the community. The Government College was a symbol of the Government, of the British Raj, while the Islamia College symbolised the oppressed, the nation. The public at the Government-Islamia Cricket final was always with the Islamia College. There was a lot of fun ! Dances, songs, slogans, choruses and invectives. The irrational element, the life force, was always in full cry on this festival. Professor Hamid Ahmad Khan did not like a wanton display of the irrational element on the part of the students under his charge, even at the cricket ground. He believed that an educated person was a moral person and any exhibition of youthful exuberance which violated the moral code lowered the youth. He had, therefore, his colleagues seated among the students at regular intervals on the cricket ground. Some old boys of the college, who were conversent with the traditional behaviour of the crowd on the University Grounds, did not appreciate this puritanism on the part of the Principal: Once during the cricket match at the Stadium, an old boy, who was a practising lawyer and was wearing a black coat, in response to a remark from the Government College Camp started his oration in the local dialect, Professor Hamid Ahmad Khan got up and threatened to leave if the young lawyer did not stop his oration. At this the old boy was asked to go to some other part of the Stadium for display of emotional attachment to his alma mater. He very much resented it and left the enclosure in dismay.

Professor Hamid Ahmad Khan was a deeply religious man. He did not believe in simply having a religion ; to live religiously was his creed. His was a presence to be felt, a great upholder of values, a dedicated teacher and scholar, a true friend of his students and, what is more, a beacon of courage and strength for those who resist and fight against tyrants.

————

SHAKESPEARE QUATERCENTENARY
SPEECH

—**Profssor Hamid Ahmad Khan**

This was the inaugural speech at a meeting held in Lahore in 1964 to celebrate the quatercentary of Shakespeare's birth.

Lahore is happy and proud to raise its voice in praise of Shakespeare as men and cities the world over join to celebrate the quatercentenary of the poet's birth. It is a moot point whether Lahore, in all the physical remoteness of its contemporary splendour, ever flitted across the wide-ranging imagination of the great poet. We know that during Shakespeare's boyhood and youth the Emperor Akbar had converted Lahore into a city of palaces and gardens, and that the first British Ambassador came to the Moghul court while Shakespeare still lived. Certainly Milton, in his *Paradise Lost*, refers to Lahore by name; and we would, aiming a fancy, believe that Shakespeare knew our city by reputation, and his magnificent eye—"in a fine frenzy rolling"—did see this place where, almost four hundred years later, we have assembled to pay our homage to his genius.

What should we say of the genius of this supreme poet? He is every man and every woman of us in one. From the microscopic to to the cosmic, from the utterly vicious to the exquisitely angelic, there is no vision of life—ranging through all the variations of mood from the sublime to the puerile—which his rare comprehension fails to set forth in electric phrases throbbing with the accent of true speech. Think of the "lean and hungry look" of Cassius; of ' the sweet sound That breathes upon a bank of violets"; of "Dost thou not see my baby at my breast, That sucks the nurse asleep?"; of "Present mirth hath present laughter"; of "the primrose way to the everlasting bonfire"; of "the moonshine's watery beams"; of "Dost thou think, because thou art virtuous, there shall be no more cakes and ale", and of scores and scores of other phrases each one of which opens a new vista of thought or feeling. This is not a mere feat of workmanship: each one of these phrases reveals Shakespeare's grip on a new perception of meaning in life; it is, in fact, his fancy spontaneously curling itself round a new vision of the soul, illuminating our mind like a streak of light entering a dark room. Even his conceits seem to be an echo of a voice within ourselves. That is why one does not hesitate to say: Shakespeare is excellent as theatre, but as literature he is supreme.

Ladies and gentlemen, I would add only a word about Shakespea[re's] vision of moral life. Notwithstanding the even justice that he metes out [to] both good men and bad, and with all the stark despair of some of the utteran[ces] of the "Dark Period", he never impairs our faith that life is good and wor[th] of our effort. From the reading of a Shakespeare play, you always rise with [a] sense of your moral being refreshed, your mental balance restored, and you[r] view of human relationships put in wise and wholesome perspective. You com[e] away with some new touch of fine feeling, some new awareness of the nature o[f] human fellowship. Whether it is the story of Othello and Desdemona, of Lea[r] and Cordelia, of Antony and Cleopatra, or of Orlando and Rosalind, your sense of moral exhilaration is always there. I am positive that no man has ever been the worse for his acquaintance with Shakespeare.

And, finally, the universal quality of Shakespeare's mind. One expression of it is the infinite variety of the characters he created. Think only of Juliet's Nurse, Hotspur, Falstaff, Imogen, Iago, Hamlet... In this connexion I would invite your attention to a poem by Iqbal written almost fifty years ago. It is a lyrical tribute to Shakespeare. May I say that my version of Iqbal's poem is a literal translation? The music and the magic of the original are, of course, lost; and, what is more, the injection in English translation of phrases and literary conventions rooted in a non-European culture creates some difficulty in comprehension for a mind which has received its training only in the cultural idiom of the West. I beg you, therefore, ladies and gentlemen, to rise to the occasion, and try to reach out to the meaning and the music of Iqbal. Iqbal proceeds form the theme of Shakespeare holding a mirror to nature, and the first six lines of the poem are all built round that theme. In *l*. 4 the reference to the "Lady Wine" in her "bower" is a Persian figure of speech which describes wine as a beautiful damsel. Now let us have Iqbal's poem :

TO SHAKESPEARE

To the glow of the morning the river's flow is a mirror ;
To the evening song the hush of the evening a mirror ;
The rose-leaf mirrors spring's lovely cheek in bloom ;
To the Lady Wine her chaliced bower a mirror.
Beauty is the mirror of truth ; and the heart the mirror of beauty,
To the heart of man the beauty of thy words a mirror.
Yes, thy sky-reaching thought does touch the heights of Being ;
Was, then, thy luminous mind the end and goal of Being ?
When the eye went forth in quest of a sight of thee,
It found the sun concealed in the blaze of the sun.

Though veiled from the eye of the world remained thy being,
The world lay naked before thy seeing eye.
How jealous is Nature in guarding her mysteries !
Never again will she bring forth a seer like thee.

I am sure this occasion puts some of you in mind of a famous passage in Carlyle where he weighs the worth of the British Indian Empire against the worth of Shakespeare, and concludes : Indian Empire or no Indian Empire, we cannot give up our Shakespeare. The emphasis on "*our* Shakespeare" seemed to signify that, when the Indian Empire went, Carlyle would take away "his Shakespeare" too. Now at last the British Indian Empire is gone from amongst us. And I would gladly say, after Carlyle : Let the British Empire go ; we cannot give up our Shakespeare.

———

A Letter of Condolence

Professor Basil Willey, formerly King Edward VII Professor of English Literature at the University of Cambridge and author of several books on criticism was Professor Hamid Ahmad Khan's teacher when the latter worked there for his M. Litt. degree. Professor Hamid Ahmad Khan maintained a lifelong friendship with Professor Willey and held him in the highest esteem. The last time the two met was in Cambridge in May 1970, when Professor Willey presented his latest book "Religion Today" to him. We reproduce below a letter received by Professor Hamid Ahmad Khan's son. He had written to Professor Willey, requesting him to send a paper for publication in the Presentation Volume "Nazr-e-Hamid Ahmad Khan."

From
PROFESSOR BASIL WILLEY

as from
18 ADAMS ROAD,
CAMBRIDGE.
(Telephone 59252)
Aug. 12 1974.

Dear Mr. Khan,

Thank you so much for your letter. I am grieved to learn of the death of my old friend, one-time pupil H.A. Khan. Please accept my deepest sympathy. I shall always think of Professor Khan as a most distinguished scholar and a true friend.

I am an old man with a rheumatic hand and can hardly write. But if you care to use any part of this letter you are most welcome to do so.

Yours Sincerely
Basil Willey

———

Homage to a Friend

—**Professor Sirajuddin**

I first got acquainted with the late Professor Hamid Ahmad Khan when he joined the Government College Lahore as a fifth year student—in 1927 for the Master's degree in English Literature. Dr Imdad Husain, Professor Inder Mohan Verma and myself, were members of the same class, all working under the inspiring guidance of teachers of the calibre of Professors Langhorne, Firth, Dickinson, M.G. Singh, and for a short period, Professor Mirza Muhammad Saeed, and finally Professor A. S. Bokhari, who returned to the Government College Lahore in September 1928 after a brilliant First at Cambridge. We were also lucky to be the pupils of the venerable Professor Mowbray Velte at the Forman Christian College, Lahore, there being an arrangement for co-operative teaching between these two colleges at that time.

The quality that struck us most about Hamid Ahmad Khan was his quiet, unobtrusive devotion to Literature, both English and Oriental (i.e. Persian and Urdu) ; he never pushed himself forward blatantly, never struck and aggressive pose, but quietly went his way in a sort of dignified, but modestly self-assured anonymity. We were all good students but we knew that in Hamid Ahmad Khan we had a formidable rival, though he never gave the impression that he was striving against anyone. The qualities of his personality which were so brilliantly revealed in later years, were all latently present in him as a student : a genuine pursuit of the best that has been thought and written, and an unself-conscious attempt to model his life on values and patterns of intellectual honesty, integrity, compassion, reverence and a healthy self-examination.

Our ways parted for sometime in 1929 when I went up to Oxford and Hamid Ahmad Khan took up a teaching assignment at the Islamia College Lahore, an institution which he served with a love and a missionary zeal which is unparalleled in the history of any college. Islamia College was certainly not in the vanguard of so-called prestigious institutions in the province, but Professor Hamid Ahmad Khan, through his individual devotion, talent and dedication made it so, at least as far as the teaching of English Literature was concerned. He scored over us in the Government College by virtue of his superiority in the knowledge and understanding of Persian and Urdu Literature, thus achieving a

synthesis which was denied to those of us who specialised only in English language and literature.

It was Professor Hamid Ahmad Khan's self-examination which kept alive in him a secret and noble ambition, that of crowning his studies at one of the two great universities of Oxford and Cambridge. He ultimately found his way to Cambridge at the age of 49—a period of life when it is almost impossible to become a student all over again. But Hamid Ahmad Khan accomplished the impossible, which is a further proof of the flexibility, the *livingness* of his intellectual, scholarly and spiritual pursuits. I consider it a great feat—his acquisition of the M. Litt. degree from Cambridge.

To Professor Hamid Ahmad Khan, on his return from Cambridge, belongs the credit of elevating the Islamia College Lahore to the position of a post-graduate college in the teaching of English Literature. As Principal of that College, and later as Vice-Chancellor of the University of the Punjab for six years (1963-1969) Professor Hamid Ahmad Khan reached the peak of his maturity as an educational administrator, loved and respected for his absolute uprightness, sustained hard work, a never failing sense of duty to his Alma Mater whose destinies he guided with a compassionate firmness benevolence, charitable impartiality and generosity. To his vision we owe the launching of the literary history project in the University, the University Journal of Research and the revitalising of the Encyclopedia of Islam. To me, personally, he was a noble benefactor, for it was he who appointed me Professor Emeritus, a boon for which I shall bless him as long as I live.

Scholars and gentlemen of the distinction and stature of Professor Hamid Ahmad Khan, are born perhaps once in a hundred years. It shall be a long wait before Pakistan gets another like him—if at all. The breed is rare, and I shall not be surprised if it died with him on 22 March 1974.

———

Mian Bashir Ahmad

—**Professor Hamid Ahmad Khan**

This short article was written by Professor Hamid Ahmad Khan only eleven days before he passed away. It was read by him at a meeting (in memory of Mian Bashir Ahmad) in the Senate Hall on 11 March 1974.

It is now three years since Mian Bashir Ahmad passed away. In his life-story the month of March appears to be the month of destiny. Born in March 1893, he worked his way to social and literary eminence in the years following his return from Oxford. In March 1918 he chose to work as Professor of History at Islamia College, but left soon after, finding the working conditions of the College less congenial than he had expected. In the mid-thirties Quaid-e-Azam nominated him on the Working Committee of the All India Muslim League, and it thus came about in the month of March 1940, when the Unionist government had shed Khaksar blood on the streets of Lahore and the atmosphere was tense and charged with trouble, that Mian Bashir Ahmad (jointly with Nawab Shah Nawaz Khan of Mamdot) persuaded Quaid-e-Azam in the teeth of Unionist opposition to stick to the original plan of holding that year's League session in Lahore. At this historic session Mian Bashir Ahmad's celebrated poem "Mohammad Ali Jinnah" was recited on the 23rd of March, and the Pakistan Resolution unanimously passed. Years later, it was again a day in March 1971 when, along the tortuous lanes of Baghbanpura, friend jostled with friend to put his shoulder to the bier which carried Mian Bashir Ahmad's mortal remains to mingle with the dust of his fathers.

Mian Bashir Ahmad matriculated from the Central Model High School in 1908 and, joining Government College, passed his Intermediate examination in 1910. The same year he proceeded to England while yet a lad. He returned home in 1914, after getting his Honours in history from Oxford and being called to the Bar in London. He never set up practice and, instead, turned to literary and academic pursuits. Late in 1917 he married his cousin, Geti Ara, younger daughter of Sir Mohammad Shafi. It was about this time that his father, Mr Justice Shah Din, induced him to work for a while as honorary Professor of History at Islamia College. He took up this task earnestly and with characteristic thoroughness, so that some of his brighter students became his lifelong friends. However, he quitted Islamia College in July 1918, soon after Mr Justice Shah Din died early that month. He then turned solely to reading and writing as a career.

The great formative influence in his life was his father—a good and wise

man whose ability and strength of character brought him early to the vanguard of national life. Intellectually great, Mr. Justice Shah Din was morally greater. He was one of those rare men who are at all times guided by a sense of principle, never by expediency. Mian Bashir Ahmad was sensitively aware of this trait of his father's character and, in all humility and reverence, modelled his own life on his father's.

For Justice Shah Din (who assumed the *nom de plume* of Humayun) literature was a hobby ; for Mian Bashir Ahmad it was a passion. In January 1922 came out the first issue of the monthly "Humayun". The "Humayun" soon distinguished itself for its special flavour—its devotion to cultural and moral causes, and its adherence to certain principles which some people carpingly described as "puritanical". No amount of criticism or ridicule could, however, deflect the Editor of the "Humayun" from a course which he knew to be correct and clean.

In its ardent quest for intellectual and moral excellence the "Humayun" was, indeed, Justice Shah Din all over. It gradually acquired the status of a living spirit, dignified by character and quality. How many kindred spirits it drew to itself as the years went by ! The influence spread, and the "Humayun" attained an exalted position where was room only for the good and the graceful in word and thought. For almost two generations (1922-1957) a large number of voices, destined to speak with authority in the councils of the nation, first spoke through the pages of the "Humayun".

Mian Bashir Ahmad was a man of profound loyalties—personal, national and ideological. To his father he was faithful throughout his life. Before the end came, he produced in 1962 his memorable tribute—a book which he called *Justice Shah Din : His Life and Work*. To Urdu language and literature he devoted all the days and nights of his working years. His dedication to the cause was pure and indefatigable. On this issue he knew only one slogan : No Compromise. I remember when, in the course of the Urdu Conference of February 1959, I worked for a settlement between Urdu and the regional languages, Mian Bashir Ahmad was taken aback at my attitude, and almost said reproachfully : Thou too Brutus ! His love for the national language burnt like a bright flame right up to the last moments of his life.

His tastes were exquisite : books, flowers, beautiful note-books, beautiful furniture—everything in proportion to the inner call of a chaste spirit. When Pakistan was choosing its first representatives in foreign lands, and he found himself face to face with an offer, his moral finesse asserted itself : No, not to a Godless country. But, when invited to accept an ambassadorship which took him

to the noble and brotherly people of Turkey, he said Yes, with gusto. By an inward preference he remained a hermit, so that once he returned from Turkey he never hankered after another official appointment. This does not mean that he ever spared himself when his patriotic services were called for. The endless hours he spent over searching out the best wording for the inscription on the Minar-e-Pakistan comes back to my mind as a matter of yesterday.

There was a quality of innate courtesy and genuine humility which marked him out as an outstanding person. He never pushed himself to the forefront and a love of seclusion appeared natural in him. And yet behind all this gentleness and humility, there was a strain of iron. When, in May 19 0, his elder son Asghar tragically lost his life, Mian Bashir Ahmad bore the shock with stoical calm. He remembered Asghar always, but nobody knew how he suffered. When Asghar's younger brother, Manzar Bashir, was put behind the bars (January 1966) and meted out inhuman treatment, the world only saw in Mian Bashir Ahmad the stoic and the gentleman. But, behind a placid exterior, the father must have endured intense suffering. It was during January 1966 that he suffered a stroke. And, although he lived for another five years, his biographer must know now that this was the beginning of the end.

Those last five years live vividly in my memory. How often I called on him and we went (or drove) together to Jinnah Bagh : He had loved Shalamar in his boyhood days at Baghbanpura but when he built "Al-Manzar" in 1928, he came to live almost within Jinnah Bagh, or Lawrence Garden as it was then called. For him all trees in this Garden were individuals, and he was on friendly terms with all of them. There was a time when he had walked briskly along these leafy lanes. Now, during the illness of his last days, his walk was slow and faltering. He would chat with the gardeners for a while, and make some observation on the new, or old, look of a tree. We would then move on to a bench in the flower-spangled lawn facing the waterfall, and sit and talk of things long ago.

1970 was a bad year, and our rambles in the garden steadily waned. Then came the new year—the last year—1971. He worsened in February and, on a sad evening early in March, I met him for the last time in life. He only held my hand, and we did not utter a word. Both of us felt the pang of parting. On the 3rd of March, late in the afternoon before the sun set, he was gone.

I still go to Jinnah Bagh. My office now is next door. The garden is rich with memories and grows richer every day. As I go round the tree-lined path which skirts the hill (I have named it "Bashir's Walk") I look up and see Mian Bashir Ahmad's old room bathed in morning sunlight. There is a spirit in the trees : they have a voice which speaks to me.

A MEANINGFUL LIFE

—**Mr Hassan Habib**

Death is a continuation, it is not the end of the road. This is even more true for one who has lived a meaningful and purposeful life ere his time came to move to a more eternal and external existence. But all these physical and spiritual existences are parts of a single process, divinely designed, in fulfilment of God's Own Plan for Mankind and Womankind.

Such was the death, the passing into external existence, of Professor Hamid Ahmad Khan. I first came to know him during the time he was Principal of the Islamia College, Civil Lines, Lahore (1958-63). My first opportunity to meet him came in the late 50's in connection with my interest in manual labour work camps. The Islamia College was to organise a one-day work camp in the premises of the College, and Professor Hamid Ahmad Khan asked me to advise and help. Along with the students, both of us participated in the work : levelling and dressing up a plot of ground.

I was immediately struck by his deep sincerety of purpose. Later we met on various occasions, at professional gatherings and social functions, and one came to respect, admire and love him, as a person of intense dedication, transparent and steadfast sincerety, committed and assertive in the causes and ideals in which he believed—at the same time humble and polite to a fault (in this rather rude and arrogant establishment milieu), a superb teacher, a renowned scholar and critic in Urdu Literature, and above all a gentleman of the highest refinement, integrity and grace.

Professor Hamid Ahmad Khan was a much-liked and highly-regarded speaker at the Staff College a number of times. His theme on such occasions related to University education. He was then the Vice-Chancellor of the Punjab University, and among the most distinguished. His appointment in 1963 had inspired fresh confidence that the deteriorating performance and image of the University would be raised. And raised they were, despite the reactionary and anti-education attitudes and pressures of a colonial bureaucracy. Eventually in 1969, he became a victim of the same bureaucratic oppression just as the very fabric of the undemocratic colonial order began collapsing. One felt sad and angry at the treatment meted out to so eminent an educationist, scholar and Vice-Chancellor. But most remarkable of all was the grace and dignity with

Professor Hamid Ahmad Khan speaking at the Africa-Asia Islamic Conference in Bandung (1964). He led the Pakistani delegation to this Conference

A General View of the Conference
Professor Hamid Ahmad Khan, a Conference Vice Chairman
can be seen on the right

With the Chinese Ambassador outside the Vice Chancellor's office, acknowledging cheers (soon after the 1965 war)

Laying a wreath at the mausoleum of Ataturk (1967)

which Professor Hamid Ahmad Khan bore the victimization. He alone was the silver lining in that dark cloud.

Having no claim to literary worth myself, I will not comment on his well-known and well-recognised eminence as a scholar and critic in Urdu Literature. However his strong belief in the over-riding need for promoting and consolidating national outlook, national identity, and national integration in Pakistan, and the vital place that Urdu, as the national language, must have in this important national purpose and process, is something that I was always readily able to share, with, regretfully, little to contribute. A couple of years ago when there was a revival of interest in gradually replacing English with Urdu as the Office language, I had set up a small group at the Staff College to help us develop Staff College capability for conducting administrative training courses in Urdu, as well as special courses for senior officers in the use of Urdu for office and development work. At my request Professor Hamid Ahmad Khan had kindly agreed to preside over this group.

He was always willing to lend support and contribute to good causes. Meeting him was an uplifting experience—one was left feeling two inches taller. His highest dignity was the dignity he gave to others. His high intergity was visible in his simplicity, humility and ungreed. Undoubtedly his life-work will continue and gain even greater strength and momentum. Such was the sterling quality and sincerety of his investment.

A Teacher There Was

—Professor Iftikhar Ahmad

There have been teachers and teachers but Hamid Ahmad Khan was a teacher with a difference. He was neither a magician nor a saint ; he was a pure, solid teacher with a sense of mission, dedicated to the cause of education. He chose teaching as the career of his life and he never regretted his choice.

He strongly believed in the dignity of the profession and the dignity of the teacher. But he expressed his deep dissatisfaction with the way teachers were recruited. As a result of the defective recruiting procedure quite a few "non-teachers" or "anti-teachers" had entered the noblest profession on earth. These people were mainly responsible for the deterioration of educational standards and also for the devaluation of the teaching community. Professor Hamid Ahmad Khan fought throughout his life to assert the superiority of the teacher and the teaching profession. The opposition from the bureaucrats led to his occasional vitriolic outburts These outbursts were always justified, at least from the point of view of a teacher with convictions. Professor Khan was a bold teacher; he had the courage to say what he felt like saying, irrespective of the consequences that followed.

For me the memory of Hamid Ahmad Khan has great value. He inspired me in a way no other teacher could. Initially, the inspiration came only indirectly. It was mediated through a third person. At that time I had not formally graduated though I had taken my exam and was hopefully awaiting the result. I met one of his students who happened to be the elder brother of a very dear friend of mine. This student seemed to have the greatest regard for his teacher. He was particularly enamoured of his accent. Since we were educated at ordinary schools where teachers played havoc with English vowels and consonants, we were very curious to learn about the intricacies and complexities of English accentuation. Since Phonetics (the science of pronouncing sounds) is a practical subject, we had to hear the sounds correctly and properly articulated—before we could imitate them in an approximately correct way. Someone had to demonstrate the quality of the sounds. This student had received a practical demonstration from his teacher in the class room. He was all praise for his expertise. As an illustration of his virtuosity he articulated the word *little* and apologized to me for his poor performance. I suddenly became aware of my appalling pronuncia-

tion, and made up my mind to tone up my English accent.

I wanted to know for myself how the English sounds were properly articulated and also to learn the scientific basis (if there was any) of these sounds. So my indirect discipleship to the great teacher started there and then.

When I became his student, he took keen interest in my affairs. I had a weak physical constitution and he often asked me to gear up my health. As a gesture of affection, he included me in his tutorial group. Once he gave us an assignment on "Literature and Morality". I had attempted the assignment all right but I had used some extraordinarily difficult and outdated words in the assignment. This shocked his Augustan sense of order and purity. He was very particular about the use of words, both in speech and writing. One word he found particularly nauseating and insisted that the use of such a word was simply outrageous. I insisted on its appropriateness in the context of my composition even if it was outdated. He felt I was being rude, and in a sudden fit of anger he threw away my assignment on the floor and said "I am not going to have you in my group any more". Meanwhile he went through other assignments. They were even worse than mine. He seemed terribly displeased with them too. As he cooled down, he realized he had been unfair to me. So he said "I'd like to have a look at your assignment again". I placed it before him. He red-pencilled almost every line and returned it to me with adverse verbal remarks. I placed the assignment before him again, saying : "Sir, since you have gone through my assignment word by word, line by line I feel you are morally bound to pass some remarks in black and white on the assignment". He wrote at the bottom "very bad attempt" and I simply said "thank you, sir". He liked my audacity. He had such a grand heart.

He was very pleased about the Ford Foundation scholarship award in Phonetics that I received. When he heard about it, I had already left for England. As an expression of his pleasure, he sent a letter of congratulations to my parents. When he was appointed the Vice-Chancellor of the Punjab University (a rare distinction for the Principal of a private college) he invited me to join the university. He tried to help me in every possible way.

I do not think I can ever forget him. His memory has become both the illumination and the essential spark of my existence. He is part of the blood that beats in my veins ; he is the root of my inspiration, the base of all that I am and all that I may be in the days to come. (May God rest his soul in peace).

A Committed Teacher

—Professor Razi Abedi

Professor Hamid Ahmad Khan was perhaps the last of a tradition—the glorious tradition of teachers who behind their stiff-collared exterior carried a compassionate heart. Diligence and single-hearted devotion to an ideal fired his soul, and he did his best to impart this spirit to his students. He had to struggle hard to work his way up, and was fully alive to the hardships of students, but he always maintained a magnanimous silence on the mundane issues of life, though he was always eager to mitigate the suffering. At times one saw in him the head master of Rugby Chapel who was remembered by his most worthy son Mathew Arnold in these words:

> Stones might have wounded thy feet,
> Toil or dejection have tried
> Thy spirit, of that we saw
> Nothing! to us thou wert still
> Cheerful, helpful, and firm.

He always maintained a reserve and at the same time a personal contact with his students. This personal contact was, more than anything else, a part of his code—the code of a teacher. He considered teacher-student relationship as sacred and gave it top priority. He never liked to ignore an invitation from his old students. Particularly he made it a point to attend the marriage ceremonies of his students and would postpone any important engagement for the happy occasion. This was a sort of commitment for him and he took it as a duty. This meticulous sense of duty had already started looking somewhat overstrained in a world of changing values.

He was extremely particular about punctuality. He was never late, never missing where he was expected, and he did not have the sense of importance which makes some careless of the time and engagements of others. He did not even have any presumption to the professorial unconcern and always

took the roll call even if there was only one student in the class. When I was his student he was the Professor of English and also the Principal of Islamia College. Once I went for a seminar in his office. I was the only student present in that period. The Professor called the peon and instructed him not to allow anyone in the office as he was taking a class. Then he rose from the principal's chair, went into the retiring room, and was soon back with the gown on his shoulders and the attendance register in his hand. He then invited me to sit with him on the chairs around a side table, opened the register, marked me present and started checking my essay.

The taking of roll call was almost a ritual with him. He called out every boy's name, but marked the girls by looking at their faces. Their names were never called. And it gave us a strange feeling to watch him remove his glasses, look pointedly, and replace them as each girl's attendance was being marked. This incidentally reminds me of a story he told us in the class. Of the very bold initiatives that he took one was his decision to admit girls to the postgraduate classes in the college—something very unusual for Islamia College. The General Body of the Anjuman did not know of the policy for quite some time. One day the General Body was shocked to hear a demand by the Principal of Islamia College for boys. The demand was for a ladies' room with a female attendant. This naturally caused an uproar. Professor Hamid Ahmad Khan stood up in his chair and pleaded that there was a great rush of girls seeking admission to co-educational institutions for higher education. With a persuasive use of wit, which he never lacked, the Professor querried, would it therefore not be proper for Islamia College to attract them and save them from going to the non-Muslims? This sentimental appeal roused the expected response and Professor Hamid Ahmad Khan's policy was approved.

It was characteristic of his theory and practice of teaching that he thought education to be of a much wider significance than teaching prescribed texts. That is why his lectures were punctuated with general observations on life and with instructive anecdotes. Once he told us that he was invited to give his views in a case of nude pictures. He said that he had a high esteem for works of art, and as a mark of appreciation he would welcome a beautiful statue to be placed in his private room, but he would not allow the same for the man in the street whose sensibility is not cultivated enough to appreciate its merits and who will therefore find only sensual gratification in it. Prof. Hamid Ahmad Khan believed that education formed man, not simply informed him. In this connexion I may note here one more incident. Whenever he came across a student on the road he would hasten to wish him before he did so. I have been a habitual Mall

stroller. Once he saw me walking on the road and the next morning he reprimanded me for that, though as politely as he could. He thought that purposeless wandering on the roads was not a decent thing and no educated young man should find any pleasure in it. This, to my mind, was enough to put him safely in the tradition of educaters like Maulvi Nazir Ahmad I believe that if I had said that to him he would have accepted it in good spirit and as a compliment.

Another instance of his comprehensive view of education was the stress he laid upon extra-curricular activities. Societies sprouted like mushroom in Islamia College during his Principalship. Each afternoon had a number of functions of various societies going on in the college. There was hardly a man of distinction, a person of some eminence in Pakistan, who was not invited to Islamia College, and Professor Hamid Ahmad Khan was personally there each afternoon giving life and meaning to all these activities. I believe that we were the pioneers of the Drama in Islamia College since the activity was for the first time undertaken seriously under his patronage.

With his universal concept of education he combined a sense of the immediate. In his lectures he would always try to relate the subject to the students' experience of their own world. He studied Donne in the light of the oriental tradition of poetry and ransacked Urdu and Persian literatures to bring home to the class his readings of the Metaphysical Poets. Before teaching Wordsworth he showed a number of pictures on the subject of nature to make vivid to the students the concept of nature in Wordsworth. He suggested that the Neoclassical concept of nature was marked with a sense of symmetry and balance and could be compared with the Shalimar Gardens, while the Romantic concept of nature was characterised with freedom and wildness which may be compared with the Lawrence Garden. Similarly in a paper he established with scholarly evidence that the garden of Paradise in Milton's celebrated epic was on the same pattern as the Shalimar Gardens. His sense of reality was even deeper than these examples would suggest. Those who, perhaps mistakenly, saw only an idealist in him were surprised to hear him on education in a meeting of the Educators' Club, held at the Educational Auditorium where he discussed the role of education in a feudal society, in the capitalistic system, under colonialism, and in a developing state faced with the consequences of industrialisation.

These are some of the reminiscences of the late Professor as a humble student recollects them as a debt and a valuable inheritence. But I had also the good luck of working under him when he was the Vice—Chancellor of the

Punjab University. He had already made his mark as an administrator and a disciplinarian when he headed the Islamia College. But these qualities found better expression when he came to head the university. Of the various qualities I may mention only a few: exploring and encouraging talent, making a decision and taking a fearless stand on it, a humility and self-confidence which feared no rivals, and a keen desire and well-considered policy of raising the prestige of the Punjab University by encouraging research and scholarship. I shall not elaborate upon these few remarks, believing that others will write on these topics in detail. But I must say one thing. He always took decisions, never postponed them, never evaded his responsibility. Decisions are pleasant and unpleasnt, and no one is infallible. Whatever the evaluation of one's actions, commitment is better than escape. And so far as intentions are concerned, even his worst opponents respected him.

———

Hamid Ahmad Khan – A Tribute

—Syed Zulfiqar Ali Shah

Hamid Ahmad Khan was a teacher, patriot and man of faith. One could use different epithets before each of these quantities but a single qualifying word, "true", would aptly describe each distinguished facet of his character.

He was a true teacher who had gone into the profession by choice because he loved the vocation and possessed all the qualities of head and heart necessary for it. Some people think that teaching is an easy task, with short hours, long holidays, and reasonable pay for little hard work. How mistaken they are! The people have not examined the profession of teaching carefully, or they would have other ideas upon the subject. Teaching is never easy, and the real teacher's work is not mere instruction. His precept has to be accompanied by example. Needless to say that example precedes precept. In fact, he has to be a model unto his pupils and what a fine model Hamid Ahmad Khan was! He served and educated his pupils with all his heart and skill, for he was gifted by Nature with unbounded love and kindly sympathy for them.

Hamid Ahmad Khan was a true patriot. Is there a single individual in the whole wide world, who can say that he had ever put his personal interests before those of the nation? He was also a man of unswerving faith, a quality absolutely necessary for a true teacher. Islam was the main source of his inspiration in life; as such he commanded love and respect from all those who came to know him. To describe briefly the personality of this scholar of Shakespeare, let me quote frome the great poet himself:

"His life was gentle, and the elements
So mix'd in him that Nature my stand up,
And say to all the world 'This was a man.'"

Hamid Ahmad Khan was a great Vice-Chancellor, though this unfortunate society witnessed lifelessly a most regretable and infamous end to his six-year tenure as Vice-Chuncellor. In fact his great contribution to the academic life of this University has not not yet been fully appreciated. It is not my intension to

recount or even list here his many achievements in the University. I will say, however, that he left the University in a state of moral triumph upholding the dignity of his office as Vice-Chancellor and that of his colleagues as teachers. Only an upright person like him could have done it; and as time passes Hamid Ahmad Khan's stature as true teacher, true patriot, true man of faith and true administrator shall rise; and as the truth comes to light, his example shall shine ever more brightly.

———